قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2021 قیمت 15₹

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

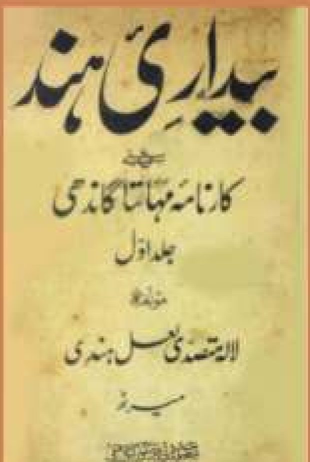

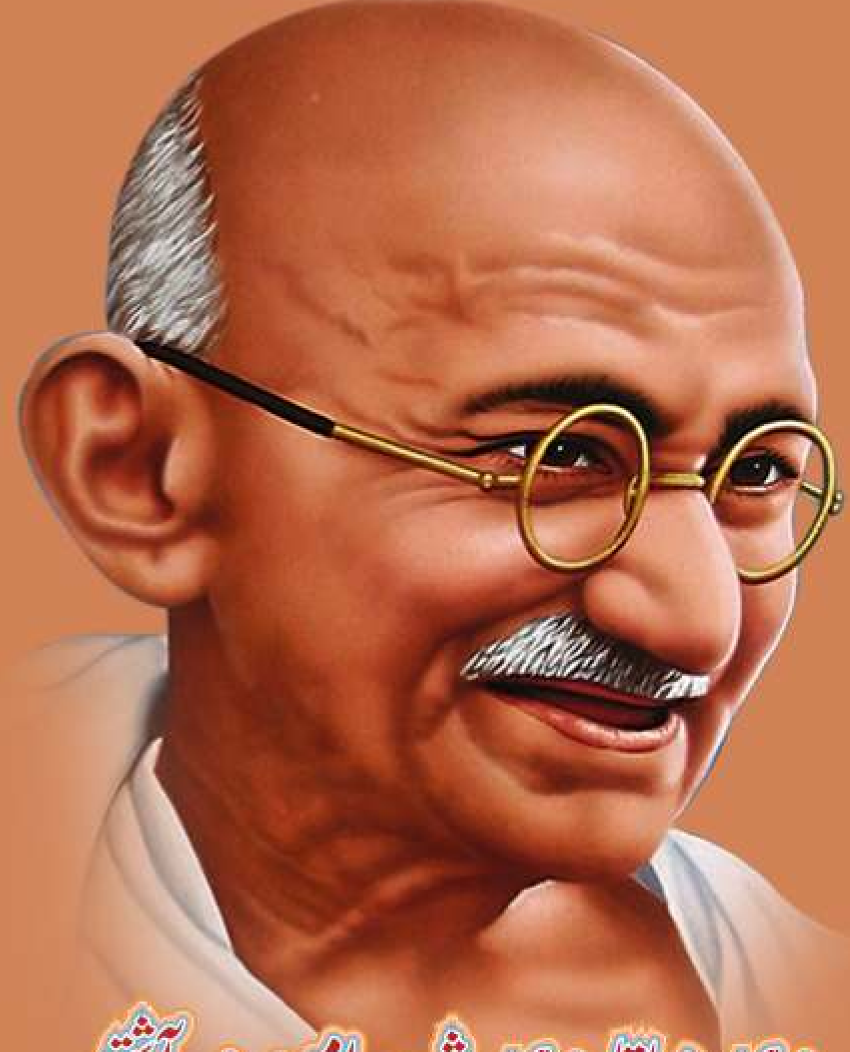

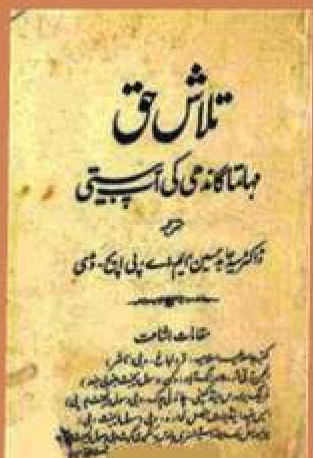

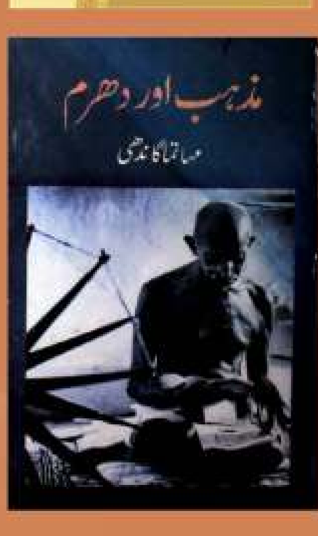

وہی مہاتما وہی شہید امن و آشتی
پریم جس کی زندگی خلوص جس کا پیرہن
(جگر مرادآبادی)

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:23، شمارہ:10، اکتوبر 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages: 100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط والتفات قارئین کے خطوط 5

مہاتما گاندھی کی یاد میں
گاندھی جی بطور ایک شوقین ہیئت داں انیس الحسن صدیقی 9
احمد شوقی کے ممدوح مہاتما گاندھی غزالہ پروین 11

ادب: زاویے اور جہات
اردو اور ہندوستانیت بانو سرتاج 13
اردو میں مکتوب نگاری اسلم جمشید پوری 20
امجد نجمی کی شاعری میں حب الوطنی عبدالحی پیام انصاری 25

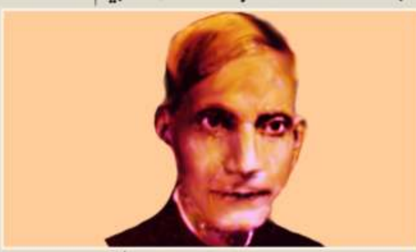

سائنس اور ادب کے امتیازات معید الرحمٰن 27

صدی شخصیت: ساحر
ساحر لدھیانوی: ایک مقبول اور حقیقت پسند شاعر عمران عراقی 30
ساحر لدھیانوی: بطور بچوں کا شاعر سالک جمیل براڑ 33

تاریخ آزادی ہند
1857 کی جنگ آزادی کا عظیم سپہ سالار: بخت خاں درخشاں تاجور 36

جنگ آزادی کا ایک عظیم مجاہد مولوی سید علاؤالدین حیدر عظیم انصاری 39

یاد رفتگاں
پروفیسر محمد شفیع ایک اردو نواز معروف جغرافیہ داں محمد خلیل 41
شمس الرحمٰن فاروقی اسلم عمادی 44

عربی ادبیات
کلام اقبال وشوقی کا فکری، فنی اور موضوعاتی تجزیہ سرور عالم ندوی 49
عہد عباسی کی عربی شاعری نایاب حسن 52

خراج عقیدت
گمشدہ ساعتیں اور صلاح الدین پرویز محمد اکرام 56

سلسلۂ صحافت
بابائے صحافت جموں وکشمیر لالہ ملک راج صراف فردوس حمید پرے 61

نیا آسماں نئے ستارے
موپاساں اور منٹو میں موضوعاتی یکسانیت محمد ریحان 64
خورشید الاسلام کی فکشن تنقید شاہنواز حیدر شمسی 67
اردو شاعری میں تلمیحات کا لفظی اور معنوی آہنگ محمد عارف 71

کتابوں کی دنیا
تعارف وتبصرہ ادارہ 74

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 84

ہماری بات

ہمارے ملک کے جن قائدین نے اپنے افکار، آثار اور اقدار سے اجتماعی شعور کو متاثر کیا اور ذہنوں پر گہرا نقش قائم کیا ہے ان میں مہاتما گاندھی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے نہ صرف آزادی کی جنگ میں قائدانہ کردار ادا کیا بلکہ آزادی کے بعد ملک میں جس طرح کے تنازعات اور اختلافات ابھرے اس کو بھی حل کرنے میں ان کا نمایاں رول رہا ہے۔ یہ گاندھی جی کی شخصیت اور افکار کا ہی سحر تھا کہ ملک کے باشعور لوگوں نے ان کے وژن اور مشن کو اپنا مقصد حیات بنایا اور انہی کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر ملک میں اتحاد، یکجہتی اور اخوت کو بڑھاوا دیا۔ گاندھی جی نے ایسے سماجی، سیاسی، تعلیمی اور معاشی نظریات پیش کیے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ انھوں نے مساوات، انسانی ہمدردی، فلاح و بہبود پر زیادہ زور دیا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ گاندھی جی نے مختلف طبقات کے درمیان اختلافات کو ختم کرنے کے لیے صدق دل سے کوشش کی۔

انھوں نے کہا تھا کہ ''میں ایسا ہندوستان بناؤں گا جس میں تمام فرقے شیر و شکر ہو کر رہیں گے، ایسا ہندوستان جس میں چھوت چھات کی لعنت نہ ہوگی، ہندو مسلمان، سکھ اور عیسائی سبھی اتفاق و اتحاد سے رہیں گے۔'' اور گاندھی جی اپنے اس قول پر آخر وقت تک قائم رہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے بھی ہندوستان میں اتحاد، سالمیت اور امن و شانتی کا پیغام دیا۔ خاص طور پر لسانی تنازعات کے تعلق سے بھی ان کی فکر نہایت مثبت اور تعمیری تھی۔ زبان کے تعلق سے ان کا نظریہ واضح تھا۔ وہ زبان کو فرقہ وارانہ سیاست کی نذر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ وہ 'ہندوستانی' کے حق میں تھے اس لیے ہمیشہ ہندوستانی کی وکالت اور حمایت کی۔ وہ اردو-ہندی کی قربت کے حامی تھے۔ انھوں نے دونوں زبانوں کو ملا کر 'ہندوستانی' بنانے کی تجویز رکھی اور اس طرح انھوں نے لسانی تنازعے کو ختم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ ان کی راشٹریہ بھاشا میں ہندی- اردو دونوں زبانیں شامل تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اردو یا دیوناگری دونوں رسم الخط سے واقفیت اگر ہو جائے تو اس سے بہتر کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔ گاندھی جی نے جب 'ہریجن' اخبار نکالا تو صرف انگریزی، دیوناگری اور گجراتی میں ہی نہیں بلکہ اردو میں بھی اسے شائع کیا اور جب اردو اخبار کے حوالے سے کچھ دقتیں پیش آنے لگیں تو گاندھی جی نے اردو میں 'ہریجن' کو جاری رکھنے کے لیے بہت کوشش کی۔ ہندی کے ساتھ ساتھ مہاتما گاندھی کو اردو زبان سے بے انتہا محبت تھی۔ انھوں نے اردو سیکھی بھی تھی اور وہ اردو کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ خاص طور پر اقبال کی نظم 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' انھیں بہت پسند تھی۔ وہ اکثر اس نظم کی تعریف کرتے تھے۔ بھائی محمد حسین کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''جب ان کی مشہور نظم 'ہندوستاں ہمارا' پڑھا تو میرا دل بھر آیا۔ یڑودا جیل میں تو سیکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے۔''

گاندھی جی کی شخصیت اور افکار کے حوالے سے بیشتر زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اردو میں بھی گاندھی جی کی خودنوشت "The Story of my Experiments of Truth" کا 'تلاش حق' کے عنوان سے ترجمہ ہوا۔ اس کے علاوہ کئی اور ترجمے ہوئے جو اردو دنیا میں بہت مقبول ہوئے۔ گاندھی جی کے افکار کی معنویت اور عصریت کے حوالے سے اردو میں بہت سی کتابیں تحریر کی گئیں۔ ان کے نظریات اور افکار پر مقالات کی کثرت ہے۔ اردو کے معتبر اور موقر شاعروں نے بھی انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ دراصل اردو داں طبقہ گاندھی جی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس لیے اہنسا کے پیغمبر مہاتما گاندھی کو اردو کے شاعروں نے جذباتی خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ انھیں شاہِ شہیداں، رواداری کا دیوتا، امن کا اوتار شہید امن و آشتی کہا گیا۔ جوش ملیح آبادی نے جوشِ عقیدت میں گاندھی جی کے بارے میں یہ کہا:

تیرے دم سے زمزمہ گنگا کی جولانی میں تھا   نغمہ تجھ سے کوثر و تسنیم کے پانی میں تھا

اردو زبان میں گاندھی جی کی شخصیت اور ان کے افکار کے حوالے سے بیش بہا ذخیرہ ہے۔ ضرورت ہے کہ گاندھی جی کے مشن اور وژن کے حوالے سے مربوط گفتگو کی جائے تاکہ ہماری نئی نسل تحریک آزادی میں ان کے مکمل کردار سے واقف ہو سکے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان گمنام مجاہدین آزادی کو بھی ضرور یاد کرنا چاہیے جنھوں نے ہمارے ملک کی آزادی میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

اردو دنیا ستمبر ہر ماہ کی طرح اپنی رنگینیاں بکھیرتا ہوا نظر نواز ہوا۔ اکیسویں صدی میں جن ادبی رسائل نے دنیا پر اپنی حکومت کی اور معیار کو برقرار رکھا اس میں صف اول اردو دنیا ہے کیونکہ آزادی کے بعد بہت سے رسالے بند ہوگئے اور جو بچ گئے وہ آہستہ آہستہ دم توڑتے گئے۔ حکومت کی سرپرستی کے باوجود بعض اکادمیوں کے رسالے اپنا ادبی معیار برقرار نہ رکھ سکے اور جنھوں نے اپنی ساکھ کو برقرار رکھا وہ ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ ہر دور میں شائع ہونے والے ادبی رسائل و جرائد سے نہ صرف قارئین کے ادبی ذوق کی تسکین ہوتی بلکہ تحقیق کے طالب علموں کے لیے راستہ ہموار ہوتا ہے۔ ہندوستان میں معیاری رسائل کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

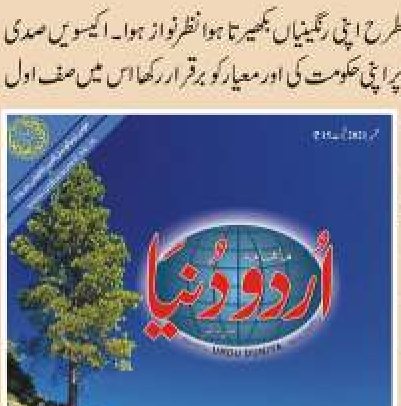

اس شمارے میں اکیسویں صدی میں اردو تنقید نگاری کی پیش رفت ہے تو اردو افسانے کا سفر ہے۔ اس میں ادب کے لعل و گہر ہیں تو اردو کی تہذیب و ثقافت بھی ہے۔ جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا، قاری کے لیے ایک نئی راہ ہے۔ ہر زاویے سے اس میں ادب ہی ادب ہے جس کے لیے مدیر و ادارہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہر ریسرچ اسکالر کو اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ وہ نئے حالات سے واقف ہو سکے۔

❖ **ڈاکٹر م ق سلیم**: صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج، حیدرآباد، تلنگانہ

اگست کے شمارے میں اداریے اور محمد قمر سلیم کے مضمون میں وطن کی آزادی میں اردو زبان کے ادبا و شعرا کی ادبی خدمات لائق صد ستائش ہیں۔

جناب غضنفر نے تحقیق سے وابستہ ایک اعلیٰ مضمون پیش کیا ہے جس میں 'تحقیق' جیسے دقیق موضوع، مقصد و طریقۂ کار کو مفصل مثالوں کے ساتھ بیان کیا، مستزاد یہ مقالہ تمام اساتذہ و محققان کے لیے ازحد مفید ہے۔ محترمہ قمر جمالی نے بلند پایہ مقالے میں میرابائی کے نغمات کی خط کشی کی ہے۔ اس مقالہ نگار پر میرابائی کی یہ خاص سطور صادق آتی ہیں۔

'جوہر کی گتی جوہری جانے یا جتی جوہر ہوئے' یعنی جوہر کی اہمیت یا تو جوہری جان سکتا ہے یا جس کے پاس جوہر بمعنی 'قابلیت' ہو۔ چند غلط املا والے الفاظ صحیح املا کے ساتھ درج کرنے کی جسارت کر رہا ہوں مثلاً صفحہ 15 پر جمنانٹ (جمناتٹ)، اگلے صفحہ 14 پر 'چ' (تج)، پیہرودے (پیہرادے) اور بول (بلی)

مضمون نگار کو اردو ادب کے ساتھ ہندی زبان و ادب پر بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔

جناب قیصر زماں نے اپنے مضمون میں حسن و عشق کی دنیا کے ساتھ انسانی جذبات کے عکاس جناب حسرت موہانی کے شاعرانہ کردار کو بخوبی نشان زد کیا ہے۔ 'حسرت' تخلص

سے ہی شاید متاثر ہوکر فلمی نغمہ نگار حسرت جے پوری نے بھی تخلص اختیار کیا ہوگا یہ اس ناچیز کا خیال ہے۔ محمد قمر سلیم کی تہذیبی ہم آہنگی کا پیغام دینے والے مقالے میں صفحہ 18 پر خواجہ حیدر علی آتش کا یہ شعر درج ہے۔

بت خانہ توڑ ڈالیے، مسجد کو ڈھائیے　　دل کو نہ توڑیے کہ خدا کا مقام ہے

ص 17 پر 'اردھا' غلط املا کی بجائے 'رادھا' املا کی اشاعت درکار تھی۔

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاوک**: کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر گلی نمبر K-18، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' اگست کے شمارے میں اردو زبان اور حب الوطنی کے حوالے سے اداریہ مختصر ہوتے ہوئے بھی کافی اہم ہے۔ اردو کی سبھی شعری اصناف میں حب الوطنی کی روایت ملتی ہے۔ آزادی کی لڑائی میں شہید ہونے والے پہلے صحافی بھی دہلی اردو اخبار کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر تھے۔ شمارے کے باقی مضامین بھی اہم ہیں خاص طور پر اردو تحقیق کے حوالے سے غضنفر کا مضمون، زاہد ندیم احسن کا مضمون 'ماحولیاتی تحفظ اور ادب اطفال' اور وحید الظفر کا مضمون 'کتھارسس کی نفسیاتی اہمیت' اہم اور معلوماتی ہیں۔ حسرت موہانی کی شاعری کے حوالے سے قیصر زماں کا یہ کہنا کہ 'حسرت نے محض زلف و رخسار کو عبارت آرائی کا رنگ دیا ہے ان میں روح عصر کے تقاضے بھی شامل کیے جاسکتے تھے۔' حسرت کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ اولا یہ کہ حسرت کی شاعری محض زلف و رخسار تک محدود نہیں ہے دوسری بات یہ کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ ان کی شاعری زلف و رخسار تک محدود ہے پھر بھی اس کو عیب شمار کرنا مناسب نہیں ہے۔ حسرت کی شاعری خاص کر ان کی غزلیہ شاعری جدید اردو غزل کی معراج ہے۔

❖ **ڈاکٹر عزیر احمد**: اسسٹنٹ پروفیسر، اسلام پور کالج، اسلام پور، مغربی بنگال

اردو دنیا اگست 2021 شمارے کے اداریے پر جیسے ہی نظر پڑی دل آزادی کے جذبے سے سرشار ہوگیا۔ اداریے میں انگریزوں کی بربریت اور آزادی کے متوالوں کی قربانی کے ساتھ ساتھ ملک کے باشندوں کو امن و آشتی، اخوت و محبت کا پیغام دیا گیا ہے۔

اس کے بعد پروفیسر غضنفر صاحب کا مضمون بعنوان 'تحقیق کیسے کریں' بہت عمدہ اور تحقیقی ہے۔ تحقیق ایک بہت ہی وقت طلب اور یکسوئی کا کام ہے۔ ایک اچھی تحقیق کے لیے خون جگر کی ضرورت ہوتی ہے۔ غضنفر صاحب نے نہ صرف یہ بتایا کہ تحقیق کیسے کریں بلکہ تحقیق میں درپیش مشکلات جیسے کہ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم سمجھ ہی نہیں پاتے ہیں کہ آخر تحقیق کہتے کسے ہیں تحقیق کا مقصد کیا ہے؟ ہم تحقیق کیوں کرتے ہیں؟ وغیرہ بلکہ انھوں نے تحقیق میں جو بھی ضروری ہوتا ہے ان تمام باتوں کو تفصیل سے بتانے کے ساتھ ساتھ کچھ الفاظ کی رُک (مخففات) ہمیں بتا دی، تلک (تحقیق کیا؟ کیوں؟ کیسے؟) اور ممط (موضوع، مقاصد، طریقۂ کار) یہ پڑھ کر تھوڑا عجیب لگا لیکن جیسے جیسے آگے پڑھتا گیا دلچسپی اور تجسس میں اضافہ ہوتا گیا کیونکہ پروفیسر موصوف نے تمام چیزوں کو بہت ہی اچھے سے مثالوں کے ساتھ سمجھایا ہے۔ اخیر میں تحقیق کی زبان کے حوالے سے 'آواس' یعنی آسان، وضاحتی، استدلالی، سائنٹفک پڑھ کر طبیعت مچل گئی۔ یہ ایک بہت ہی عمدہ اور کارآمد مضمون ہے جس سے کہ تمام محققین کو تحقیق میں مدد ملے گی۔

پروفیسر مشتاق احمد آئی پٹیل صاحب کا مضمون 'ورچوئل تدریس میں گوگل کلاس روم کا استعمال' دور حاضر کی مناسبت سے بہت ہی عمدہ اور اچھا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے معلمین اس کا استعمال کرکے اپنی تدریس کو منظم اور آسان بنا سکتے ہیں۔ یہ مضمون اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ بہت سے لوگ ابھی بھی گوگل کلاس روم استعمال نہیں کرنا جانتے ہیں حتی کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اسے میٹ یا زوم کی طرح کوئی آن لائن میٹنگ کا اپلیکیشن سمجھتے ہیں، پروفیسر صاحب نے بہت ہی وضاحت کے ساتھ تمام مراحل کو قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے نیز یہ بھی بتایا ہے کہ یہ کس طرح سے کام کرتا ہے اور اساتذہ کس طرح سے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ آج کے تناظر میں جہاں درس و تدریس آن لائن چل رہی ہے بہت ہی کارآمد ہے۔

ڈاکٹر محمد اطہر حسین صاحب کا مضمون طلبا کی پریشانیوں، مسائل اور اضطراب پر روشنی ڈالتا ہے یقیناً اس وقت پوری دنیا کے لوگ جب سے کووڈ کی وبا عام ہوئی ہے ہر آن ایک نئے مسائل سے دوچار ہیں اور اولیا، طلبا کے سرپرستوں کے ساتھ ساتھ طلبا بھی بہت اضطراب اور ان سب مسائل میں گھرے ہوئے ہیں ایسے حالات میں ان مسائل کا سدباب، حل ناگزیر ہوجاتا ہے اس لحاظ سے ڈاکٹر اطہر حسین صاحب کا مضمون

بہت ہی عمدہ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس سے نہ صرف طلبا کے مسائل کے حل میں مدد ملے گی بلکہ اس سے طلبا کے سرپرستوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

مولانا قاضی سجاد حسین کی ادبی خدمات کے حوالے سے جناب عتیق الرحمن صاحب کا مضمون بہت ہی معلوماتی ہے اس سے قاضی صاحب کی جہاں ادبی خدمات اجاگر ہوتی ہیں وہیں ان کی علمیت بھی آشکارا ہو جاتی ہے۔ یہ مضمون کئی کتابوں کی سیر کراتا ہے اور قاری کو مختلف النوع معلومات فراہم کر کے ان کے علم میں اضافے کے ساتھ ادبی ذوق کو پروان چڑھاتا ہے۔

ابوزر عبدالاحد فرقانی 'کس کو اردو زبان دے جاؤں' بہت ہی بسیط اور وقیع انداز میں اردو کے حوالے سے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے اور اس کی طرف بے توجہی پر اظہار افسوس بھی کیا ہے۔ یقیناً اردو کی بقا و ترقی کے لیے مزید ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی اردو میں بچوں کے لیے موبائل گیم اور اس طرح کے کھیل وغیرہ کو فروغ دینا ہوگا اور جو لوگ اس زبان کے تئیں تعصب رکھتے ہیں ان کو بھی اردو کی مٹھاس سے ساتھ لے کر چلنا ہوگا تبھی جا کر اردو زبان کو دوام حاصل ہوگا۔

اردو دنیا کی پوری ٹیم قابل مبارکباد ہے جس نے اتنے اچھے اور عمدہ مضامین شامل کیے خاص کر آئی سی ٹی اور اردو کے ڈیجیٹائزیشن جیسے مضامین بہت اچھے اور معلوماتی ہیں اس طرح کے مضامین کو جگہ دینا بہت ہی اچھی اور خوش آئند بات ہے۔

❖ **ڈاکٹر جرار احمد**: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تعلیم و تربیت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ

اگست 2021 کا اردو دنیا بروقت دستیاب ہوا۔ ماضی میں جس طرح پیسہ اخبار اور دوسرے ماہناموں کا لوگ انتظار کرتے تھے اسی طرح اردو دنیا کا بھی لوگ بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ رسالے کے مشمولات کی وجہ سے ہے اس میں علمی ادبی اور دیگر علوم و فنون سے متعلق معلومات بھرپور شائع ہوتی ہیں۔ اہل وطن کو 74 ویں جشن آزادی کی مبارک۔ اسی کی مناسبت سے سرورق پر ترنگا اور اشوک چکر کی تصویر شائع کی گئی ہے۔ مدیر نے 'ہماری بات' میں جنگ آزادی میں شعرا، ادیبوں اور صحافیوں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔

'ربط و التفات' خطوط کے کالم سے رسالے کے قد و قامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خطوط میں زیادہ تعریف و توصیف ہو رہی ہے تنقید کم۔ توازن ہونا چاہیے۔ غضنفر نے 'تحقیق کیسے کریں' میں تحقیق کے فن، تقاضے اور تحقیق کس طرح کی جائے، پر تفصیل سے مضمون لکھا ہے۔ تحقیق کی زبان کسے کہتے ہیں، زبان آسان، وضاحتی، استدلالی، سائنٹفک ہو۔ قمر جمالی نے 'میرابائی استغراق اور عرفان ذات کی شاعرہ' میں ان کے کلام کا تجزیہ کیا۔ کرشن سے محبت کا اظہار میرا کی شاعری میں ملتا ہے۔ قیصر زماں نے 'حسرت کا شاعرانہ کردار' میں حسرت کا شعری آہنگ اور کلام کا فنی و موضوعاتی تجزیہ کیا ہے۔ حسرت نے داخلی اور خارجی عوامل کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ قمر سلیم نے سچ کہا ہے کہ اردو قومی یکجہتی اور اتحاد کی زبان کی ہے اس میں مکمل ہندوستانیت جلوہ گر ہے۔ اس زبان سے محبت اولاد کی طرح ہوگی تبھی اس کی بقا ممکن ہے۔ احسان حسن نے چکبست کی شاہ کار نظم کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ زاہد ندیم احسن، سلمیٰ محمد رفیق، اطہر حسین وغیرہ کے مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

❖ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: مکان نمبر 17-7-335، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد

کہتے ہیں کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

اداریہ کے عنوان سے رقم تحریر قوم و ملک سے اردو زبان و ادب کی والہانہ وابستگی و انس کا قلبی اظہاریہ ہے۔ جذبات و احساسات سے مغلوب دلی احساسات و جذبات کی بہترین ترجمانی ہے۔ جنگ آزادی کے حوالے سے تمام تر اہم نکات مختصر الفظوں کی جادو بیانی کا جیتا جاگتا مرقع ہیں۔ اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمات حب الوطنی کے جذبے سے سرشار صحافت، شاعری، تقاریر و نثری صحیفے اور ان سے وابستہ ادبی شخصیات کی ناقابل فراموش جد و جہد تاریخ کا زریں باب ہیں۔ پر شکوہ و شاندار اداریے کے لیے دلی مبارکباد قبول کریں۔

ادب جہات و زاویے، زبان و تعلیم، یاد رفتگاں، لعل و گہر، سمت و امکانات، نیا آسماں نئے ستارے، کمپیوٹر تا خبرنامہ گویا مضامین کی ترتیب و تزئین کی تعریف نہ کرنا ادبی حق تلفی ہوگی۔ تمام تر مشمولات نہایت اہم اور اعلیٰ درجے کے ادبی تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔

❖ **ڈاکٹر رضوانہ ارم**، صدر شعبۂ اردو، جمشید پور، وومنس کالج، یونیورسٹی، جھارکھنڈ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/ شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

"میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔"

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

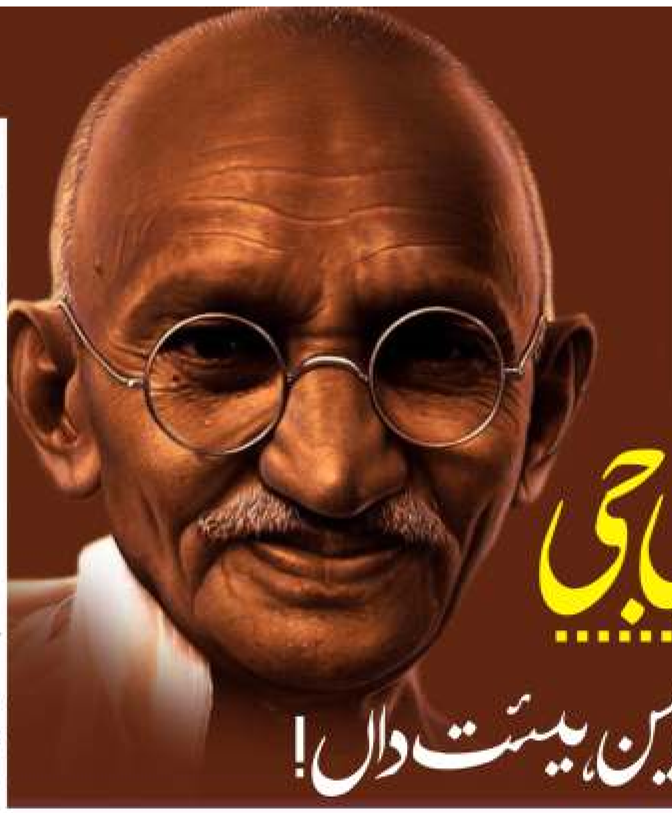

انیس الحسن صدیقی

گاندھی جی

بطور ایک شوقین ہیئت داں!

آپ حیران ہوں گے کہ گاندھی جی بھی ایک شوقین ہیئت داں[1] تھے! بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ گاندھی جی کو علم ہیئت سے عشق تھا اور وہ علم ہیئت کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے سامنے اپنے ملک ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ تھا۔ ان کے پاس وقت کم اور کام زیادہ تھا۔ پھر بھی شدت کے ساتھ مشغول ہونے کے باوجود بھی انھوں نے علم ہیئت کا مطالعہ اور مشاہدوں کے لیے وقت نکال ہی لیا۔ گاندھی جی کے سوانح حیات کے اوراق کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:

گاندھی جی 10 اگست 1888 کو پہلی مرتبہ بحری جہاز کے ذریعے بمبئی سے لندن کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ یہ ان کا پہلا بحری سفر تھا۔ وہ اپنے پہلے بحری سفر کے دوران چاندنی اور اندھیری راتوں میں اکثر بحری جہاز کے عرشے سے سمندر اور آسمان کا ایک ساتھ نظارہ کیا کرتے تھے۔ پہلی مرتبہ رات کے وقت جب وہ بحری جہاز کے عرشے پر پہنچے تو ان کو ستاروں سے بھرا ہوا آسمان نظر آیا لیکن جب سمندر کی طرف دیکھا تو ان کو عجیب سا لگا۔ ان کو ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر میں پانی کی سطح پر کیڑے چل رہے ہیں۔ وہ سوچنے لگے کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے! سمندر کے پانی میں اتنے سارے کیڑوں کا کیا مطلب؟ پھر غور کیا اور سوچنے لگے۔ پھر اچانک وہ اپنی سوچ پر ہنسنے لگے۔ جب انھوں نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ آسمان میں ٹمٹماتے اور چمکدار ستاروں کا عکس سمندر کے پانی پر پڑ رہا ہے اور پانی میں لہروں کی وجہ سے وہ ستاروں کا عکس کیڑوں جیسا لگ رہا تھا۔ اس بحری سفر کے بعد گاندھی جی نے پھر کئی مرتبہ بحری سفر کیا اور ہر مرتبہ دوران سفر رات کے وقت بحری جہاز کے عرشے سے ستاروں بھرے آسمان کے دلکش منظر سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔

جنوبی افریقہ میں ان کے ایک ساتھی جن کا نام ہربرٹ کچن (Herbert Kichen) تھا وہ علم ہیئت[2] میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان دنوں ستاروں کے متعلق نئی نئی دریافتوں کا بہت ہی زیادہ چرچا تھا۔ وہ گاندھی جی کو اپنے ساتھ ایک رصدگاہ[3] بھی لے گئے تھے۔ وہاں گاندھی جی نے بھی دوربین کی مدد سے ستاروں کے مشاہدے میں بڑی دلچسپی دکھائی۔ لیکن وہاں سے لوٹنے کے بعد پھر دوسرے کاموں میں مشغول ہوگئے۔ وہ بھول گئے کہ علم ہیئت کا مطالعہ کرنا ہے۔

گاندھی جی اکثر دوربین کے ذریعے علم ہیئت میں ستاروں کے متعلق نئی نئی دریافتوں کے بارے میں اخباروں اور رسالوں میں خبریں بڑے ہی شوق سے پڑھتے تھے۔ اپنے دوستوں سے ستاروں کے بارے میں سن کر پھر ان کو بھی شوق ہوتا تھا لیکن اپنے ملک کی آزادی کے آندولنوں میں بہت زیادہ مصروف رہتے تھے اور باوجود دلی خواہش کے وہ اپنے اس شوق کے لیے وقت نہیں نکال پا رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس علم کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت کس طرح نکالا جائے۔ وہ اپنی خواہش کو بار بار دباتے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر ڈی۔ بی۔ کیلکر گاندھی جی کے بہت ہی قریبی ساتھی تھے اور شوقین ہیئت داں بھی تھے۔ ان کو اس علم میں بڑی دلچسپی تھی اور خاص طور پر وہ اس علم کی کتابوں کو گجراتی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کروانا چاہتے تھے۔ ان کی اس دلچسپی کی وجہ سے گاندھی جی کو اس علم میں اور دلچسپی ہوئی کیونکہ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ طلبا کو اپنی مادری زبان میں جدید علم کا حصول ممکن ہوسکے۔ گاندھی جی اکثر ڈاکٹر کیلکر سے خط و کتابت کے ذریعے علم ہیئت کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ اکثر جب بھی گاندھی جی رات کے وقت سمندر کے کنارے ٹہلتے تو پھر ان کو ستاروں کے متعلق خیال آتا تھا۔

آخر کار 1920 میں گاندھی جی نے اس مضمون پر کتابیں اکٹھا کرنی شروع کیں لیکن کتابوں کو اکٹھا کرنے سے علم نہیں آتا جب تک کہ ان کا مطالعہ نہ کیا جائے۔

1932 میں گاندھی جی اور ان کے دوست ڈاکٹر کیلکر یرواڈا جیل میں قید کر دیے گئے۔ گاندھی جی کو اس علم کا مطالعہ کرنے کا سنہرا موقع مل گیا۔ انھوں نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ گاندھی جی نے اس علم کے مطالعے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر کیلکر کی مدد سے دوربین کے ذریعے چاند، ستاروں اور آسمانی اجرام کے مشاہدے بھی کیے۔ جیل میں رہ کر اکثر اپنے قریبی لوگوں کو خط لکھتے تھے جس میں وہ ستاروں کے مشاہدوں کا ذکر کرتے تھے اور اپنی یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اس علم سے متعلق کتابیں گجراتی زبان میں ضرور شائع ہونی چاہیے تاکہ طلبا کو اپنی مادری زبان میں یہ علم حاصل ہوسکے۔

جیل میں قید کے دوران جب اسوشیٹیڈ پریس کے رپورٹرس گاندھی جی کا جیل میں انٹرویو لینے پہنچے تو جیل کے کھلے صحن میں گاندھی جی کو دو بڑے سائز کی دوربینوں کے ساتھ پایا۔ گاندھی جی نے کہا کہ یہ ان کے لیے ہیں۔ 3 اپریل 1933 کو اخبار ''دی ہندو'' میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس میں ان کی زبانی یہ اقتباس تھا:

''علم ہیئت میں مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اب مجھے اس سے عشق ہوگیا ہے۔ فرصت کے لمحوں میں اس کا مطالعہ کرنے میں وقت صرف کرتا ہوں۔ یہ ایک قابل تعریف مضمون ہے اور خدا کی کائنات اور اس کی شان کے رازوں کے علاوہ اور کسی چیز سے زیادہ نہیں ہے۔ ستاروں بھری رات میں اپنی کمر کے بل کھلی فضا میں ایک عالم کے بعد عالم جو اتنے زیادہ پھیلاؤ میں ہے کہ ناپی نہیں جا سکے اس کو دیکھنے کے لیے کمر کے بل لیٹے رہنے کے سوا آپ بغیر خدا کی اطاعت گذار (پرستار) پجاری بننے میں مدد نہیں کر سکتے ہیں۔ جیسے ہی میں ایسا کرتا ہوں میرا دماغ خوشی سے اچھلنے لگتا ہے۔ اوہ! یہ تو عجیب و غریب ہے!''

گاندھی جی فروری سے اپریل 1932 تک جیل میں رہے اور دو مضامین 'آسمانوں کا مشاہدہ۔ اول و دوم' کے عنوان سے لکھ کر اپنے آشرم کے ساتھیوں کو ہدایت دیتے ہوئے بھیجے تھے کہ وہ متواتر رات میں آسمان کا مشاہدہ

جاری رکھیں۔ گاندھی جی کا سماوی اجرام کے بارے میں نظریہ تھا کہ سماوی اجرام کی سرگرمیاں اور خوبصورتی ترتیب اور تناسب سب شانتی دیتے ہیں۔ انھوں نے سماوی اجرام کے لیے ہدایتیں دیں کہ مجمع النجوم[4] کے مشاہدے کے ساتھ ان کے ستاروں کا خاکہ بھی بنایا جائے۔ خاص طور پر مجمع النجوم جبّار (Orion) کے ستاروں کا خاکہ۔

اس مجمع النجوم کے بارے میں بھی بتایا کہ انھوں نے ایک شائع شدہ خاکہ دیکھا ہے جس میں انھوں نے ان تمام ستاروں کو پایا ہے جن کا انھوں نے مشاہدہ کیا تھا۔ انھوں نے اس بارے میں تنبیہ بھی کی کہ وہ مختلف مقاموں سے دکھائی دینے والے ستاروں کے مجمع النجوم مختلف اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ستاروں کا مشاہدہ کرنے والوں کو بھی مشورہ دیا کہ ایک خاص مقرر جگہ سے خاص وقت میں ستاروں کا مشاہدے کریں اور اس کا خاکہ بھی بنائیں اور یہ بھی بتایا کہ اگر ایک مرتبہ وہ کسی مجمع النجوم سے واقف ہو جاتے ہیں تو ان کے مشاہدہ کی جگہ یا مجمع النجوم کی حیثیت بدل جانے کے بعد بھی اس کو پہچاننے کے قابل ہوں گے۔ انھوں نے مجمع النجوم دب اکبر (Ursa Major) یعنی ستاروں کا جھمکا، سپت رشی کی بھی بدلتی شکلوں کو مختلف اوقات میں دیکھا ہے اور ان کے ممکنات کے متعلق بھی بحث کی تھی۔

ان مضامین میں گاندھی جی نے مجمع النجوم جبّار (Orion)، کلب اکبر (Canis Major)، کلب اصغر (Canis Minor)، ارنب (Lepus)، دب اکبر (Ursa Major)، دب اصغر (Ursa Minor)، قطبی ستارہ (Pole star) کا حوالہ دیا تھا جیسا کہ تصوری مخلوق اور دیو مالاؤں کو مجمع النجوم سے بھی جوڑا گیا تھا۔ انھوں نے اس کی صفائی پیش کی کہ یہ خوبصورت سجاوٹیں ضرور ہیں لیکن آسمان میں ایسی شکلیں نہیں ہیں اور ان میں ہر ستارہ ایک سورج کی طرح ہے اور ان میں کچھ سورج سے بڑے ہیں۔ انھوں نے اس حقیقت کا بھی ذکر کیا کہ مجمع النجوم کی شکلوں میں ستارے ضروری نہیں ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوں اور مؤثر طور پر ان کے ایک ساتھ نہ ہونے کا اشارہ بھی کیا تھا۔ حالانکہ انھوں نے ان کے درمیان کے ممکن فاصلوں اور ان کے درمیانی سمت کو کھل کر نہیں بتایا تھا۔

بعد میں گاندھی جی نے سائنس کے اسباب کی لائنوں سے دور سفر کرنے کے لیے اس روحانی تعلق کی طرف جس کا انھوں نے ان ستاروں کے مشاہدوں سے یہ کہتے ہوئے کیا کہ کوئی بھی ان کو ایک لمحہ کے لیے دیکھتا ہے تو وہ اپنی تکلیف بھول جاتا ہے اور اللہ تعالی کی تعریف میں پھٹ پڑتا ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی اور سماوی اجرام کے درمیان اپنے مجموعی جائزے میں کہا کہ ''اگر آسمان میں اَن گنت چمکتے ہوئے شان خداوندی کے نظارے نہیں ہوتے تو وہ ہم وجود میں نہیں آتے۔'' انھوں نے عنصری کائنات میں ہماری زمین (Earth) پر زندگی کی ابتدا کو سمجھنے میں ایک راہ دکھائی تھی۔

گاندھی جی نے مزید کہا کہ ''ستاروں کو دیکھنے کے لیے ہر ایک کو باہر آنا چاہیے اور ہم نے اب تک کوئی ایسا واقعہ نہیں سنا ہے کہ کسی اخلاقی کردار کو ستاروں کے دیکھنے سے نقصان ہوا ہے۔ جتنا زیادہ ہم خدا کے معجزے میں گیان و دھیان سے مشغول ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ ہم روحانیت میں بڑھتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ رات کے وقت آسمان کی خوبصورتی کو جو سیکڑوں ستاروں کے ذریعے ہوئی ہے، ہندوستان کے ہر بچے کو ہندوستان کی بڑھتی ہوئی روشنی کی آلودگی کی وجہ سے محروم کیا ہے۔ رات میں آسمانوں کے کچھ جذبات چاند، سیارے، اور چمکتے ہوئے ستارے اور سماوی اجرام بھی قابل تعریف شہروں کے آسمانوں سے دستیاب ہیں۔ ہر کسی کو ایسے ولولہ انگیز منظروں کو تلاش کرنے کے لیے بس صرف تھوڑی رہبری کی ضرورت ہے۔''

ستاروں کی ایک بڑی تعداد کی تعریف میں گاندھی جی کا ایک روحانی عمل تھا۔ 23 جولائی 1932 کو گاندھی جی نے ڈاکٹر کیلکر کو ایک خط لکھا کہ ''آسمان کی طرف دیکھ کر اس لامحدود، خالص، مرتب اور اس کے جاہ و جلال کا اثر ہمیں پاک کرتا ہے۔ شاید ایسا ہوسکتا ہے کہ سیاروں[5] تک پہنچنے کے قابل ہونے میں کسی کو بھی وہی تجربہ ہوگا جو اس دھرتی پر اسے اچھائی اور برائی کے تجربے میں ہوتا ہے۔ اتنی دور کے فاصلوں پر ہوئے ہوئی بھی ان کی خوبصورتی اور ٹھنڈک کا شانتی بھرا اثر ہی سچی خدائی ہے۔ ایک مرتبہ جب بھی ہم آسمانوں کو دیکھتے ہیں تو اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔ اس وقت تو ایسا لگتا ہے گویا کہ ہمیں اپنی جگہ پر گنگا مل رہی ہے۔ ان تمام خیالات نے مجھے لامحدود آسمانوں کو دیکھنے کے لیے ایک شوقین ہیئت داں بننے پر مجبور کردیا ہے۔''

اگست 1932 کو ڈاکٹر کیلکر کو ایک اور خط میں گاندھی جی نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ علم ہیئت کی واضح درسی کتابیں شائع ہونی چاہیے اور انھوں نے مشورہ دیا کہ علم ہیئت کی کتابوں میں مغربی ممالک کے فلکی ماہرین کے نام اور ان کی مختصر زندگی کے بارے میں ضرور بتانا چاہیے۔

گاندھی جی نے مزید مشورہ دیا کہ علم ہیئت کی کتابیں جن کو وہ شائع کرنا چاہتے ہیں جہاں تک ممکن ہو ان میں اس میدان کی آج تک کی تمام تر تازہ ترین دریافتوں کی گنتی بھی شامل ہو۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کتابوں میں علم طبیعیات[6] کے بارے میں بھی جانکاری ہونی چاہیے۔

گاندھی جی نے ماتھر داس تیکم جی کو ایک خط میں اس بات کا شدید اظہار کیا کہ ان کو اس علم کی تعریف میں دیر ہوئی ہے۔

''میں خود ستاروں کا مشاہدہ ہر رات کر رہا ہوں اور بہت ہی زیادہ لطف اٹھا رہا ہوں۔ میں بڑھاپے کی عمر میں راتوں کو جاگ رہا ہوں لیکن اس جاگنے میں کوئی حرج نہیں ہے یہاں تک کہ موت کے بستر پر بھی ستاروں کے مشاہدوں سے روح کی جھلکی کو دیکھنے میں مدد ملتی ہے۔ حالانکہ میں نے اپنی دلچسپی سے ستاروں کے سائنس کی تعریف کی جیسا کہ میں نے بار بار دہرایا کہ واقعی آسمان میں جڑے ہوئے ستاروں کا دیکھنا میرے لیے بہت ہی اطمینان بخش روحانی تجربہ ہے۔ اس مخلصانہ کوشش میں جدید تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے اور زیادہ کیا ہوسکتا ہے۔ بس ایسا لگتا ہے کہ اس روحانی تجربے کی شدت میں مداخلت نہیں کی جائے۔''

توضیحات

1 شوقین ہیئت داں (Amature astronomer) وہ شخص جس نے اجرام فلکی کا علم باقاعدہ کسی علمی ادارہ سے حاصل نہیں کیا ہو بلکہ بطور ایک شوق کے حاصل کیا ہو۔

2 علم ہیئت (Astronomy) اجرام فلکی کا علم۔

3 رصد گاہ (Observatory) ایک مخصوص جگہ جہاں سائنسی آلات کی مدد سے اجرام فلکی کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

4 مجمع النجوم (Constellation) آسمان میں ستاروں کی پہچان کے لیے کچھ ستارے ایک گروپ کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔

5 سیاروں (Planets) خلا میں چٹان، گیس یا برف کے بڑے بڑے گول اجرام جو اپنے اپنے مدار میں اپنے ستارہ (سورج) کے اس کی کشش کے ذریعے گردش کرتے ہیں۔

6 علم طبیعیات (Physics) مادوں اور توانائی سے تعلق رکھنے والا علم۔

حوالہ جات

1 مضمون 'مہاتما گاندھی کا ستاروں کا مشاہدہ کرنے اور علم ہیئت سے تھوڑے وقفے کی دلچسپی' مصنف ڈاکٹر نندیتا رتھنا سری، سابق ڈائرکٹر، نہرو پلینیٹاریم، نہرو لائبریری و میوزیم، تین مورتی بھون، چانکیہ پوری، نئی دہلی۔

2 گاندھی جی ہیریٹج پورٹل (Gandhiji Heritage Portal)

* گاندھی جی کا خط بنام ڈاکٹر ڈی بی کیلکر بتاریخ 23 جولائی 1932۔

* گاندھی جی کا خط بنام ڈاکٹر ڈی بی کیلکر بتاریخ 26 اگست 1932۔

* گاندھی جی کا خط بنام ماتھرداس تیکم جی بتاریخ 25 جولائی 1932۔

3 گاندھی جی کا مضمون علم ہیئت سے متعلق 'آسمانوں کا مشاہدہ۔ اول' بتاریخ 11 اپریل 1932۔

4 گاندھی جی کا مضمون علم ہیئت سے متعلق 'آسمانوں کا مشاہدہ۔ دوم' بتاریخ 18 اپریل 1932۔

5 رپورٹ 'مہاتما گاندھی جی کے کاموں کا مجموعہ' شائع انگریزی اخبار 'دی ہندو' بتاریخ 3 اپریل 1933۔

■

Aneesul Hasan Siddiqui
679, Sector 22-B
Gurugram - 122016
Mob.: 9654949434

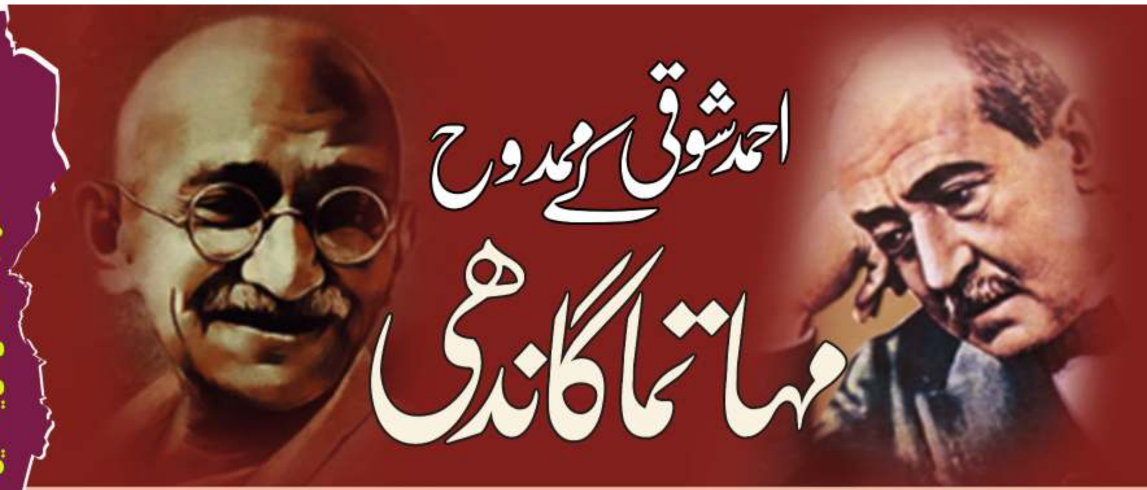

احمد شوقی کے ممدوح
مہاتما گاندھی

غزالہ پروین

احمد شوقی 1869 میں مصر کے ایک مالدار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ خالص عربی النسل نہ تھے بلکہ آپ کے والد کا تعلق کُرد اور والدہ کرد و یونانی نسل سے تعلق رکھتی تھیں۔ ابتدائی تعلیم عربی زبان میں ہوئی۔ لہٰذا ان مختلف عناصر کے امتزاج سے شوقی عربی زبان کے ایک باکمال شاعر بن گئے جن کی موسیقیت اور غنائیت پر عرب دنیا فخر کرتی ہے۔ بچپن ہی سے آپ کی پرورش و پرداخت شاہی محل و ماحول میں ہوئی کیونکہ آپ کے خاندان کے تعلق و انسلاک کی وجہ سے احمد شوقی کی شخصیت ایک سازگار ماحول میں پروان چڑھی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شوقی نے شعبۂ ترجمہ میں داخلہ لے لیا۔ فارغ ہونے کے بعد خدیو توفیق پاشا نے شعبۂ ترجمہ میں ملازم رکھ لیا۔ چند سالوں کے بعد پاشا نے اپنے ذاتی خرچ پر احمد شوقی کو قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے فرانس بھیج دیا۔ فرانس و برطانیہ کا یہ دورانیہ تقریباً ساڑھے چار سالوں پر مشتمل ہے۔ اس دوران شوقی نے مغربی تہذیب و ثقافت، تعلیم و تمدن کا مشاہدہ کیا اور وہاں کے شعرا و ادبا کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ وہاں جدید افکار و خیالات سے شوقی اثر پذیر ہوئے۔ شوقی دراصل ایک ایسے ماحول کے پروردہ تھے جس پر جمود و تعطّل کا غلبہ تھا، عربی شعر و ادب میں روایت و قدامت پسندی کی ترویج تھی، مغربی و جدید افکار و خیالات نے آپ کے احساسات و تخّیل کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ فرانس کے سفر سے قبل اور قیامِ فرانس کے دوران شوقی کی شاعری کا محور شاہی محل اور اس کی سرگرمیوں کے ساتھ فنونِ لطیفہ اور کچھ سماجی موضوعات بھی رہے۔ دراصل احمد شوقی کی شاعری کو تین ادوار میں منقسم کیا جاتا ہے۔ ابتدائی شاعری مغربی ممالک کے سفر سے قبل اور قیام کے دوران کی شاعری جس کا محور صرف شاہی خاندان کے افراد رہے۔ دوسرا دور جلاوطنی کے بعد جو تقریباً 5 سالوں پر مشتمل ہے۔ تیسرا دور پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر مصر واپس آنے کے بعد جو قومی و ملّی شاعری کا دور کہا جائے گا۔

احمد شوقی کی شاعری مشرقی و مغربی افکار و خیالات کا ایک حسین امتزاج ہے۔ مغربی افکار سے اثر پذیر ہو کر شوقی نے رنگ شاعری کچھ تبدیل کیا۔ واپسی کے بعد کم و بیش اس بیس سالہ دور میں آپ نے فنونِ لطیفہ، سماجی و سیاسی مذہبی موضوعات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ احمد شوقی فطرتاً اعلیٰ اقدار کے حامل تھے۔ لہٰذا انھوں نے ایسی بہت سی شخصیات پر خامہ فرسائی کی جنھوں نے انسانیت سازی کا کردار نبھایا جنھوں نے سماجی و اصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ملک و قوم کی خاطر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔

احمد شوقی نے ایسی بہت سی عبقری شخصیات (جیسے مولانا محمد علی جوہر، مصطفیٰ کامل، عمر مختار وغیرہ) کی تعریف و توصیف میں مدحیہ قصائد لکھ کر انھیں بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا اور انھیں حیاتِ جاوداں بخشی۔ انہی عظیم شخصیتوں میں مہاتما گاندھی کا نام بھی شامل ہے۔

شوقی کی اس مدحیہ نظم کا وصف خاص یہ ہے کہ انھوں نے گاندھی جی سے اپنی غیر مشروط اور والہانہ وابستگی کے اظہار میں اس خوبصورت نظم کو تحریر کیا ہے۔

بابائے قوم مہاتما گاندھی کی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں تمام عالمی ادب و زبان میں لکھا گیا ہے۔ جدید عربی ادب میں جہاں مختلف عربی شعرا و ادبا نے عالمی موضوعات کو روشناس کرایا وہیں ہندوستان کے سپوت مہاتما گاندھی پر بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ بہت سے عربی شعرا، ادبا و صحافیوں نے گاندھی جی کے نظریات و اصولوں سے اثر پذیر ہو کر ان کے بارے میں دل کھول کر لکھا۔

دراصل ہندوستان کی جنگ آزادی میں گاندھی جی ایک رہنما و قائد بن کر ابھرے، آزادی کے لیے انھوں نے ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں۔ گاندھی جی کی سادہ طبیعت، بلند اخلاقی، بلند اقبالی اور بے لوث قوم کی خدمات کو عرب قوم نے کافی سراہا۔ ان کے خیالات و نظریات سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے گاندھی جی کے افکار و خیالات اصولوں کی ستائش کی۔ ان ہی اصولوں و افکار سے اثر پذیر ہو کر گاندھی جی کی حیات اور وفات کے بعد عربی ادب میں بے شمار تحریریں ملتی ہیں۔

گاندھی جی پر لکھی گئی یہ منظوم تحریر مصر کے عربی شاعر احمد شوقی کی ہے جس میں گاندھی جی سے والہانہ لگاؤ اور ان کی تعلیمات و نظریات سے اثر پذیر ہو کر ان کو اس نظم میں شوقی نے بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

مہاتما گاندھی پر لکھی شوقی کی یہ مدحیہ نظم جہاں عربی کی شعری روایت میں ایک اہم اور مستند کاوش ہے وہیں تاریخِ جنگِ آزادی کے دوران لکھی گئی نظموں میں اعلیٰ مقام بھی رکھتی ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں اس نظم کا مبسوط و ہم آہنگ اردو ترجمہ کیا جانا چاہیے۔ یہ ہماری مشترکہ ادبی تاریخ کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہ نظم ملاحظہ فرمائیں۔

بنی مِصر اُرفِعَوُ الغار
و حیّو بَطَلَ الھند
وأدّوُوا واجباً واَقُضُوا
حقوق العِلُم الَفرِدِ
أخوکُم فی اُلمَقاساۃ
و عركُ الموقف النّكد
و في اُلتَضُحيَةِ الكُبرىٰ
و فی المطلبِ والُجُهد
و فی اُلجرح و فی اُلدّمع
و في النّفيِ مِن اُلمَهُدِ
و في اُلّرحلَةِ لِلُحَقِّ
و في مَرُحَلَةِ اُلوَفدِ
قِفُوا حيوه مِن قُرب
علىٰ اُلفُلُكِ و مِن بُعد
وَعَظّوا البَر با الآس
وغطوا اُلبَحر بِاُلوَرِدِ
علىٰ افريز (راجبوتا
ن) تمثال من المجد
بنی مِثلِ (کو نَفُشيو
س) أو مِنُ ذَلِكُ اُلعَهدِ
قريبُ اُلقَولِ والفِعلِ
مِن اُلمُنتَظِرِ اُلمَهدِی
تَشُبِهِ اُلّرسُلَ فی اُلنّودِ
عن الحقِ و في الذّهدِ
لَقَدُ عَلّمه بِاُلحَقِّ
با لُصَّبرِ وَ بلقَصُدِ
وَنادىٰ المشرقِ اُلَاقصىٰ
فلَبّاهُ مِنَ اُلّحدِ

وَ جاءَ الا نفُس الْمَرْضیٰ
فَدا ولها مِنَ الحِقْدِ
دعا الْهِندُوس و الا سلا
م لِلالْفَةِ وَالْوَدِّ
بِسحْرِمن قوى الْروح
حَلى الْسيفَيْن في غَمَدِ
وَ سلطان مِن ُالنَّفس
يَقْوى رائض الاَسَدِ
وَ تو فيق مِنَ الله
وَ تيَسّر مِنَ السَّعْدِ
وَ حَظٌّ لَيس يُعْطَاهُ
سِوَى الْمَخلوق لِلْخُلدِ
وَلا يُو خَذُ بِالْحَوْلِ
وَ لا الصَّول، ولا الْحُندِ
وَلاَ بِا نَسْلِ وَالْمَالِ
وَلاَ بِالكَدحِ وَ الْكَدِّ
وَلٰكِنْ هِبَةُ الْمَولىٰ
تعال- لِلْعَبْدِ
سلامُ النَّيل يا غَندى
و هٰذا الدَّهرُ مِن عِنْدى
وَاجلال مِنَ الاهرا
م وَالْكَرنُكِ وَ الْبَردى
وَمِنْ مَشْيخة الْوَادي
وَمِن اَشْبالِهِ الْمُرْدِ
سَلامُ حَالِبَ الشَّاةِ
سَلامُ غازِلَ الْبَرْدِ
وَمَنْ صَدَّ مِنَ الْمِلحْ
وَلَم يقبل على الشَّهد
ومن تركب ساقيه
من الهند إلیٰ السِّنْدِ
سَلامُ كُلَّما صلي
تَ عُريانا وَ فِي اَلْبُدِ
وَفي زاوِيَةِالسِّجْنِ
وَ في سِلْسِلَةِ الْقيدِ
مِنَ (الْمَا ئدة الْخَضْرا
ء) خُذْجِلدكِ يا غندی
وَلاَ حظَّ ورق "السَّير"
وَمافِي وَرق "الْوَردِ"
وكن اَبْرع مَن يَلْعَ
ب بِالشَّطْرَنجِ وَالنَّرْدِ
وَلاقِ الْعَبقَرِيين
لِقَاءَ النِّدِّ لِلنِّدِّ
وَقُل: هَالُو اُقَا عيكم
اتى الحاوي مِنُ الْهِنْدِ!

وَعد لم تحفل الذام
ولم تغتر بالحمد
فَهٰذ ا النَّجمُ لاَ ترقیٰ
اِلَيهِ هِمَّةالنقد
ورَدَّ الْهِند لِلام
ةِ مِن حَدٍّ اِلیٰ حَدٍّ

اے مصر والو! اپنی آنکھیں کھولو اور ہندوستان کے بہادر (گاندھی جی) کو سلام کرو۔ ان کی مکمل طور پر تعظیم بجا لاؤ جس کے وہ حقدار ہیں، ان کا پرچم یکتا اور منفرد ہے۔ گاندھی جی تمھارے ہم خیال ہیں اور محرومی و یاسیت میں تمھارے بھائی ہیں۔ وہ اپنے اعلی مقصد اور کوشش و جہد کے لیے بے پناہ دکھ جھیل رہے ہیں۔ وہ زخم اور رنج سے اشکبار ہیں۔ وہ اپنے وطن عزیز سے بہت دور ہیں۔ انھوں نے حق (حصول آزادی) کے لیے نہ صرف ہجرت کی بلکہ قافلے کی رہنمائی بھی کی۔

اے مصر والو! تم جیسے ہی گاندھی جی کا سفینہ دیکھو، ان کے احترام میں کھڑے ہو جاؤ، انھیں سلام کرو (چاہے دور سے یا نزدیک سے ان کا استقبال کرو)۔ ان کی عزت افزائی اور استقبال کے لیے اس قدر پھولوں کی بارش کر دو کہ بحر و بر پھولوں سے بھر جائیں۔ دیکھو! راجپوتانہ جہاز پر گاندھی جی سوار ہیں جو بزرگی و عظمت کی مثال ہیں، وہ کنفیوشس کی طرح اپنی قوم کے پیغامبر ہیں یا یوں کہو ان کا تعلق اسی عہد سے ہے۔

'گاندھی جی جو ہمیشہ اپنے قول و فعل میں یکساں ہیں، زمانے سے ایسے ہی سپوت کا انتظار تھا حق و سچائی کے معاملے میں اور نیکی اور تقوی میں یہ پیغمبروں اور اوتاروں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی قوم کو حق' صبر' عزم و حوصلے کی تعلیم دی، انھوں نے مشرق اقصیٰ کو پکارا ہے لہٰذا، اے لوگو! تم ان کی آواز پر قبروں ہی سے لبیک کہو اور جب بھی گاندھی جی کے پاس مریض آئے تو انھوں نے ان کی نفرت کا علاج محبت سے کیا ہے۔ گاندھی جی نے ہمیشہ ہندو اور مسلمان دونوں کو محبت و الفت اور بھائی چارے کا درس دیا ہے۔ ان کی شخصیت میں ایسا جادو ہے کہ فریقین (ہندو مسلمان) کی تلواریں ہمیشہ میان میں رہیں، گاندھی جی دراصل روحانیت و اخلاقیت کے بادشاہ ہیں، انھوں نے اپنی بلند اخلاقی سے سرکش شیروں کو بھی درست کر دیا ہے۔ یہ ان کے لیے اللہ کا خاص فضل و کرم ہے، اس جیسی بلندی و اکرام کس کو نصیب ہوتی ہے۔ تحمل، رواداری او ضبط نفس، قدرت انھیں لوگوں کو عطا کرتی ہے جنھیں حیات دوام یا ابدیت دینا چاہتی ہے۔ مصائب و مشکلات، حوادثِ زمانہ یا دشمنوں کے لشکر ان کا کچھ نہیں کر سکتے یہ سعادت یا بلند اقبالی نہ تو نسلی یا موروثی ملتی ہے نہ ہی محنت و کوشش سے حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ یہ تو محض اللہ کا عطیہ ہے یہ نعمتیں اللہ، اپنے خاص و مقرب بندوں کو ہی دیتا ہے۔

اے گاندھی! تم پر دریائے نیل کا سلام ہو اور میری طرف سے آپ کی عزت افزائی کے لیے اشعار کا گلدستہ پیش خدمت ہے۔ ہمارے پاس اہرام کا جلال اور قلم کا کمال ہے، سو ہم اسے بھی تیری نذر کرتے ہیں، اور اے گاندھی! اس بزرگ وادی کے ننھے بچے بھی تمھیں سلام عرض کرتے ہیں۔

سلام ہو! بکری کا دودھ دوہنے والے پر، سلام ہو چادر بننے والے پر، سلام ہو ان پر جس نے ملک کے لیے ستیہ گرہ کی اور شہد کے بدلے بھی اسے قبول نہیں کیا (یعنی قیمتی چیز کا سودا نہیں کیا)، سلام ہو ان پر جس نے اپنے مقصد کی خاطر، ہند سے سندھ تک پیدل سفر کیا، سلام ہو ایسے انسان پر جو نیم عریاں رہ کر یا پیوند لگے کپڑے پہن کر حق کی آواز اٹھاتا ہے اور کسی سے نہیں ڈرتا۔ سلام ہو ان پر جو کبھی قید خانہ کے گوشے میں بند رہا اور کبھی زنجیروں میں قید رہا۔

اے گاندھی! برطانیہ میں جس کانفرنس میں تم شرکت کے لیے جا رہے ہو اپنے آپ کو انگریزوں کے مکر و فریب سے بچائے رکھنا۔ ان کے یہاں خار ہی خار ہے یعنی ان کے منصوبوں میں، نقصان ہی نقصان ہے پھولوں یا فوائد کا نام و نشان نہیں ہے۔

اے گاندھی! تم انگریزوں کی چالاکی و عیاری سے مرعوب نہ ہونا بلکہ ان سے زیادہ چالاک بن جانا، جس طرح نرد اور شطرنج کے کھیل میں ہوا کرتا ہے، اس کانفرنس میں عبقری شخصیات سے ملاقات کرنا کیونکہ یہ غیر معمولی اشخاص تمھاری عظمت کے معترف ہیں۔

اے گاندھی! تم دشمنوں سے کہہ دو کہ تم اپنے سانپ باہر نکالو، یعنی تمھارا حربہ استعمال کرو میں بھی ہندوستان کا ماہر بازی گر ہوں۔''

اے گاندھی! ان کی مذمت سے مت ڈرنا، اور نہ ہی ان کی تعریف سے دھوکے میں آنا تمھاری مثال ایک روشن ستارے کی مانند ہے۔ کوئی تم پر تنقید کی ہمت نہیں کرسکتا۔''

اے گاندھی! اب تم ہندوستان کو ایک سرے سے، دوسرے سرے تک گلزار یعنی خوشحال بنادو

مراجع و مصادر

تاریخ ادب عربی: احمد حسن زیات، 1985

جدید عربی شاعری: ڈاکٹر فوزان احمد 2008

جدید عربی ادب: ڈاکٹر ابو عبید 2011

تاریخ ادب عربی: ڈاکٹر محمد صدر الاسلام 2017

■

Dr. Gazala Parveen
Arabic Department
Dr. Rafiq Zakaria College for Women
Aurangabad- 431001 (Maharashtra)
Mob.:9850782985

اُردو اور ہندوستانیت

بانو سرتاج

ہندوستانیت، ایک وسیع موضوع ہے جسے سمجھنے کے لیے ہندوستان کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب وتمدن کا مطالعہ کرکے روحانی اور فلسفیانہ حقیقتوں کی طرز پر بحث متوقع ہے۔ ہندوستانی ادب میں ہندوستانیت کی تلاش بذات خود حیرت انگیز ہے۔ مگر کئی اسباب کے پیش نظر ناگزیر بھی ہے۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، بولیاں علاحدہ ہیں۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ کون سی زبان کس زمانے میں کس تہذیب کی گود میں پروان چڑھی، کس تمدن کے اثرات قبول کیے یہ تاریخ کے تحت آتا ہے۔ زبان کی نفسیات کا علم بھی ضروری ہے۔ کوئی کوئی موضوع ازحد حساس ہوتے ہیں جو عقل وفہم کی بنیاد پر سمجھے جائیں تو ہی مثبت نتائج دیتے ہیں ورنہ زیادہ تر تو بے تعلقی، نفرت اور ناقدری کے بیج بوتے ہیں اسی لیے ہندوستانیت کے پیچیدہ مسائل کو فلاسفی کی پیچیدہ گتھیوں کی طرح مہارت سے برتنا پڑتا ہے۔

ہندوستانیت کیا ہے؟

ہندوستانیت کو سمجھنے کے لیے پہلے بھارت اور بھارتیتا(भारतीयता) کو سمجھنا ضروری ہے۔ زمانۂ قدیم میں ملک بھارت کے کئی نام رائج تھے: جیسے آجنابھ ورش (अजनाभ वर्ष)، کاریہ کُس(कार्यकुस)، کرم سنستھان (कर्म संस्थान)، ہیموت ورش(हैमवत वर्ष)وغیرہ۔

رگ وید میں یگینی(यज्ञानि) یا یگیہ اگنی کو بھارت کہا جاتا تھا۔ بھارت کے رہنے والوں نے ملک میں سب سے پہلے یگیہ (پوجا) کی اگنی (آگ) جلائی یعنی (यज्ञाग्नि) جلائی اس لیے اس ملک کا نام بھارت پڑا۔

ایک دوسرے خیال کے مطابق، رگ وید کے زمانے میں ایک انسانی گروہ 'بھرت' نامی ہوا کرتا تھا۔ اس گروہ کے نام پر ملک کا نام بھارت پڑا۔

ویدک کال (زمانے) میں آریوں میں 'بھرت' نام کی ایک طاقتور اور بہادر قوم تھی جس نے ستلج ندی کو پار کرکے اپنی بستیاں بسائی تھیں۔ یہ بستیاں بھرت جن پد(जनपद) بستی کے مکین 'بھارتیہ پرجا' اور وہ مخصوص علاقہ بھارت کے نام سے متعارف ہوا۔

ایک اور خیال کے مطابق سمراٹ دُشینت اور شکنتلا کے فرزند راج کمار بھرت کے نام پر ملک کا نام 'بھارت' ہوا۔

یہ بھی مانا جاتا ہے کہ بودھ مذہب کی ابتدائی کتابوں میں جس 'جمبودیپ'(जम्बू द्वीप) کا ذکر ہے اسی کا ایک حصہ بھارت کہلایا۔

بھارت کے قدیم باشندے دراوڑ تھے۔ پھر آریوں نے اس ملک میں قدم رکھا۔

دوسرے ملکوں کے راجاؤں نے بھی بھارت پر حملے کیے مگر وہ سونے کی چڑیا بھارت سے مال و زر لے کر اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ گئے۔ قافلوں کی آمد جاری رہی اور اس درمیان بھارت کو 'ہندوستان' نام ملا جو بھارت نام کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہندواستھان (हिंदू-स्थान) سے 'ہندوستان' نام بنا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ 'ہندو' لفظ، آرین ڈکشنری میں کہیں نہیں تھا۔ بھارت کا خاص مذہب ویدک دھرم اور دیش، آرین دیش، تھا ہندو دھرم یا ہندومت کا کہیں وجود نہیں تھا۔ پھر عرب شمال مغرب کی طرف سے بھارت میں داخل ہوئے، سندھو ندی کے کنارے ڈیرا ڈالا تو کثرت استعمال سے لفظ 'سندھو' ہندو میں تبدیل ہوا، سندھو ندی کے کنارے رہنے والے سندھو یعنی ہندو کہلانے لگے۔

بعد کے دور میں ترکی اور ایرانیوں نے بھی 'ہندو' لفظ ہی استعمال کیا۔ ہندو کی مناسبت سے ہندواستھان (हिन्दू स्थान) رائج ہوا۔ بھارت کے رہنے والوں نے خود 'ہندو

استھان' کو قبولیت کی سند دے دی۔

بھارت سے بھارتیتا (भारतीयता) اور ہندوستان سے ہندوستانیت پر اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم صرف 'ہندوستانیت' پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔

بھارتیتا کے معنی 'بھاشا' رسالے میں اس طرح دیے گئے ہیں: بھارت کی بنیاد میں 'بھرت' لفظ ہے۔ 'بھا' کے معنی روشنی اور 'رت' کے معنی غرق ہونا۔ اس طرح بھارت یعنی روشنی میں ڈوبا ہوا ملک۔

ہندی شبد ساگر میں کہا گیا ہے: بھارتیہ یعنی بھارت کا رہنے والا اور بھارتیتا یعنی بھارت سے متعلق۔

ہندوستانیت، زندگی گزارنے کا سچا فن ہے کیونکہ انسان کو دماغی سکون دیتا ہے۔ ہندوستانیت سے مراد وہ جذبہ یا خیال ہے جس میں ہندوستانیت کی جھلک ہو یا جو ہندوستانی تہذیب سے وابستہ ہو۔

سوامی وویکا نند نے ہندوستانیت کو روحانی ترنگوں سے شرابور جذبہ مانا ہے۔ مہارشی اروند نے عقیدت کو ہندوستانیت کا بنیادی جز قرار دیا ہے۔ مختلف عناصر میں 'یکجہتی' ہندوستانیت ہے۔

ہندوستان، رسم و رواج اور مادّیت میں نہیں ہے۔ ہندوستانیت کے تئیں نظریہ اشتراک کا نظریہ ہونا چاہیے۔ انفرادی اور اجتماعی حیثیت میں زندگی کی وسعت اور اختصار کو سمجھنے کی کوشش ہندوستانیت ہے، اسی کی مدد سے ہم عالمی فلسفہ کو سمجھ سکتے ہیں جو تقریباً ہر ملک کا مقصد ہے۔

ہم اپنی خصوصیات اور کمیوں کے ساتھ ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانیت کوئی آفاقی چیز نہیں ہے، وہ زندگی کی عام خاصیت ہے— ہندوستانیت آج وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے اقدار کی قبولیت میں ہے۔ دستیاب ذرائع سے خوشحال ملکوں کے درمیان ملک کو وقار دلانے میں ہے۔ ضعیف الاعتقاد اور فرسودہ روایات کے خلاف مجموعی کوششیں کرنے میں ہیں۔

ہندوستانیت دل کا وہ جذبہ ہے جس میں یہ مان کر چلا جاتا ہے کہ ملک کی علاحدہ اور خاص پہچان ہے جس کی کئی علامات ہیں جیسے روحانیت، تہذیب، تحمل، خواتین کا احترام، یکجہتی، صبر و استغنا، اتحاد و اتفاق، میزبانی، قربانی، مذہبی رواداری، مثالی شخصیات، تہوار Universal Brotherhood وغیرہ۔

اردو زبان و ادب کی بات کریں تو یہ اپنی شیرینی اور لطافت کے سبب ہر دور میں ہر دلعزیز رہی ہے۔ مسلم حکمرانوں کی زبان ہونے کی وجہ سے ملک کے کونے کونے میں پہنچی۔ مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے

اردو زبان اپنی پیدائش کے وقت ہی سے مشترکہ ہند آریائی کلچر کی ترجمان رہی ہے۔ اردو ادب میں وطنیت، ہندوستانیت اور سیکولرزم کی جتنی بو باس رچی ہوئی ہے وہ شاید ہی ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں ہو۔

اسے گلے لگایا، اس میں ادب تخلیق کیا۔ اردو، مذہب، ذات پات وغیرہ کے تنازعوں سے پرے ہندوستانیوں کی مشترکہ میراث ہے۔

اردو زبان اپنی پیدائش کے وقت ہی سے مشترکہ ہند آریائی کلچر کی ترجمان رہی ہے۔ اردو ادب میں وطنیت، ہندوستانیت اور سیکولرزم کی جتنی بو باس رچی ہوئی ہے وہ شاید ہی ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں ہو۔ ڈاکٹر، ظ۔ انصاری اردو کے اس ہمہ پہلو کردار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو شاعری نے سنت-صوفیوں اور فقیر منش ویدانتیوں کی گود میں آنکھ کھولی ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ شاہی دربار میں جب فارسی اور سنسکرت کی سرپرستی ہوا کرتی تھی، اردو شاعری جنوبی علاقہ میں مراٹھی اور تیلگو کے سائے میں دکنی کے نام سے پروان چڑھی، میلوں-ٹھیلوں میں، مٹھوں- خانقاہوں میں، ہاٹ- بازار میں رام داس اور نام دیو کے ترجموں کی صورت میں اشلوکوں اور آیتوں کے دیسی روپ میں، فارسی کے بڑے شاعروں کے عام پسند خیالات کی ترجمانی کی شکل میں دلوں میں گھر کر رہی تھی— بیجاپور اور گولکنڈا کے شہزادوں نے اسے نوک پلک سے سنوارا تو یہ باقاعدہ ایک ایسی زبان کی شاعری بن کر ابھری اور نکھری جس میں گرامر شمال کی کھڑی بولی ہندی جیسی تھی اور الفاظ تھے کچھ دیسی کچھ ودیشی— زیادہ سے زیادہ رسیلے اور سمجھ میں آنے والے۔ کئی طرح اور کئی زمینوں کے آزادانہ عقیدے نے بھی اس میں آکر مل گئے تھے۔''

اردو شاعری پر ہر زمانے میں یہ الزام لگتا رہا ہے کہ اس میں ہندوستانی عناصر کا فقدان ہے۔ فراق گورکھپوری تک نے کہا:

''شاعری ہندوستان کی اور اس کی جڑیں اور بنیادیں کے مدینے اور شیراز میں! یہ بات میرے گلے کے نیچے نہیں اترتی۔ ہندوستانیت کی روح اگر اردو شاعری میں سرایت کر سکے تو اس شاعری میں ایک معصومیت، کائنات و حیات کی ہم آہنگی، ایک طہارت، ایک روحانی مجازیت و مادّیت آجائے گی جس سے ایسے سنسار سنگیت پھوٹ نکلیں گے جو سورگ سنگیت کو بھی مات کر دیں گے۔''

اردو میں شاعری مسلمانوں نے کی ہے، ہندوؤں نے بھی کی ہے اور دوسرے مذاہب کے شعرا نے بھی کی ہے۔ ہندو صرف ہندوستان میں بڑی تعداد میں ہیں جب کہ مسلمان تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دنیا کے لوگوں سے، عقیدوں سے شہروں سے وہ جڑے ہوئے ہیں، اس وجہ سے اگر ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے مقدس مقامات، تہذیب، معاشرت، پہاڑ، ندیاں، پھل پھول، چرند پرند کی جھلکیاں ان کی شاعری میں آجاتی ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اردو کے شاعروں نے ہندوستانیت کو اپنی شاعری سے دور رکھا ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی، اردو شاعری میں قومی وحدت اور ہندوستانیت کی وکالت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''عادل شاہ اپنی نظموں میں ہندو فلسفے اور دیوی دیوتاؤں کا عقیدت سے ذکر کرتا ہے۔ قلی قطب شاہ صحیح معنوں میں صوفی ہندوستان کا اکبر کہلاتا ہے۔ وہ کسی مصلحت کوشی کے بغیر داخلی جذبے سے سرشار ہوکر ہندوستانیت کے نغمے الاپتا ہے۔ اس کے یہاں ہندوستان کے رسم و رواج، پھل-پھول، موسم، لباس، میلے- ٹھیلے، راکھی ہولی- دوالی سب کچھ سمٹ آیا ہے۔ اسی طرح ملا وجہی ہندو صنمیات کا بھرپور ذکر کرتا ہے۔ جعفر زٹلی، فائز، حاتم، آبرو، ہندوستانیت کے رس سے سرشار نظر آتے ہیں۔ افضل جھنجھانوی کا بارہ ماسہ، ایک روشن مثال ہے جس کی نظموں میں قلی قطب شاہ ہی کی طرح ہندوستانی موسم، پھل- پھول، چرند-پرند، تہوار، رسم و رواج اور قومی معاشرت کی تصویریں جستہ جستہ سامنے آجاتی ہیں، حتیٰ کہ جو استعارے اور تشبیہات استعمال ہوئی ہیں ان میں بھی پوری ہندوستانی فضا بسی ہوئی ملتی ہے۔ میر، درد، سوز، قائم، یقین اپنے پیش روؤں کی طرح ہند آریائی روایات اور رجحانات کا احترام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظیر اکبرآبادی نے ہندو اوتاروں، میلوں، تہواروں کا ذکر، ہولی، دیوالی، راکھی، بانسری، برسات کا ایسا سلسلہ پیش کیا ہے جس میں ہندوستان کی مٹی کی بو بسی ہوئی ہے۔''

اردو شاعری پر لگائے گئے اس الزام کی تردید کئی ادیبوں اور شاعروں نے اپنے مضامین میں کی ہے۔ دیکھا جائے تو ہندوستانی شاعری، ہندوستانیت کی روح

کی غیر موجودگی میں عام انسانوں اور اعلیٰ طبقہ دونوں کے دلوں کو چھو ہی نہیں سکتی تھی... حقیقت تو یہ ہے کہ اردو شاعری سب کے دلوں پر راج کرتی ہے۔ جب جب اس میں ہندوستانیت کے فقدان کا سوال اٹھا، اردو ادیبوں نے سیکڑوں مثالیں پیش کر دیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنے مقالے 'اردو شاعری اور ہندوستانیت' میں کہا:

''میر کی مثنویاں ہوں یا شکارنامے ہر جگہ مقامی رنگ اور ہندوستانی فضا واضح نظر آتی ہے... یہاں تک کہ سودا کے قصیدوں کے آغاز میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے خاص طور سے وہ قصیدہ جو آصف الدولہ کی مدح میں لکھا گیا۔ اس میں جنگ کے طریقوں کی منہ بولتی تصاویر نظر آتی ہیں۔ یہی حال ہجو یہ قصیدوں کا ہے۔ انشا کے قصیدوں میں اودھ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کا کوئی بھی پہلو نظیر اکبرآبادی کی نظروں سے نہیں چھوٹا۔ میر انیس اور دبیر کے مرثیے، کربلا کے واقعات پر منحصر ہیں۔ ان کے کردار بھلے ہی عرب کے ہوں، ان کی روح ہندوستانی ہے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، گفتگو یہاں تک کہ مزاج اور عمل

اردو کے ادیب چاہے وہ مسلم ہوں یا ہندو، ہندوستان میں رہتے ہیں تو ہندوستانیت سے دور کیسے رہ سکتے ہیں؟ جس ماحول میں رہتے ہیں، ان کا تصور اسی ماحول کی بیکراں وسعتوں میں پرواز کرے گا جو دیکھیں گے اسی کی عکاسی کریں گے، جو کچھ ان کا اپنا ہے، فخر سے اسی کا بیان کریں گے۔ سیکڑوں میں ایک نظیر اکبرآبادی ایسے شاعر ہیں جو سر سے پاؤں تک ہندوستانی ہیں، ہندوستانیت ان کی تخلیقیت کا الگ نہ کیا جاسکنے والا حصہ ہے۔

تک ہندوستانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ان مرثیوں میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں بے ساختہ شرون کمار کے بے جان جسم پر اس کے نابینا والدین کی آہ وزاری یاد آتی ہے۔ مثنویاں بھی ہندوستانیت سے مبرا نہیں ہیں۔ مثنوی 'سحرالبیان' مثنوی 'گلزار نسیم' مثنوی 'زہر عشق' میں قدم قدم پر ہندوستانیت کی مثالیں ملتی ہیں۔ واجد علی شاہ کے 'رہش' امانت کی 'اندر سبھا' اور 'واسوخت' رنگین اور جان صاحب کی 'ریختی' یعنی کوئی صنف نہیں جو ہندوستانی رنگ میں نہ رنگی ہوئی ہو۔ محمد حسین آزاد کی شاعری اور حالی کی مسدس اس وقت کے معاشرہ کی عکاس ہے۔ اکبر الہ آبادی، چکبست، اقبال، اختر شیرانی، جوش، احسان دانش، میراجی، شاد عارفی وغیرہ کے کلام میں ان کے وقت کا ہندوستانی معاشرہ الگ الگ انداز میں جلوہ افروز ہوا ہے۔''

عربی، ایرانی، ترکی زبانیں جب ہندوستان میں آئیں تو ظاہر ہے ان کی تہذیبیں بھی ساتھ آئی ہوں گی۔ ہندوستان کی زبانوں اور ہندوستان کی تہذیب کے ساتھ ان کا میل ہوا، اس لیے اردو شاعری میں ان کا ذکر ملتا ہے مگر جس ملک کے وہ شاعر ہیں اس ملک کی ہر چیز سے انھیں پیار رہے۔ ملک کا ہر رنگ ان کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ رفیعہ شبنم عابدی ہندوستان کے ان رنگوں کی وضاحت کرتی ہوئی کہتی ہیں:

''بسنت، ایران کا موسم نہیں لیکن قطب شاہ کے یہاں موجود ہے۔ ہولی - دیوالی عربوں کے تہوار نہیں لیکن نظیر کے یہاں اس کی بہاریں دیکھ لیجیے۔ ہمالہ عرب و ایران کا پہاڑ نہیں لیکن اقبال کی نظم میں اس کی بلندی کا بیان ہے۔ گوپیوں کے ساتھ راس رچانے کی رسم عرب و ایران کی نہیں لیکن واجد علی شاہ کے ساتھ منا کر دیکھیے۔ اندر سبھا عرب و ایران میں کہاں؟ ہاں امانت کے ساتھ اردو میں یہ محفل سجی ہوئی دیکھی جاسکتی ہے۔ اگر اردو شاعری محض فارسی کا چربہ ہوتی تو چکبست رامائن کی بجائے شیریں فرہاد کا قصہ قلم بند کرتے اور اگر محض عربی کی خوشہ چینی ہوتی تو میر انیس خواتین کربلا کے کرداروں کی عکاسی میں ہندوستانی رنگ آمیزی سے کام نہ لیتے۔''

اردو کے ادیب چاہے وہ مسلم ہوں یا ہندو، ہندوستان میں رہتے ہیں تو ہندوستانیت سے دور کیسے رہ سکتے ہیں؟ جس ماحول میں رہتے ہیں، ان کا تصور اسی ماحول کی بیکراں وسعتوں میں پرواز کرے گا جو دیکھیں گے اسی کی عکاسی کریں گے، جو کچھ ان کا اپنا ہے، فخر سے اسی کا بیان کریں گے۔ سیکڑوں میں ایک نظیر اکبرآبادی ایسے شاعر ہیں جو سر سے پاؤں تک ہندوستانی ہیں، ہندوستانیت ان کی تخلیقیت کا الگ نہ کیا جاسکنے والا حصہ ہے۔

ہندوستان، مختلف مذہبوں کا سنگم

ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے ماننے والے مل جل کر رہتے ہیں۔ مذہب کی اچھائیوں نے یہاں رہنے والوں کو مالا مال کر رکھا ہے۔ ایک شاعر جنت کی ندی کوثر اور ہندوستان کی مقدس ندی گنگا کا سنگم ہندوستان میں بنانا چاہتا ہے۔

کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کے لیے
اک نیا سنگم بنا دوں گا زمانے کے لیے
ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتاب زرنگار
ثبت ہوگا جس کی زرّیں جلد پر 'ہندوستان'

اردو کے شعرا نے قرآن ہی کو اہمیت نہیں دی، گیتا کے تقدس کا بھی خیال رکھا ہے۔

اپنے ہاتھوں کو پڑھا کرتا ہوں
کبھی قرآں کبھی گیتا کی طرح — کیفی اعظمی

دل میں پیدا نور ہو پختہ ہو ایمان
سوچ سمجھ کر جو پڑھے گیتا، وید پُران — وڈیا ساگر آنند

جہاں قرآن اور گیتا کا برابر احترام
ہے میسر جس وطن کو آج جمہوری نظام — عاصم بریلوی

ہاتھوں میں تسبیح لیے شیخ اللہ کو یاد کرتا ہے۔ شیخ کی شناخت تسبیح سے تو برہمن کی پہچان زنار سے ہوتی ہے مگر سچ بات تو یہ ہے کہ تسبیح اور زنار سے نہیں، آدمی اپنے اعمال سے پہچانا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ہندوستانی بلا خوفِ مذہب ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔

بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے
دلِ حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں — چکبست

شیخ ہو یا برہمن معبود ہے سب کا وہی
ایک، دونوں کی منزل پھیر کچھ راہ کا — نامعلوم

لڑتے ہیں جا کے باہر یہ شیخ اور برہمن
پیتے ہیں میکدے میں ساغر بدل بدل کر — مائل

تسبیح اور زنار بھلے ہی مختلف مذاہب کی نشانیاں ہوں، ہندوستانیوں کے دلوں میں دراڑ نہیں ڈالتے۔ کعبہ، کاشی، مسجد-مندر، ناقوس-اذان سب قابلِ احترام ہیں۔

اذاں دیتے ہیں بت خانے میں جا کر شانِ مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں — چکبست

جس جگہ ناقوس بجتے ہیں تو ہوتی ہے اذاں
وہ مرا ہندوستان ہے وہ مرا ہندوستان — عاصم بریلوی

ہندو شاعر جب اردو میں شاعری کرتے ہیں تو حضرت موسیٰ، کوہِ طور، نقشِ سلیمانی وغیرہ کا اسی عقیدت سے ذکر کرتے ہیں جس عقیدت سے رام۔ کرشن کا کرتے ہیں، گوور دھن پربت کا کرتے ہیں۔

تپشِ شوق کو موسیٰ کی نظر ہے درکار
ورنہ دنیا میں تجلی نہیں یا طور نہیں
دار سونی ہے فقط نعرہ زنی باقی ہے
مست و مجذوب ہیں لاکھوں کوئی منصور نہیں
چکبست

قابل احترام ہستیوں کا ہندوستان

ہندوستان لاتعداد قابل احترام شخصیات کا وطن ہے۔ قابل تقلید رہنماؤں کا وطن ہے۔ یہاں کئی ایسی ہستیوں نے جنم لیا ہے جنھوں نے اپنے اخلاق اور اعمال سے عام انسان کی رہنمائی کی ہے۔ اسے جینے کا سلیقہ سکھایا ہے۔

خاک سے جس کی اٹھے کتنے ہی علمائے کرام
ہے جو اوتاروں کا مسکن اور منیوں کا مقام

عاصم بریلوی

نظیر اکبرآبادی ہندو مسلم کی مشترکہ تہذیب کے خاکہ نگار تھے۔ انھوں نے تنہا اس موضوع پر اتنے اشعار لکھے ہیں جتنے کسی ہندو شاعر نے نہ لکھے ہوں گے۔ شریف احمد قریشی نے ایک طویل فہرست تیار کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر اپنے سرمایۂ شاعری میں جہاں حضرت علی کے 40 ناموں کا ذکر کیا ہے وہاں شری کرشن کے 77 ناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ سیکڑوں ہندو دیوی دیوتاؤں کے نام اس کے علاوہ ہیں۔

اردو شاعری میں بھگوان شنکر کے سمندر سے نکلنے والے زہر سے لوگوں کو بچانے کے لیے زہر پی جانے کا بیان ہے تو گوتم بدھ کے پیغام، ان کے نجات حاصل کرنے کا بیان بھی ہے۔ شری رام اور شری کرشن کی فضیلت کا بیان ہے تو بخاری اور چشتی کو بھی سلام کیا گیا ہے، صوفی سنت اور امن کے حمایتی رہنماؤں کو جگہ دی گئی ہے۔

یہ شنکر کی، رام اور کنہیا کی دھرتی
یہ گوتم کی، نانک کی، خواجہ کی نگری

نورا ندوری

بدلتے موسموں کا زہر پی لوں
میں شنکر بن کے کچھ دن اور جی لوں

مہدی پرتاپ گڑھی

چکبست اپنے ملک کی شان میں گیت گاتے ہیں تو ملک کے بہادروں کو سلام کرنا فراموش نہیں کرتے۔ گوتم، سرمد، شہنشاہ اکبر رانا پرتاپ کا ہندوستانیوں پر پڑنے والے اثر کا بیان کرتے ہیں۔

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا ہے اس چمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش میں اب تک کیفیتِ اذاں ہے

چکبست

نازش پرتاپ گڑھی، ہندوستان کی عظمتِ رفتہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ روایات کے خزانوں سے آج بھی ہندوستانیوں کے لیے بہت کچھ حاصل کرنے کے مواقع روشن ہیں، ان سے زندگی کا قرینہ سیکھا جاسکتا ہے۔

ملے گا بدھ کے پیامِ حق میں تمھیں سکونِ حیات اب بھی
گیا کے ذرّے دکھا رہے ہیں جہاں کو راہِ نجات اب بھی
ایودھیا کی فضاؤں میں ہے وفائے سیتا کی بات اب بھی
مصیبتوں کے گھنیرے جنگل میں رام لچھمن ہیں ساتھ اب بھی
کریدو ماضی کی راکھ اس میں شعور کا جامِ جم ملے گا
انھیں روایات کے خزانے سے تم کو زورِ قلم ملے گا

شری رام کی شخصیت پر مکند لال خوشدل، بابو گرو نارائن، دتاتریہ موہن کیفی، میلا رام وفا، جگن ناتھ خوشتر، چکبست، جگن ناتھ آزاد، شباب للت وغیرہ سیکڑوں ہندو شعرا ہی نے نہیں لکھا، اقبال، ظفر علی خاں، ساغر نظامی، سلام مچھلی شہری، جاں نثار اختر، رفعت سروش وغیرہ مسلم شعرا نے بھی لکھا ہے.. انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ہے رام کے وجود میں ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں ان کو امامِ ہند

اقبال

ہندیوں کے دل میں باقی ہے محبت رام کی
مٹ نہیں سکتی قیامت تک حکومت رام
زندگی کی روح تھا، روحانیت کی شان تھا
وہ مجسم روپ میں انسان کا عرفان تھا

ساغر نظامی

شری کرشن پر نظیر اکبرآبادی نے نو، تلوک چند محروم نے آٹھ، رونق دہلوی نے سات، کیفی دہلوی نے پانچ، اثر لکھنوی، بہزاد لکھنوی اور منور لکھنوی نے تین تین نظمیں لکھیں۔ سیماب اکبرآبادی نے 'کرشن گیتا' کے عنوان سے مجموعہ شائع کرایا۔ ظفر علی خاں، باسط بسوانی، شاداں گوالیاری، حسرت موہانی، جوش، حفیظ جالندھری، احسان دانش وغیرہ نے متعدد نظمیں لکھیں، مہابھارت اور گیتا کے ترجمے کیے۔

کچھ ہم کو بھی، عطا ہو کہ اے حضرتِ کرشن
اقلیم عشق آپ کے زیرِ قدم ہے خاص
حسرت کی ہو قبول متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمھارا کرم ہے خاص

حسرت

خوب سنتے ہیں سر گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنہیا کے ہے ڈوبا بادل
دیکھیے ہوگا شری کرشن کا کیوں کر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کل

محسن کاکوروی

ہندوستان میں سکھ مذہب کے ماننے والوں کے لیے گرونانک قابل احترام، قابل پرستش ہیں۔ اقبال، مہدی نظمی، عدیل مستحسن، خواجہ دل محمد، دویا ساگر آنند، نظیر اکبرآبادی وغیرہ کئی شعرا نے انھیں شعری نذرانہ پیش کیا ہے۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں، وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر ہیں جگ میں، یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود و مراد سبھی کی بَر لاتے ہیں دل خواہ گرو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرواہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا اَرداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

نظیر اکبرآبادی

رامائن اور مہابھارت کے کردار، استعارے، بودھ، جین، مذہب کے کردار اردو شاعری میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔

چند ریکھاؤں میں سیماؤں میں
زندگی قید ہے سیتا کی طرح — کیفی اعظمی

رام سیتا تو بن میں گھومے تھے
ہم تو بھٹکے ہیں در بہ در بابا — پریم وار برٹنی

اپنی قسمت میں چودہ برس کا نہیں
مستقل زندگی بھر کا بن باس ہے — شباب للت

حضرت محمدؐ نبی آخر ہیں۔ وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے نبی ہیں۔ وہ محسنِ انسانیت ہیں اس لیے ہندوستان کے اردو شعرا نے اپنی اپنی شاعری میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مسلم شعرا کے ساتھ ہری چند اختر، مہاراجہ بشن پرساد شاد، چندر پرکاش جوہر بجنوری، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، فراق گورکھپوری، کالی داس گپتا رضا، دتو رام کوثری، تلوک چند محروم، ستیش چندر سکسینہ طالب، گرسرن لال ادیب، بشیشر پرساد منور لکھنوی وغیرہ شعرا نے نعت، منقبت، حمد کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔

تکمیلِ معرفت ہے محبت رسولؐ کی
ہے بندگی خدا کی اطاعت رسولؐ کی
اتنی سی آرزو ہے اے ربِّ دو جہاں
دل میں رہے سحر کے محبت رسول کی — کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کردیا
کس نے ذرّوں کو اٹھایا اور صحرا کردیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کردیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کردیا
کہہ دیا 'لاتقنطو' اختر کسی نے کان میں
اور دل کو سربسر محوِ تماشا کردیا — پنڈت ہری چند اختر

1960 کے بعد کی اردو شاعری میں جدیدیت کے

نام پر ہندو دیومالائی علائم کے بے تحاشا استعمال نے شاعری میں خصوصاً اور نثر میں عموماً ہندی الفاظ کی بھرمار کردی۔ (یہ لہر بھی ہندوستانیت کے زیرِ اثر تھی) اردو کی نظموں/ غزلوں کے مجموعوں کے عنوانات ہندی میں رکھے جانے لگے۔ چند عنوانات مع شعرا کے ناموں کے ساتھ پیش ہیں:

کاویم (काव्यम) ،کاوش بدری، امرائی (بدیع الزماں خاور) ولاس یاترا (کمار پاشی) ،نیل کنٹھ تھاروح پھر بولی (اسلم آزاد)، گوتم (راج نارائن رام)، چتّا اور کاگا (محمد علوی)، پتھروں کی آتما اور متسیہ گندھا (मत्स्यगंधा) (عمیق حنفی)، نروان اور یاترا ملن (وزیر آغا)، تانترک (کرشن موہن)، راکھ اور سندور تھا جمنا، بے نہ رات (رؤف خیر)، پچھمن ریکھا، ناچ رے زندگی اور روپ رہس (रूप–रहस) (عرش صہبائی)، بدھم شرنم گچھامی (बुद्धं– शरणं –ग च्छामी) (آشفتہ چنگیزی)، یاتری، پریتاتما (प्रेतात्मा)، پشاچ نگری (पिशाच नगरी) اور روپ ارتھنائیں (کمار پاشی)، انعد حنش، اپدیشک (उपदेशक)، مرلی منوہر، آواگون اور آیو پوجا (आयो दपू जा) (فرحت کیفی)، نجوگ اور مکتی (قاضی سلیم)، اماوس کا جادو (حرمت الاکرام)، شگن (مخمور سعیدی)، دشہرہ، ہولی، دوالی، گنگا اشنان (شاد عارفی)، پانچواں گگن (ودیا ساگر آنند) وغیرہ لاتعداد مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

ہندوستان کے پہاڑ، ہندوستان کی ندیاں

ہندوستانیوں کے لیے ملک کا ذرّہ ذرّہ قابلِ احترام ہے۔ قابلِ احترام ہے وہ ہمالہ جو صدیوں سے ملک کی حفاظت کررہا ہے۔ قابلِ عقیدت ہیں وہ ندیاں جن کا پانی زندگی دیتا ہے، جسم وروح کو تازگی دیتا ہے۔ علامہ اقبال 'ہمالہ' نظم میں ہندوستان کے اس دور سے ہمالہ کی وابستگی کی کہانی بیان کرتے ہیں جب وہ پہلے پہل مسکنِ آبائے انسان بنا۔

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام وسحر کے درمیاں
اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
یا دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!

مرزا محمد اشفاق شوق، وطن والو، نظم میں ہندوستانیوں کو ہمالہ کی طرح عظیم بننے کی تلقین کرتے ہیں۔

ہندوستانیوں کے لیے ملک کا ذرّہ ذرّہ قابل احترام ہے۔ قابلِ احترام ہے وہ ہمالہ جو صدیوں سے ملک کی حفاظت کررہا ہے۔ قابلِ عقیدت ہیں وہ ندیاں جن کا پانی زندگی دیتا ہے،جسم وروح کوتازگی دیتا ہے۔

ہمالہ کی طرح خود کو بناؤ وفا ومہر کی ندیاں بہاؤ
ہمیشہ پھول دامن میں سجاؤ شمیمِ گل سر بازار رکھو
وطن والو! وطن سے پیار رکھو!

اردو شاعری میں بلخ کی ندیوں جیحون وسیحون، دجلہ وفرات و دریائے نیل کا ذکر ہے، مگر ہندوستان کی ندیوں گنگا- جمنا، سرسوتی- کاویری، نرمدا- سرجو، گومتی کا ذکر ان سے زیادہ ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ندی کی اپنی تاریخ ہے، اپنی عظمت ہے۔ یہ ندیاں ملک کی زمین کو سیراب کرتی ہیں، کسانوں کو زندگی دیتی ہیں— گنگا اور جمنا مقدس ندیاں ہیں۔ اردو شاعری میں ان کا کثرت سے ذکر ہوا ہے۔ سرور جہان آبادی نے "گنگا جی" نظم میں گنگا کے ہمالہ سے نکلنے، ملک کو فیضِ عام پہنچانے کے عمل کا ذکر کیا ہے۔

ہندوستاں سے ایک دریائے فیضِ قدرت
اور اس میں پنکھڑی ہے تو خوشنما کنول کی
نکلی ہمالیہ سے محو فروش ہوکر
تو آہ! تشنہ لب تھی وہ جلوۂ ازل کی
ہندوستاں کو تونے جنت نشاں بنایا
نہریں کہاں کہاں ہیں تیرے کرم کی جاری

صفی اورنگ 'بنارس' نظم میں گنگا کے خوبصورت کناروں اور وہاں اشنان کرنے والوں کی عقیدت کا بیان کرتے ہیں۔

ڈوب کر کیسے نکلتے ہیں ستارے، دیکھ لو
یہ تماشا آکے گنگا کے کنارے دیکھ لو
وہ دھندلکا صبح کا وہ دور تک گنگا کا پاٹ
وہ کناروں سے نمایاں جابجا پانی کی کاٹ
وہ پری زادوں کے جمگھٹ سے پرستاں راج گھاٹ
دل بہل جائے جو انساں کی طبیعت ہو اچاٹ
اتریں پانی میں مجرم روز کا معمول ہے
ہر حسیں نازک بدن گویا کمل کا پھول ہے

گنگا ندی اپنی عظمت کے سبب اردو شعرا کی پسندیدہ ندی رہی ہے۔

ہمالہ کی چاندی پگھلتی رہے
مرے گھر میں گنگا ابلتی رہے — سلیمان خطیب

تیری گنگا کا وہ خرامِ ناز
آبِ رودِ چمن کا وہ انداز — شرر فتح پوری

گئی ہے دامنِ گنگا کو چھو کے جب بھی ہوا
تمام عالمِ مشرق میں فن کے پھول کھلے — نوشاد علی

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا — اقبال

اے آبِ رودِ گنگا اف ری تیری صفائی
یہ تیرا حسن دلکش، یہ طرزِ دل ربائی — سرور جہان آبادی

گنگا- جمنا پاکیزگی کی مظہر ندیاں ہیں۔ نازش پرتاپ گڑھی ان ندیوں کو ملک کا قابلِ قدر سرمایہ مانتے ہیں۔

یہ رودِ سرجو ہے یا تقدس کی آنچ میں روح گل گئی ہے
پوتر جمنا کے روپ میں بانسری کی اک تان بہہ رہی ہے
یہ پاک گنگا کہ جس سے قلب ونظر کو آسودگی ملی ہے
ہماری دھرتی نے ہاتھ پھیلا کے ہم کو آشیرواد دی ہے
یہ ننھی موجیں ہیں یا کسی مہ جبیں کے ابرو کی جنبش ہیں
یہ نرم لہروں کا ہے ترنم کہ دل کی معصوم دھڑکنیں ہیں

سردار جعفری اردو زبان کی شیرینی اور لطافت کے لیے گنگا جل کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو ہندوستان کی گنگا جمنی روایات کے سائے ہی میں پلی بڑھی ہے۔

زبان وہ دُھل کے جس کو گنگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے
اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جس کے دل کی کلی کھلی ہے
جو شعر ونغمہ کے خلد زاروں میں آج کوئل سی کوکتی ہے
اسی زباں میں ہمارے بچپن نے ماؤں سے لوریاں سنی ہے
اسی زباں نے وطن کے ہونٹوں سے نعرۂ انقلاب پایا
اسی سے انگریز حکمرانوں نے خودسری کا جواب پایا

گنگا جل کے بے شمار فوائد ہیں۔ مسلمانوں کے گھروں میں جو اہمیت آبِ زم زم کی، وہی اہمیت ہندوؤں کے لیے گنگا جل کی ہے۔ اردو شعرا جب تعریفِ خدا کرتے ہیں تو اس میں ہندوستانی رنگ کی آمیزش کردیتے ہیں۔ ملک کی ہر چیز میں انھیں وہی کچھ نظر آتا ہے جو دوسری زبانوں کے شعرا کو نظر آتا ہے۔ محسن کاکوروی کاشی سے آنے والے ہر بادل کو گنگا جل سے لبریز مان لیتے ہیں۔ مذہبی اہمیت رکھنے والے مقامات کے بادل بھی سادہ پانی ہی لائے تو کیا؟ انھیں تو مقدس پانی لانا چاہیے۔

ہندوستان کی چند اور ندیوں کا ذکر اردو شاعری میں ملتا ہے۔

ہیں دلفریب منظر پہلو میں نربدا کے
روح رواں ہے گنگا آبِ رواں ہمارا
ناطق گلاؤٹھوی

بہار جنت سے تا ارضِ کاویری
وطن میں میرے کتنی نکہتیں آباد ہیں
آل احمد سرور

ہندوستان کے شہر، تاریخی وراثت

ہندوستان میں کیا نہیں ہے؟ خوبصورت شہر ہیں، تاریخی یادگاریں ہیں، خوبصورت تفریحی مقامات ہیں۔ تاج محل، قطب مینار، گولکنڈہ، اجنتا ایلورا ہیں جو ملک کے عظیم الشان ماضی کی کہانیاں سناتے ہیں۔ دلی کی دلکشی ہے، صبح بنارس ہے، شام اودھ ہے، مالوے کی راتیں ہیں۔ اردو کے شعرا نے پتھروں اور رنگوں میں منجمد ماضی کو الفاظ کا جامہ پہنا کر کتابوں میں محفوظ کر دیا ہے۔

یہ ہے ہمالہ کی زمیں تاج و اجنتا کی زمیں
سنگم ہماری شان ہے چتوڑ اپنی آن ہے
گل مرگ کا مہکا چمن، جمنا کا تٹ، گوکل کا بن
گنگا کے دھارے اپنے ہیں یہ سب ہمارے اپنے ہیں
سیماب اکبرآبادی

یہ لال قلعے کی سرخ تعمیر جم گیا ہو گلال جیسے
ہمالیہ کی بلندیوں میں زمین کا ہو جلال جیسے
نقوش ایلورا کے پتھروں پر کہ چشم گیتی میں خواب جیسے
قطب کی یہ لاٹ عزمِ آدم کی صورتِ کامیاب جیسے
نازش پرتاپ گڑھی

عمیق چھیڑ غزل غم کی انتہا کب ہے
یہ مالوے کی جنوں خیز چودھویں شب ہے
عمیق حنفی

تغافل، کمالِ فن، مزاج رام پور ہے
تو مجھ سے بے رخی میں بزمِ دوست بے قصور ہے
شاد عارفی

اے مظفر! کس لیے بھوپال یاد آنے لگا
کیا سمجھتے تھے کہ دلی میں نہ ہوگا آسماں
مظفر حنفی

ہندوستان کے تہوار

ہولی، دیوالی، دسہرہ ہو کہ وہ عید کا دن
پیار کے رنگ سے ہر چہرہ کو چمکاتے چلے
نصر قریشی

دیوالی ہندوستان کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ نظیر اکبرآبادی، سیماب اکبرآبادی، آل احمد سرور، غلام ربانی تاباں، مخمور سعیدی، حرمت الاکرام، افسر میرٹھی، نازش پرتاپ گڑھی، قتیل شفائی وغیرہ۔ اردو شعرا نے بھی دیوالی پر خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ حرمت الاکرام نے دیوالی منانے کا مقصد واضح کیا۔

روشنی پل ہے اندھیروں کے سمندر کے لیے
روشنی فتح نشاں، روشنی عنوان مراد
جانِ افسانہ ہے قندیلوں کے پر تو فگن
کیکئی جیت کے ہاری ہے، اماوس ہے یہی
رام کی ہار میں تھی جیت، یہ دیوالی ہے!

عید، مسلمانوں کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ اقبال، دانش لکھنوی، ظفر شاہدی، ساحر شفائی، انجم صدیقی، فراز حامدی، نازش پرتاپ گڑھی نے عید پر نظمیں لکھی ہیں تو رویندر جین، سرجیت سنگھ بخشی، کرشن کمار مینک نے بھی لکھی ہیں۔ کرشن کمار مینک (मयंक) عید کو مکمل ہندوستان کا تہوار قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دن کا فائدہ اٹھانا چاہیے، ایک دوسرے کے گلے مل کر تلخیوں کو بھلا دینا چاہیے۔

روشنی کو دوستی میں لے بدل دیکھ موقع مت گنوا عید کا
سکھ عیسائی ہندو اور مسلم ہی کیا ہے یہاں عاشق زمانہ عید کا

ہولی پر لکھی گئی بے شمار نظموں میں سے نظیر، نوح ناروی، شاہ حاتم، فضا ابن فیضی، میر، رنگین، جوش، حسرت، فائز، جاں نثار اختر، بہادر شاہ ظفر وغیرہ شعرا کی نظمیں یادگار نظمیں ہیں۔

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں..............
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں..............
اور ساغر مئے کے چھلکتے ہوں..............
نظیر اکبرآبادی

دشہرہ، رکشا بندھن، گنیش چترتھی، رام نومی، جنما شٹمی کے تہواروں پر بھی اردو میں نظمیں لکھی گئی ہیں۔

ہندوستان: زراعتی ملک

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے۔ یہاں گاؤں کی گوریوں کا، محنت کرنے والے کسانوں کی معاشرتی زندگی کا بیان عمدگی سے ہوا ہے۔ مثال کے طور پر فصلوں پر اشعار کا لطف لیں۔

کچھ مدھر تانیں فضا میں تھرتھرا کر رہ گئیں
دھان کے کھیتوں میں چنچل پنچھیوں کا شور تھا
عبدالرحیم نشتر

موسم نے کھیت کھیت اگائی ہیں فصلیں زرد
سرسوں کے کھیت ہیں جو پیلے نہیں رہے
مظفر حنفی

ہندوستان کے جنگل مشہور ہیں۔ انھیں جنگلوں میں ہندوستانی تہذیب کا جنم ہوا وہ پروان چڑھی۔ رشی منیوں کے آشرم میں، گروکلوں میں ہی ملک کی تاریخ لکھی گئی۔ ملک کے عظیم گرنتھ جنگلوں کے پرامن ماحول میں لکھے گئے۔ جنگلوں ہی میں شری رام اور پانڈوؤں نے بن باس کا عرصہ گزارا۔ کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔ ان جنگلوں کی تاریخی، مذہبی، معاشرتی، فلاحی خصلتوں کے سبب زندگی قبرستان بننے سے بچی ہوئی ہے۔

ان جنگلوں میں برگد، پیپل، شیشم، شہتوت، نیم، ببول، اپنی ہر چیز، ہر حصے سے انسان کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

بہت چین ملتا تھا پیپل کی چھاؤں میں
چھٹیاں منانے جاتے تھے گاؤں میں
وہ جمن کی بکری، وہ چودھری کی بچھیاں
اٹکھیلیاں کرتی تھیں پیپل کی چھاؤں میں
خواجہ مسعود حسن قریشی

نیم ایک فائدہ مند پیڑ ہے۔ خود کڑوا ہوتا ہے۔ دوسروں کے جسم کی کڑواہٹ کو ختم کرتا ہے۔ نیم اور کیکر کڑوے ہو کر بھی دوسروں کے کام آتے ہیں۔

یارو میرے پاگل پن کا سچ مچ کوئی علاج نہیں ہے
نیم نیم پر کوئل چاہوں، کیکر کیکر جامن ڈھونڈوں
دل کرشن اشک

شیشم کی لکڑی، شہتوت کے پھل، چنار کی خوبصورتی کی مثالیں جابجا ملتی ہیں۔ آم اور مہوا کے پھول فضا کو معطر کرتے ہیں، کوئل کی کوک دلوں کو ایک کرتی ہے۔

میرے شیشموں کی چھاؤں میں ہے دھوپ کے ٹھکانے
میری ندیوں کی لہروں میں ہے آگ کا بسیرا
شیر افضل جعفر

شہر جنوں کی دھوپ جلا دے گی جسم و جاں
چلیے، چلیں گھنیرے چناروں کے پاس ہم
پریم وار برٹنی

کھڑا ہے اوس میں چپ چاپ ہر سنگار کا پیڑ
دلہن ہو جیسے حیا کی سگندھ سے بوجھل
فراق

آم، انار، سیب بھارت کے مشہور پھل ہیں، کیلے، شریفوں، لیمو، بیر، جامن پر بھی اردو میں اشعار دستیاب ہوتے ہیں۔

ہندوستان کا قومی پھول کمل یا کنول ہے۔ خوبصورت پھول ہے۔ شعروں کے پیرہن میں اسے دیکھیے۔

یہ موج نور، یہ بھرپور کھلی ہوئی رات
کہ جیسے کھلتا جائے ایک سفید کنول
فراق گورکھپوری

وقت کا دریا کہ میں جس میں کنول بن کر کھلا
سوچیے تو بحر ہے اور دیکھیے تو... آب جو

عارف عبدالمتین

سوسن، یاسمین، گلاب وغیرہ ایران کے پھول ہیں، اردو شاعری میں ان کا ذکر ملتا ہے... ساتھ ہی ہندوستانی پھولوں جائی، جوہی، چمپا، سورج مکھی، چمیلی، شیونتی، رات کی رانی وغیرہ ہندوستانی شاعری میں رنگ اور خوشبو بکھیرتے ہیں۔

خاکستر جان کو میری مہکائے تھا لیکن
جوہی کا وہ پودا میرے آنگن میں نہیں تھا

زیب غوری

گھر گھر کھلے ہیں ناز سے سورج مکھی کے پھول
سورج کو پھر مانع دیدار کون ہے

شمس الرحمن فاروقی

جس طرف دیکھیے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں
لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل

محسن کاکوروی

ہندوستانی موسیقی

ہندوستان میں کلاسیکی موسیقی کی شاندار روایت ہے۔ الگ الگ علاقوں کا لوک سنگیت بھی بے مثال ہے۔ یہاں موسیقی کی روایت میں صوفیوں کا بڑا حصہ رہا ہے۔ صوفیوں نے نہ صرف یہ کہ موسیقی کے فروغ میں حصہ لیا بلکہ اس میدان میں کئی تجربے بھی کیے۔ نئے راگ ایجاد کیے، نئے سازوں کو پیش کیا۔ سہ تار (ستار) امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ امیر خسرو ہی نے پکھاوج کی جگہ ڈھولک اور طبلہ رائج کیا۔ قول، کلبانہ، نقش گل، ترانہ اور کئی راگ راگنیاں بنائیں۔ اردو شاعری میں دف رباب کی جگہ ہندوستانی راگ اور ساز ہی زیادہ نظر آتے ہیں۔ سرگم اور راگوں کا ذکر نظر آتا ہے۔

ساتوں سُروں کے راگ سے جلتی ہے دل کی آگ
باد فنا میں بھی میرا شعلہ سنبھل گیا

شہاب جعفری

آنکھوں سے ابلے ہیں دریا دل میں لگی ہے آگ
برکھا رُت میں چھیڑ دے جیسے کوئی دیپک راگ

حنیف کیفی

ہندوستانی موسم

ہندوستان کے موسموں نے اردو شاعری میں خاصی جگہ پائی ہے۔ چیت(चैत)، ساون، بسنت کے ساتھ چاندنی راتوں یہاں تک کہ اماوس کی راتوں کا بھی ذکر ہے۔

بسنت کھیلیں ہمن اور ساجنا یوں
کہ آسماں رنگِ شفق پایا ہے سارا

قلی قطب شاہ

سکھی ری اچیت رُت آئی سہانی
اجھوں امید میری بن نہ آئی

محمد افضل

ہندوستان کی دیہی زندگی

ہندوستان کے گاؤں کی بات ہو اور پنگھٹ، چوپال گاؤں کی گوری اور پگڈنڈیوں کی بات نہ ہو، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

سر پر گاگر ناک میں نتھ پاؤں میں جھانجر کہاں؟
ڈھونڈتے ہو شہر میں تم گاؤں کا منظر کہاں

ساحر ہوشیارپوری

جلدا ے چاند نکل آ بھی کہ اس نے اب کے
چاندنی رات میں پنگھٹ پہ بلایا ہے مجھے

باقر نقوی

کچی گاگر پھوٹ نہ جائے نازک شیشہ ٹوٹ نہ جائے
جیون کی پگڈنڈی پر چلتا ہوں احساس لیے

رفعت سروش

دھرتی ماں اور مقدس دیویاں

ہندوستانی تہذیب میں دھرتی کو ماں مان کر اس کی عزت کی جاتی ہے، اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ دھن کی دیوی لکشمی اور علم کی دیوی سرسوتی کی بھی پوجا ہوتی ہے۔

او ماتا! او بھارت ماتا
تجھ پہ خدا کی رحمت ماتا
سندر تو ہریالی تو ہے
دھانی آنچل والی تو ہے
پھول کھلائیں تیری ہوائیں
دُھن برسائیں تیری گھٹائیں
شہر کی نہریں دودھ کی دھاریں
گودی میں جنت کی بہاریں
جگ دیتا ہے تجھ کو دعائیں
ہم تیرا گن کس طرح گائیں

جمیل مظہری

ہندوستانی سماج دنیا میں آپ اپنی مثال ہے۔ عرب سے ایران تک اور یوروپ سے چین جاپان تک کے ممالک ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں، جب کہ بھارت میں ایسا نہیں ہے۔ مظفر حسین سید کے الفاظ میں:

''ایک ہندوستان میں نہ جانے کتنے ہندوستان بستے ہیں اور ایک ہندوستانی سماج نہ جانے کتنے سماجوں کے میل سے وجود میں آیا ہے، Unity in Diversity کی فلاسفی یہی ہے۔ کیا کسی اور معاشرے میں ایسی مثال مل سکتی ہے کہ ایک مذہب کی عبادت گاہ کی بنیاد، دوسرے مذہب کا صوفی رکھے؟ (دربار صاحب) ایک مذہب کی مذہبی کتاب میں دوسرے مذہب کے پیروکار کا کلام شامل ہو، (گروگرنتھ صاحب)۔ آخری سکھ گرو کی شاہکار تصنیف فارسی زبان میں ہو، (ظفرنامہ)۔ کیا کوئی اور سماج ایسا ہے جس میں سجان(सुजान) رائے کھتری اور چندر بھان برہمن نام کے فارسی عالم ہوں۔ کیا اور کوئی مشترکہ تہذیب ایسی ہے جس میں کرشن بھگوان کے بھگت شاعروں کی فہرست میں ملک محمد جائسی اور رس کھان سرفہرست ہوں اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی تعریف کرنے والے مسلمان شعرا کے ساتھ لاتعداد غیر مسلم شاعر شامل ہوں۔ برج بھاشا کے مشہور کوی کا نام عبدالرحیم خانخاناں ہو اور پنجابی کے سب سے بڑے شاعر کا نام وارث شاہ ہو؟ کیا کوئی اور سماج ہے جس میں فارسی کی اول ہندوستانی لغت کے تخلیق کار کا نام ٹیک چند بہار ہو اور اردو ادب کی تاریخ کو قلمبند کرنے کا اعزاز رام بابو سکسینہ نام کے عالم کو جاتا ہو۔ آریہ سماج کا دھرم گرنتھ (مذہبی کتاب) اردو زبان میں لکھا گیا ہو اور اردو کے جید عالم کا مہیش پرساد ہو؟

نہیں یہ مثالیں صرف ہندوستانی سماج میں ملتی ہیں—''

یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ آج بھارت میں اس کا اپنا کوئی علاقہ نہیں ہے اور خوش قسمتی یہ ہے کہ پورا ہندوستان اس کا ہے۔ یہی اس کی کمزوری ہے، یہی اس کی طاقت۔ اردو کا یہی روپ اس کی ہندوستانیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ بقول شاعر

سرزمینِ ہند پر اقوامِ عالم کے فراق
قافلے بستے گئے ہندوستان بنتا گیا

کتابیات

- اقبال احمد: سانسکرت ایکتا کا گلدستہ، پبلی کیشنز ڈویژن، دہلی، 1993
- بانو سرتاج: اردو شاعری میں راشٹریہ ایکتا، نرالی دنیا پبلی کیشنز، دہلی، 2001
- بدری ناتھ تواری: رام کتھا اور مسلمان ادیب، ہفتہ وار 'میری ماٹی میرا دیش' بھوپال، 2014
- پنڈت مہادیو پرساد (ایڈیٹر) بھارتیہ سنسکرتی کوش (viii) 'میری ماٹی میرا دیش' بھوپال، 2014
- جاں نثار اختر: ہندوستان ہمارا (حصہ اول و دوم)
- مظفر حنفی: تنقیدی نگارشات، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2014

■

Dr. Bano Sartaj
Opposite Akashwani, Civil Lines
Chandrapur - 442401 (MS)

اردو میں مکتوب نگاری: آغاز و ارتقا اور زوال

اسلم جمشید پوری

خط لکھنا، خیریت کا لین دین ہے۔اس کی ضرورت اُس وقت پڑی ہوگی، جب انسان لکھنے پڑھنے لائق ہوا ہوگا اور اپنوں سے دور بغرضِ ملازمت، تجارت یا رہائش کہیں اور گیا ہوگا۔ یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ دنیا کا وہ پہلا شخص کون ہے جس نے پہلی بار خط لکھا ہوگا۔ اُردو میں مکتوب نگاری کی روایت تو خاصی قدیم ہے لیکن غالب نے مکتوب نگاری کو ایک نیا مقام عطا کیا بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ غالب نے مکتوب نگاری کو بطورِ صنف Establish کرنے اور اعتبار بخشنے میں اساسی کردار ادا کیا۔ غالب سے قبل کی خطوط نگاری کے بہت واضح نقوش نہیں ملتے۔ ایسا نہیں ہے کہ غالب سے قبل خط لکھے نہیں جاتے تھے، بلکہ خط بہت زیادہ ثقیل زبان اور طول طویل القابات کے ساتھ لکھے جاتے تھے۔ خط میں کام کی بات تو صرف دو ایک جملے ہی میں ہوا کرتی تھی، مگر پورا خط احترام و آداب، القابات، دعائیہ جملوں سے بھرا ہوتا تھا۔ فارسی کے جملے، مصرعے اور ضرب الامثال کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔ یہ تو خیر سمجھیں کہ حضرتِ غالب نے شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو باضابطہ خط لکھے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ غالب کے وہ خط محفوظ رہے جو بعد میں ترتیب و تدوین کے ساتھ کتابی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے ورنہ اردو ادب ایک صنف سے محروم ہو جاتا۔

غالب نے جس طرح خطوط تحریر کیے، اس سے جہاں ایک طرف خطوط میں در آئی ثقالت کم ہوئی تو دوسری طرف خط میں گفتگو کا انداز بھی آیا۔ غالب کی زبان کی بے ساختگی، برجستگی اور ظرافت نے خط کو انتہائی مؤثر اور دلچسپ بنادیا۔ خطوطِ غالب پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے گویا دو لوگ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ سنجیدہ سے سنجیدہ مسائل بھی خط میں کچھ اس طرح بیان ہوتے ہیں کہ گویا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔

اردو میں خطوط نگاری کی ابتدا

یہ بات آج تک تحقیق طلب ہے کہ اردو میں پہلا خط کس نے کس کو تحریر کیا۔ اس سلسلے میں ہمارے محققین اور ناقدین کرام کسی ایک بات پر متفق نہیں ہیں۔ 1981ء میں شائع پروفیسر ثریا حسین کی کتاب گارساں دتاسی: اردو خدمات، علمی کارنامے' محمد طفیل کے نقوش کے خطوط نمبر 1968، داستانِ تاریخ اردو، حامد حسن قادری 1966 اور غالب اور شاہانِ تیموریہ (ڈاکٹر خلیق انجم) میں اردو کے پہلے خط اور پہلے مکتوب نگار پر کچھ اشارے ملتے ہیں۔ جن کے مطالعے سے ایک دھندلی سی تصویر سامنے آتی ہے، جس کے مطابق افتخار الدین علی خاں شہرت (1810)، رجب علی بیگ سرور، خواجہ غلام غوث خاں بے خبر (1846)، جان طپش، راسخ عظیم آبادی (1914 سے قبل) کے خطوط ملتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر ثریا حسین کی تحقیق کے مطابق شہرت کا خط تاریخی اعتبار سے اردو کا پہلا خط قرار پاتا ہے لیکن یہاں ایک مسئلہ پھر بھی قائم ہے۔ شہرت نے یہ خط کس کو لکھا، یہ واضح نہیں ہے۔ اس سلسلے میں گارساں دتاسی کے ذریعہ اس عہد کے خطوط کا مجموعہ 'ضمیمہ ہندوستانی کی مبادیات' جو 1833 میں شائع ہوا۔ ہماری تحقیق کا واحد Resource ہے۔ اس مجموعے میں اردو کے بیشتر خطوط ملتے ہیں۔ جن میں سے زیادہ تر انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی اور فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اور ملازمت کے خواہش مند حضرات کے خطوط ہیں۔ انھیں خطوط میں ایک خط راجہ رام موہن رائے کا بھی ہے۔ جو انھوں نے 1831 میں لندن سے دتاسی کو پیرس بھیجا تھا۔ خط ملاحظہ فرمائیں:

جناب فضیلت مآب زاد مجدہم و شرفہیم

رقعہ مبارک پہنچا و بندہ کو مسرور و معزز کیا۔ قادر علی الاطلاق آپ کو اس یاد آوری کے ساتھ سلامت رکھے۔ تین مہینے سے زیادہ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب پارس میں مشرف خدمت ہوگا اور وہ آپ کی توجہ سے جناب شیزی صاحب کی ملاقات حاصل کرے گا۔ آپ کے وعدۂ مراعات سے بندۂ کمتر ممنون ہوا و ادائے شکر تہہ دل سے کرتا ہے۔

زیادہ حدِ ادب

خادملکم ممنونکم

رام موہنو ہن

حرر فی التاریخ یکم اگست 1831

(بحوالہ اردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اور غالب، ڈاکٹر بیگم نیلوفر احمد،ص70، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2007)

غالب نے جس طرح خطوط تحریر کیے' اس سے جہاں ایک طرف خطوط میں در آئی ثقالت کم ہوئی تو دوسری طرف خط میں گفتگو کا انداز بھی آیا- غالب کی زبان کی بے ساختگی' برجستگی اور ظرافت نے خط کو انتہائی مؤثر اور دلچسپ بنادیا- خطوطِ غالب پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے گویا دو لوگ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں- سنجیدہ سے سنجیدہ مسائل بھی خط میں کچھ اس طرح بیان ہوتے ہیں کہ گویا کوئی بڑا مسئلہ نہیں-

راجہ رام موہن رائے کا یہ خط اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ گارساں دتاسی کے نام ہے اور اردو خطوط کے اوّلین نمونوں میں سے ایک ہے۔ غالب سے قبل رجب علی بیگ سرور اور ایک آدھ خط خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کا ملتا ہے۔ ویسے یہ بات بھی ثابت ہے کہ بے خبر، غالب کے معاصر ہیں اور خطوط غالب کے مجموعے 'عود ہندی' کو پہلے انھوں نے ترتیب دیا تھا۔ ہوسکتا ہے ایک آدھ خط، غالب کے خطوط سے پہلے کا ہو، یہاں ان کے ایک خط کا اقتباس نقل کر رہا ہوں۔

''...خدا کا شکر کرو کہ اُس نے تمھیں محبوب صورت، مرغوب سیرت، حسنِ شمائل، پسندیدہ خصائل، فہم و رساء، ذہن و ذکا، عقلِ سلیم، طبیعت مستقیم، علم مفید، بختِ سعید، تقریر کی فصاحت، تحریر کی بلاغت...''

(انشائے بے خبر، مرتبہ سیّد مرتضیٰ حسین بلگرامی، علی گڑھ، ص 10)

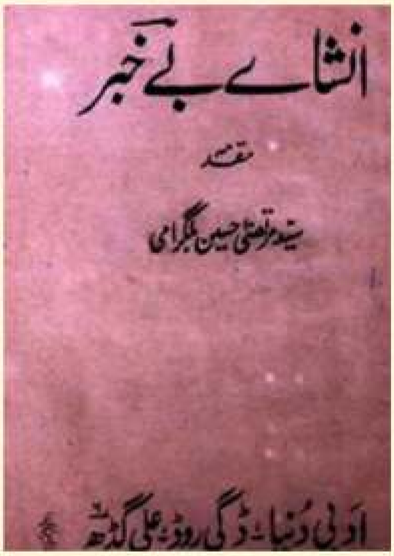

بے خبر کا یہ خط، مدح سرائی دوسرے لفظوں میں نثر میں تعریف کا نمونہ ہے۔ بے خبر ہوں یا رجب علی بیگ سرور، سرسیّد ہوں یا الطاف حسین حالی، سب غالب کے معاصر ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب سے قبل اردو میں مکتوب نگاری کی روایت نہ بہت قدیم ہے اور نہ صحت مند و توانا۔ معاصرین غالب میں بھی بے خبر پر غالب کے اثرات نظر آتے ہیں۔ خط کو عام فہم اور نثر کو رواں دواں بنانے میں جو کردار خطوط غالب نے ادا کیا وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کام کو آگے بڑھاتے ہوئے غالب کے ساتھ ساتھ سرسیّد اور الطاف حسین حالی کے خطوط نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ یہاں غالب کا ایک خط ضرور پیش کرنا چاہوں گا۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

از عمر و دولت برخوردار باشند۔

بدھ کا دن، تیسری تاریخ فروری کی، ڈیڑھ پہر دن باقی رہے۔ ڈاک کا ہرکارہ آیا اور خط مع رجسٹری لایا۔ خط کھولا۔ سو روپے کی ہنڈوی، بل، جو کچھ کہیے وہ ملا۔ ایک آدمی رسید مہری لے کر نیل کے کٹڑے چلا گیا۔ سو روپیہ چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپے داروغہ کی معرفت اُٹھے تھے۔ وہ دیے گئے۔ پچاس روپے محل میں بھیج دیے۔ چھبیس روپے باقی رہے، وہ بکس میں رکھ لیے۔ روپے کے رکھنے کے واسطے بکس کھولا تھا، سو یہ رقعہ بھی لکھ لیا۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہوا ہے۔ اگر جلد آگیا تو آج، ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی! بری آبنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا، قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔

غالب

چارشنبہ، 3 فروری 1858، وقت دوپہر

غالب کے مذکورہ خط میں جو اوصاف ہیں، وہ سب پر عیاں ہیں۔ لفظوں کی سادگی، جذبات نگاری، چھوٹے چھوٹے جملے، بے ساختگی، حالات کا تذکرہ وغیرہ سب کچھ ایک چھوٹے سے خط میں موجود ہے۔ خطوطِ غالب میں نہ صرف غالب کی ذاتی زندگی کے عکس ملتے ہیں بلکہ عہدِ غالب، معاصرین غالب، دوست احباب، شاگرد اور اُن کے عہد کے علاوہ 1857 کے حالات، انگریزوں کے بدلتے تیور، پنشن کے معاملات، اصلاح و تصحیح کے معاملے وغیرہ کا بھی احوال ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ خطوطِ غالب سے عہدِ غالب کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ مکتوب نگاری میں ڈیڑھ صدی کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی آج تک کوئی غالب کا ہمسر پیدا نہیں ہوا۔ جبکہ مکتوب نگاری کے ضمن میں تقریباً ایک درجن بڑے ادیبوں کے نام بہ آسانی لیے جاسکتے ہیں۔ بے خبر، سرور، الطاف حسین حالی، سرسیّد، شبلی، مہدی افادی، اقبال، منٹو، ابوالکلام آزاد، مالک رام، سجاد ظہیر، عبدالحق کے خطوط کی اہمیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ مگر غالب ان سب پر غالب ہیں۔

اردو میں جب مکتوب نگاری کی ابتدا کی بات کی جاتی ہے تو ہمارے محقق اس کا سہرا بھی غالب کے ہی سر باندھتے ہیں۔ لیکن ماہر غالب مالک رام کی رائے دوسروں سے کچھ مختلف ہے۔ وہ غالب سے پہلے رجب علی بیگ سرور اور دیگر اصحاب کا ذکر بھی کرتے ہیں:

''بیش تر لوگوں کا خیال ہے کہ اردو میں خط نویسی کی ابتدا غالب سے ہوئی۔ یہ درست نہیں۔ غالب سے پہلے فسانۂ عجائب والے رجب علی بیگ سرور نے خطوط لکھے اور شائع کیے اور یوں اکا دُکا خط کئی اور اصحاب کے بھی ملتے ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ غالب نے خطوں میں ایسا بدیہہ انداز اختیار کیا کہ انھیں سحر حلال بنا دیا۔ اس سے پہلے اور خود ان کے زمانے میں بھی فارسی خطوں میں لمبے لمبے القاب و آداب اور عبارت آرائی کی یہ بھر مار تھی کہ سطریں پڑھ جایئے لیکن مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تحریر کا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کو بھی اس اسلوب تحریر کی لغویت کا خیال نہ آیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اسے ترک کر دینے یا اس میں اصلاح کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس کا سہرا بھی غالب کے سر رہا۔''

('نقوش' خطوط نمبر، جلد اوّل، مدیر: محمد طفیل، اپریل 1968، ص 39)

مالک رام نے اردو خطوط نویسی کی ابتدا کے تعلق سے رجب علی بیگ سرور اور دیگر کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن یہ بھی مانا ہے کہ وہ غالب ہی ہیں جنھوں نے فارسی خطوط کے لمبے لمبے القاب و آداب اور عبارت آرائی کو اپنی تحریر سے ترک کرنے کی جرأت کی اور بالآخر وہ غالب کی اولیت کو مان لیتے ہیں۔

مکتوب نگاری کا ارتقا

مکتوب نگاری کی روایت کو غالب کے عہد اور بعد میں سمجھنے کے لیے میں یہاں چار معروف مکتوب نگاروں سرسیّد، شبلی، اقبال، منٹو اور ابوالکلام کے خطوط کے حوالے سے گفتگو کر رہا ہوں۔ سرسیّد کا شمار معاصرین غالب میں بھی ہوتا ہے اور بعد کے لوگوں میں بھی۔ ویسے ایماندارانہ بات تو یہی ہے کہ سرسیّد کی فکر و نظر اور تحریر میں ایک موڑ 1870 سفر لندن سے واپسی کے بعد آیا۔ جس میں 'تہذیب الاخلاق' کی اشاعت کا بڑا ہاتھ ہے۔ جس کے بعد سرسیّد کے مضامین، مقالات اور خطوط میں بھی اردو نثر کے وہ نمونے ملتے ہیں جن سے اردو نثر کو عام بنانے کی تحریک کو تقویت ملی اور یہ سب غالب کے بعد ہوا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سرسیّد کی نثر پر بھی غالب کے خطوط کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اور سرسیّد کو نثر کو عام فہم بنانے کی تحریک بھی غالب سے ہی ملی ہے۔ 1870 کو سرسیّد کی ادبی اور سماجی زندگی کا خط فاصل کہا جاسکتا ہے۔ ان کی تحریر میں امتیازات کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں سرسیّد کا ایک خط ملاحظہ فرمائیں۔ منشی شیام بہاری لال کو لکھا گیا سرسیّد کا یہ خط:

مشفقی منشی شیام بہاری لال صاحب

نجم الدین عرف ٹٹو کو یکم جنوری سے بارہ روپیہ ماہواری کے حساب سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے تنخواہ

ملا کرے گی۔ آپ لالہ سری لال کے ہاں سے منجملہ مبلغان کانفرنس 20 روپیہ منگا لیجیے۔ بارہ روپیہ تو نجم الدین کو بابت ماہ جنوری دے دیجیے اور کانفرنس کے اخراجات میں لکھیے اور یہ روپیہ بابت کرایہ ریل آمد و رفت نجم الدین کانفرنس کے حساب میں لکھیے اور وہ آٹھوں روپیہ میری امانت روزنامچۂ مدرسہ میں جمع کر دیجیے۔ والسلام

خاکسار

2/فروری 1893

سیّد احمد

(مکاتیب سرسیّد، مرتبہ مشتاق حسین، ص 383، فرینڈ بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 1995)

سرسیّد کا مذکورہ بالا خط کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس خط سے ایک تو سرسیّد کے قومی یکجہتی کے نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ سرسیّد نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں غیر مسلم ملازمین کو بھی ملازمت پر رکھا۔ دوسرے سرسیّد کے ذاتی معاملات کی ایک جھلک بھی دکھائی دیتی ہے کہ سرسیّد کس طرح محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا حساب کتاب شفافیت سے رکھتے تھے۔ جہاں تک خط کی زبان کا تعلق ہے تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ زبان بہت سہل اور عام فہم ہے۔ خط کا سن 1893 ہے یعنی عہد غالب کے بعد کا زمانہ خطوطِ غالب کے اثرات بھی مکاتیب سرسیّد پر صاف نظر آتے ہیں۔ سرسیّد کی تخلیقی کائنات کا یہ دوسرا دور ہے جس میں تہذیب الاخلاق کے مضامین کے موضوعات اور زبان سے اُردو کے فروغ کا نیا دَر وا ہوا تھا۔

اردو خطوط نگاری کے ارتقا میں معاصرین سرسید میں علامہ شبلی کا نام خاصا نمایاں ہے۔ انہوں نے قسطنطنیہ سے سرسید احمد خاں کے نام متعدد خطوط لکھے، جن میں سے ایک طویل خط کا اقتباس یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

سیدی!

تسلیم، 22 مئی کو یہاں پہنچا، لیکن تردّدات کی وجہ سے خط لکھنے کی مہلت نہ مل سکی، یہ خط بھی مختصر اور پرائیویٹ ہے، کچھ میں کچھ باتیں آپ انتخاب فرما کر چھاپ دیں تو ممکن ہے، میں نے سردست ایک مختصر سا حجرہ ۱۱ روپے مہینہ کرایہ کا لے لیا ہے، لیکن کھانے کا صرف بہت زیادہ ہے۔

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ دو تین سو یا اس سے زیادہ روپے بھیج دیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے لے لی جائے، یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جا سکے، کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں، لیکن کہاں تک لکھوائی جا سکتی ہیں، امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں اور بوعلی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں، امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں، خیر جو ممکن ہوگا کیا جائے گا، یہاں اکثر لوگوں سے ملاقات ہو سکتی ہے، لیکن مشکل زبان کی ہے، بعض بڑے کالج دیکھے مگر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے حالات معلوم کرنے میں نہایت دقت ہوتی ہے، میں نے ترکی پڑھنی شروع کی ہے اور ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ بقدر ضرورت واپسی کے وقت تک سیکھ لوں گا، اس وقت تمام کالجوں وغیرہ کی رپورٹ تیار کر سکوں گا۔

حالات دلچسپ ہیں اور سفر نامہ کے لیے بہت سامان مل جائے گا، لیکن اس وقت بلکہ زمانہ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی، ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے، بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں...

شبلی نعمانی

25/مئی 1882

قسطنطنیہ مقام تخت خان قریب محمود پاشا

(خطوطِ شبلی، مرتب مولوی محمد امین زبیری، تاج کمپنی لاہور، 1926، ص 41)

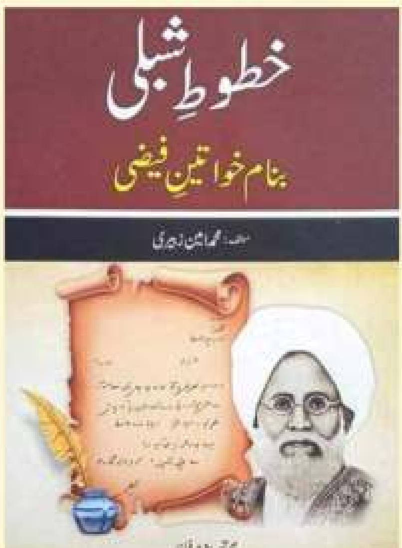

بیسویں صدی میں مکتوب نگاری کا جہاں تک سوال ہے تو اقبال، منٹو اور ابوالکلام آزاد کے مکاتیب کو صدی کے نمائندہ خطوط کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اقبال ہماری شاعری کی آبرو ہیں تو ان کی نثر کا بھی ایک اہم مقام ہے۔ مکاتیبِ اقبال خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ جنھیں سیّد مظفر حسین برنی نے 'کلیاتِ مکاتیب اقبال' کی شکل میں پانچ ضخیم جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ جنھیں اُردو اکادمی، دہلی نے 1993 میں شائع کیا۔ اقبال کا ایک خط دیکھیں۔ یہ انھوں نے مولانا سیّد سلیمان ندوی کے نام لکھا تھا۔

15/جنوری 34

مخدومی، السلام علیکم

دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے، جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادّی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف بھی ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) حالتِ نزاع میں ہے۔ غرض کہ نظامِ عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے۔ اس بحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیں۔ اور اگر کچھ کتابیں ایسی ہوں جن کا مطالعہ اس ضمن میں مفید ہو تو ان کے ناموں سے آگاہ فرمائیے۔

والسلام

محمد اقبال

(کلیات مکاتیب اقبال، مرتبہ سیّد مظفر حسن برنی، ص 449، جلد سوم، اردو اکادمی دہلی، 1993)

مولانا سیّد سلیمان ندوی، اقبال کے معاصرین میں تھے۔ مذہبی فکر و فلسفہ اور اسلامی وژن کے معاملے میں مولانا سیّد سلیمان ندوی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اقبال ان کا بہت احترام کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً بعض اسلامی معاملات میں مولانا سے صلاح و مشورہ بھی کر لیا کرتے تھے۔ اقبال خود اسلامی فکر و فلسفے کے تعلق سے اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے۔ اور اپنی شاعری میں خودی کا فلسفہ ہو یا کامل مومن کی بات، اقبال نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ اور تعلیمات کو بنیاد بنا کر اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ اقبال کے متعدد اشعار اسلامی نظریۂ تبلیغ و اشاعت کا بہترین ذریعہ ہیں۔

مذکورہ خط میں اقبال پورے عالم میں سیاسی ابتری اور تہذیب و تمدن کی شکست و ریخت سے فکرمند ہیں۔ جمہوریت اور سرمایہ داری کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ آمریت بڑھ رہی ہے۔ ایسے میں اقبال مولانا سے سوال کر رہے ہیں کہ کیا اسلام عالم میں جدید تشکیل میں معاون ہو سکتا ہے؟ یہ خط دراصل ہندوستان کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کے سیاسی نظام کے لیے ہونے والی فکرمندی کا اظہار یہ ہے۔ یعنی اس خط سے عصری حسیت کے طور پر سیاسی صورتِ حال کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی مولانا سیّد سلیمان ندوی کی سیاسی، سماجی اور مذہبی مدبر کی حیثیت کو مزید مستحکم کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ سیاسی نظامِ حیات کے تعلق سے اقبال کے فکر و نظر اور عملی اقدام سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ یہ ایک اچھے خط کا وصف ہے کہ اچھے خطوط،

ذاتی زندگی، عوامی رابطے، اپنے عہد کی سیاسی و سماجی صورت حال کی تفصیل نہیں بتاتے تو اشارے ضرور کرتے ہیں۔ غالب کے خطوط میں یہ عناصر بخوبی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو

اردو خطوط نگاری میں جب منٹو کا نام لیا جاتا ہے تو بعض لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے۔منٹو جیسا بڑا افسانہ نگار جس نے اپنے عہد اور بعد میں بھی اپنی افسانہ نگاری کا لوہا تسلیم کروایا تھا۔ جب کسی کو خط لکھتا ہے تو اس میں بھی بہت سے نئے پہلو وا ہوتے ہیں۔منٹو کے احمد ندیم قاسمی کے نام بہت سے خطوط ملتے ہیں۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں ہیں یہاں ان کا ایک خط نقل کیا جارہا ہے:

71 اڈلفی چیمبرز، کلیئر روڈ۔ بمبئی 8

(جنوری 1939)

برادر مکرم

وعلیکم السلام۔ آپ کا محبت نامہ ملا۔ شکریہ!... میں آگے کچھ اور لکھنا چاہتا تھا معاً میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ آپ اور میں، یعنی قاسمی اور منٹو، مٹی کے دو ڈھیلے ہیں جو لڑھک لڑھک کر قریب آنا چاہتے ہیں... مٹی کے دو ڈھیلے... ٹھیک ہے... انسان مٹی کا ڈھیلا ہی تو ہے۔

یہ سن کر بہت خوشی حاصل ہوئی کہ آپ کو انعام میں ایک طلائی تمغہ ملا... مجھے تمغے پسند ہیں، مگر ان پر کھدے ہوئے حروف اور شکلیں بالکل ناپسند ہیں، جو گونگی ہوتی ہیں۔ آپ کا خط ڈاکیے نے اس وقت میرے ہاتھ میں دیا، جبکہ میں اپنی اسٹوری MUD کو مکمل کر رہا تھا۔ آپ کی رائے پر میں نے غور کیا، مگر جو کچھ آپ نے لکھا ہے غیر فلمی ہے۔ اس لیے مجھے اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔ بہر حال آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میں نے 'کیچڑ' مکمل کر لیا ہے۔ جو کچھ میں چاہتا تھا اس کا 3/4 حصہ اس میں آچکا ہے۔ بقایا آجائے گا اس لیے کہ میں دن رات اسی کے متعلق غور و فکر کرتا رہتا ہوں۔ MUD میں آپ کو بہت سی نئی چیزیں نظر آئیں گی۔ ''نیا قانون'' کے استاد منگو کی جھلک آپ کو نتھو کے کیریکٹر میں ملے گی۔ پھر میں نے اپنے ہر کیریکٹر کو اس کی برائیوں اور اچھائیوں سمیت پیش کیا ہے۔ اگر یہ اسٹوری فلمائی گئی اور ڈائریکشن اس چیز کو برقرار رکھ سکی جو میرے سینے میں ہے تو میرا خیال ہے کہ آپ میرے MUD میں سارا ہندوستان دیکھ لیں گے۔

'خودکشی' میں بچپن ہے، یہ اس زمانے کی تحریر ہے، جب میں خودکشی کا خیال کیا کرتا تھا۔ آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ افسانے کی عبارت ایک ایسے سینے سے نکلی ہوئی ہے، جو بہت چھوٹا ہے۔

آپ 'اوپیرا' لکھ کر ضرور روانہ فرمائیے۔ یہاں سے آپ کو اس کا حق الخدمت روانہ کر دیا جائے گا۔ رفیق صاحب اسے کمپوز کریں گے۔

آپ کی نظمیں مل گئیں۔ بے حد شکریہ۔ مصوّر میں چھپتی رہیں گی۔ رفیق صاحب سب کی سب لے گئے ہیں۔

خلش صاحب اور نذیر صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔

اگر ہو سکے تو 'ساقی' کے سالنامے میں 'پھاہا' اور 'ادب لطیف' کے سالنامے میں 'ٹیڑھی لکیر' ضرور پڑھیے گا۔

کیا آپ نے مصوّر میں ''نیا سال'' پڑھا؟... کیا رائے ہے؟

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا بھائی

سعادت حسن منٹو

(آپ کا سعادت حسن منٹو (منٹو کے خطوط، مرتب اسلم پرویز، دوسرا ایڈیشن، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2019، ص، 69)

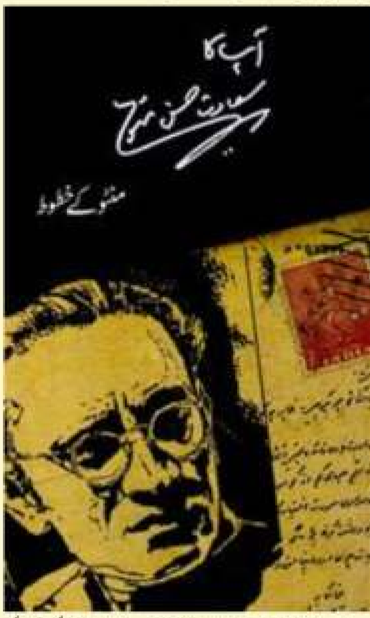

احمد ندیم قاسمی کے نام منٹو کے ہر خط میں کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سامنے آتی ہے۔ اس خط میں بھی منٹو نے انسان کی بے ثباتی کو ثابت کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی Mud (کیچڑ) کے تعلق سے بہت ساری باتیں لکھی ہیں یہ بھی لکھا ہے کہ نیا قانون کے استاد منگو کی جھلک مُڈ کے نتھو کے کردار میں نظر آئے گی اور یہ فلم ہندوستان کا منظر نامہ پیش کرے گی۔ افسانہ خودکشی کے بارے میں بھی احمد ندیم قاسمی سے ذکر کرتے ہیں۔ اس طرح کی باتوں سے منٹو کا یہ خط بھرا پڑا ہے، آپ کو یہاں بھی منٹو دوسروں سے مختلف نظر آئے گا۔ جس میں ساقی اور ادب لطیف کا ذکر ملے گا تو مصور کا بھی۔ ممبئی کے فلمی شب و روز ملیں گے تو افسانوی دنیا بھی نظر آئے گی۔

بیسویں صدی میں مکتوب نگاری کا کوئی ذکر مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوب کے بغیر ادھورا ہی تسلیم کیا جائے گا۔ بیسویں صدی ہی کیا اردو میں مکتوب نگاری کا ارتقاء اور روایت، مولانا آزاد کے خطوط کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ 'غبارِ خاطر' مولانا ابوالکلام آزاد کے ایسے خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے احمد نگر قلعہ میں نظر بندی کے تقریباً تین سال کے دوران اپنے رفیق نواب صدر یار جنگ (حیدرآباد) کے نام تحریر کیے تھے۔ یہ سارے خطوط، اردو میں مکتوب نگاری کے ذیل میں عام ڈگر سے ایک انحراف کی صورت سامنے آئے۔ بظاہر یہ خطوط ایک رفیق خاص کے لیے تحریر ہوئے ہیں لیکن ان خطوط میں ایک عالم، مفکر، دانشور، سیاست داں کی زندگی کے ذاتی اوراق موجود ہیں۔ قید و بند کے معاملات و حالات، ہندوستان کا سیاسی منظر نامہ، تحریک آزادی کی سرگرمیاں، کانگریس کا حال، انگریزوں کی منصوبہ بندی اور مقاماتِ نظر بندی کے تذکرے شامل ہیں۔ یہ سارے خطوط یک طرفہ ہیں اور ایک عالم، ادیب اور دانشور کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ بعض خط خاصے طویل ہیں اور بڑی بڑی کہانیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان خطوط کا سب سے بڑا وصف ان کی زبان اور طرزِ تحریر ہے۔ یہاں میں قلعۂ احمد نگر سے 29/ اگست 1942 کو لکھا گیا ایک خط پیش کرنا چاہوں گا۔ پورا خط تو طویل ہے، ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

قلعہ احمد نگر

29/ اگست 1942

.....لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں، مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوائر ضرور دیکھا ہوگا۔ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے، اسے عام طور پر 'لال ڈگی' کہا کرتے تھے۔ اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت ہیں، اندر جائیے تو اچھی خاصی جگہ ہے اور ایک بینچ بھی بچھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں، اب بھی یہ جھنڈ ہے کہ نہیں۔ میں جب سیر کے لیے نکلتا، تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا۔ والد مرحوم کے خادم خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجھلا جھنجھلا کر کہتے، ''اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی، تو گھر سے نکلا کیوں؟'' یہ

سطریں لکھ رہا ہوں اور اُن کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایڈن گارڈن میں بھی اس طرح کے کئی جھنڈ تھے۔ ایک جھنڈ جو بری پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا اور شاید اب بھی ہو، میں نے چن لیا تھا کیوں کہ اس طرف لوگوں کا گذر بہت کم ہوتا تھا۔ اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا اور شام تک اس کے اندر گم رہتا۔ اب وہ زمانہ یاد آتا ہے تو دل کا عجب حال ہوتا ہے۔

عالم بے خبری، طرفہ بہشتے بوداست

حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم! ابوالکلام

محولہ بالا اقتباس مولانا آزاد کے ایک طویل خط جو تقریباً 11 صفحات (کتابی سائز) پر پھیلا ہوا ہے، کا ہے۔ اس چھوٹے سے اقتباس کے مطالعے کے بعد بھی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ مولانا کا طرزِ تحریر نہ صرف اپنے معاصرین بلکہ اردو مکتوب نگاری کی روایت میں مختلف و منفرد ہے۔ اقتباس کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم کسی افسانے یا ناول کے کسی اقتباس کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ اقتباس کا کمال یہ ہے کہ اس میں مولانا کے بچپن کے یادگار واقعات کا ذکر ہے۔ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مولانا بچپن سے ہی تعلیم کے دیوانگی کی حد تک شوقین تھے۔ ورنہ کھیل کود اور سیر و تفریح کی عمر میں جھنڈ کے اندر کتاب لے کر پڑھائی کرنا، کہاں سمجھ میں آتا ہے۔ آج کل ایسے جھنڈ کا طالب علموں کے ذریعہ جو استعمال ہوتا ہے، وہ بھی ہم پر عیاں ہے۔ آج کی نسل تو پارکوں میں ایسے تنہا گوشوں کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے اور عاشقانہ راز و نیاز بلکہ اس کے آگے کے سفر سے بھی محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ خط میں کلکتہ کے بعض معروف مقامات ڈلہوزی اسکوائر اور ایڈن گارڈن کا ذکر موجود ہے۔ ویسے خط کی زبان میں ایک طرح کی سادگی ہے۔ عموماً یہ تصور کیا جاتا ہے کہ مولانا کی زبان بہت زیادہ فصیح و بلیغ ہوا کرتی ہے۔ جس کے سمجھنے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے، ایسا نہیں ہے۔ خط میں جس طرح کی عام فہم زبان کی بنیاد غالب نے ڈالی اور پھر بعد کے لوگوں نے جس طرح سے اسے عروج بخشا، مولانا آزاد نے اپنے خطوط میں اس کو آگے بڑھایا ہے۔

اردو مکتوب نگاری کا سفر راجہ رام موہن رائے سے غالب، پھر اقبال، منٹو اور ابوالکلام آزاد تک آتے آتے عروج تک آ پہنچا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو مکتوب نگاری کے ارتقاء میں متعدد مکتوب نگار نے اپنے کارہائے نمایاں سے اسے ہر طرح مضبوط و مستحکم کیا ہے۔ لیکن جو کام غالب نے کیا وہ بے مثل ہے۔ آج بھی مکتوب نگاری کے تعلق سے جتنا کام، ترتیب و تدوین، سیمنار وغیرہ کا انعقاد عمل میں آتا ہے اس میں کثرت غالب پر ہونے والے کاموں کی ہی ہے۔

مکتوب نگاری کا زوال

اکیسویں صدی میں انفارمیشن ٹکنالوجی نے جس برق رفتاری سے ترقی کی ہے اور پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں قید کیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ نئی صدی، نئی ٹکنالوجی اور نئے موضوعات نے ہماری زندگی کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ ادب کی صورت تبدیل ہوئی ہے۔ نئے اور انوکھے موضوعات بعض ایسے موضوعات بھی جن کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا، آج ہمارے سامنے ہیں۔ اکیسویں صدی سے قبل سائبر اسپیس، سائبر کرائم، سوشل میڈیا وغیرہ کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ آج بڑے بڑے کارنامے، کرائم اور نت نئی چیزیں سوشل میڈیا اور سائبر میڈیا سے سامنے آ رہی ہیں۔ رابطے کے نہ صرف ذرائع بدل گئے ہیں بلکہ انتظار کے لمحات ختم سے ہو گئے ہیں۔ اب طویل محبت ناموں اور اُن کے جوابات کا انتظار نہیں ہوتا۔ اب چھوٹی بڑی باتیں، انتہائی راز دارانہ طریقے سے ایک دوسرے تک پہنچ جاتی ہیں۔ آج کے زمانے میں ای میل، وہاٹس ایپ، فیس بک وغیرہ کے ذریعہ نہ صرف خط بلکہ تصاویر اور آواز سب سکنڈوں میں ایک دوسرے تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایسے میں جہاں ہم نے بہت ترقی کی ہے وہیں ہماری کچھ خوبصورت عادتوں، روایتوں اور محبت کے طور طریقوں کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ اب خطوط لکھنے کا سلسلہ کم ہوتے ہوتے آفس کے کام کاج تک سمٹ کر رہ گیا۔ شارٹ ہینڈ کا زمانہ تو کب کا جا چکا لیکن اختصار نویسی، مخفف اور ابتدائی حروف، اختتامی حروف، نشانات، اعداد، اشیا کی تصاویر وغیرہ ایسے اشارے کنایے بن گئے ہیں کہ اب لمبی لمبی باتیں، طویل گفتگو، لمبے جملے وغیرہ یہ سب گئے وقتوں کی باتیں ہو گئی ہیں۔ جب آج ہر آدمی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار، اُلٹے سیدھے، قواعد کی درستگی جیسی صفات سے خالی جملے فخریہ استعمال کر رہا ہے۔ ایسے میں جہاں ہماری بہت سی اصناف میں تبدیلیاں آئی ہیں، وہیں کچھ نے بالکل دم توڑ دیا ہے۔ کچھ تغیر و تبدل کے شانوں پر سوار خود کو نئے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ کچھ خاتمے کے قریب ہیں۔ اکیسویں صدی میں تغیر و تبدل اور تکنیک کے طوفان سے خود کو محفوظ نہ کر پانے والی اصناف میں سب سے زیادہ خطرناک عہد سے گزرنے والی صنف مکتوب نگاری ہے۔ بیچارے غالب کو کیا پتہ تھا کہ وہ جس صنف کو ثقیل عبارت، فارسی زدگی، طول طویل القابات سے نکال کر بے تکلفی، برجستگی اور مکالمے کی فضا تک لے آئے ہیں، وہ ایک-ڈیڑھ صدی کے اندر، قریب المرگ ہو جائے گی۔ اب خط لکھنے کی زحمت کون کرتا ہے اور ایسا کرے بھی کیوں؟ خط سے خیریت کا ہی تو تبادلہ ہوتا تھا۔ اب یہ سارے کام

> اکیسویں صدی میں انفارمیشن ٹکنالوجی نے جس برق رفتاری سے ترقی کی ہے اور پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں قید کیا ہے' اس کی مثال نہیں ملتی- نئی صدی' نئی ٹکنالوجی اور نئے موضوعات نے ہماری زندگی کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی متاثر کیا ہے- ادب کی صورت تبدیل ہوئی ہے- نئے اور انوکھے موضوعات بعض ایسے موضوعات بھی جن کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا' آج ہمارے سامنے ہیں-

ای-میل اور فیس بک، وہاٹس ایپ اور دوسرے میڈیا انجام دیتے ہیں۔ ہم سب نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مکتوب نگاری کا پورا انظام ہی مفت (Free) ہو جائے گا۔ لفافے، پوسٹ کارڈ، ان لینڈ لیٹر، ایئر میل، ٹکٹ، تار وغیرہ کی ضرورت ہی ختم ہو جائے گی۔ ایسے میں خطوط کے تعلق سے کوئی بات کرنا کیسا عجیب لگتا ہے۔ غالب، سرسیّد، شبلی، مہدی افادی، اقبال، ابوالکلام کے بعد بھی مکتوب نگاری سجاد ظہیر، منٹو، علی سردار جعفری، قمر رئیس، مجروح رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، رالف رسل، محمد حسن، شارب ردولوی اور عارف نقوی کے یہاں بھی ایک مستحکم روایت کے طور پر نظر آتی ہے۔ بعد میں بیسویں صدی کے اواخر اور کچھ اکیسویں صدی کے اوائل تک خطوط کے باقیات ملتے ہیں۔ لیکن اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اب بہت ضروری کام سے ہی خط تحریر ہوتے ہیں۔ باقی زیادہ تر کام اب موبائل سے ہونے لگے ہیں اور سوشل میڈیا آدھے ادھورے جملوں کے ساتھ پوری تصویر ہمارے سامنے کر دیتا ہے۔ زمانہ تصویر اور آواز کا ہے اور اب تحریر قصۂ پارینہ ہوئی جاتی ہے۔

■

Prof. Aslam Jamshedpuri
Chaudhary Charan Singh University
Ramgarhi
Meerut- 250001 (UP)
Mob.:8279907070

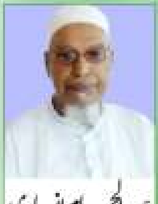

عبدالحی پیام انصاری

امجد نجمی

کی شاعری میں

حب الوطنی

شاعرِ اڑیسہ نجم الشعرا حضرت امجد نجمی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ شہرِ 'کٹک' جو بقول شمس الرحمٰن فاروقی اردو کا ایک جزیرہ ہے موصوف وہیں کے محلہ بخشی بازار کے ایک آسودہ حال خاندان میں 31 اکتوبر 1899 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد یوسف تھا جو اپنے زمانے کے عمائد میں شمار ہوتے تھے۔ بارہ برس بستر علالت پر رہنے کے بعد موصوف کا 1924 میں انتقال ہوا۔

امجد نجمی کا شمار اڑیسہ اور آندھرا کے سب سے پر گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ نجمی اڑیسہ اور حالیہ اندھرا کے پہلے نظم گو شاعر ہیں۔ موصوف نے عملی طور پر جنگِ آزادی میں حصہ لے کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ تحریکِ ترکِ موالات میں حصہ لے کر اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا اور زندگی بھر گاندھی واد کو سینے سے لگائے رکھا۔ وہ اردو اور فارسی میں بھی شعرگوئی پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے فارسی زبان میں بھی حب الوطنی سے سرشار نظمیں لکھ کر انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی اور اہل وطن میں جذبۂ آزادی کو اجاگر کیا۔ ان کی نظموں میں سیاسی شعور سب سے زیادہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ان کے کلام میں روایت پسندی سے لے کر ترقی پسندی اور جدیدیت تک کے تمام رجحانات کا سراغ ملتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اڑیسہ اور آندھرا جیسے غیر اردو علاقوں میں ادبی انجمنوں کی داغ بیل ڈال کر انعقادِ مشاعرہ کا سلسلہ شروع کیا اور شعر و ادب کی محفلیں سجا کر اردو کا چراغ روشن کیا۔ انھوں نے نہ صرف طبع زاد ڈرامے لکھے بلکہ ہدایت کار اور اداکار کی حیثیت سے بھی ان علاقوں میں آغا حشر اور دیگر ڈرامہ نگاروں کے اردو ڈرامے پیش کیے۔ نجمی اڑیسہ کے مقالہ نگاری، تنقید نگاری، بین اللسانی تقابلی مطالعہ، ترجمہ نگاری کے باوا آدم کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں صرف دو شعری مجموعے 'طلوعِ سحر' اور 'جوئے کہکشاں' شائع کرائے۔

امجد نجمی نے جس زمانے میں شاعری شروع کی وہ ہندوستان کی بیداری کا زمانہ تھا۔ ملک میں قومی تحریکیں نشو ونما پا رہی تھیں۔ پھر 1920-21 میں خلافت تحریک کا زور ہوا جسے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں ایک نئے باب کا اضافہ سمجھنا چاہیے۔ یہیں سے نجمی کی شاعری ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ آپ کے یہاں شاعری صرف سطحی جذبات کے اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ حیات و کائنات کے باہمی رشتوں کو پرکھنے کی شعوری کوشش کا نام ہے۔ آپ کے نزدیک شاعری کے فرائض میں سماجی، اخلاقی، اور قومی ذمے داری سے عہد برآ ہونا بھی شامل ہے۔ اسی لیے آپ نے قومی تحریکوں میں عملی حصہ لیا۔ اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے سوراج آشرم میں رہ کر خالص 'گاندھی وادی' بن گئے۔ اور زندگی کے آخری وقت تک مذہبی رواداری، قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے علم بردار رہے۔

گاندھی جی کی رہنمائی میں جب ہندوستان بھر میں جنگِ آزادی کا شعلہ بھڑکنے لگا تو ہندوستان کی تقریباً تمام علاقائی زبانوں کے شاعروں نے حب الوطنی سے سرشار ولولہ خیز نظمیں لکھیں۔ اڑیسہ میں پنڈت گوپ بندھو داس نے ستیہ بادی دبستان کی بنا ڈالی جس کے تحت اس نوعیت کی نظمیں لکھی جانے لگیں جو نوجوانوں کے اندر آزادی کی بابت جذبۂ جوش و ولولہ بیدار کر سکے۔ اسی زمانے میں امجد نجمی نے بھی پنڈت گوپ بندھو داس سے متاثر ہو کر اردو اور فارسی میں نظمیں لکھیں اور انھیں ایک کتابچے کی شکل میں 'نذرِ گاندھی' کے نام سے یکجا کر لیا۔ جب ترکِ موالات اور سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ اور ہڑتالوں کا دور شروع ہوا تو یہ بھی اس ریلے میں بہہ گئے اور جلسوں میں اپنی اور دوسروں کی نظمیں سنانے لگے۔ آخر گرفتار ہوئے اور جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

ڈاکٹر کرامت علی کرامت نے 20 سالہ انتھک کوششوں کے بعد کلیات امجد نجمی کی تالیف کی ہے جسے اُڈیشا اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 2017 میں اور دوسرا ایڈیشن 2018 میں شائع ہوا۔ اس کلیات میں موصوف کے تمام شعری سرمایے کے ساتھ جذبۂ آزادی سے سرشار اور حب الوطنی سے معمور نظمیں شامل ہیں۔

اہل وطن کو آزادی کی اہمیت سمجھاتے ہوئے اپنی نظم 'آزادی' (1920) میں فرماتے ہیں۔

شورِ آزادی سے ہے لبریز سازِ کائنات
دے رہا ہے جس کا ہر اک نغمہ پیغامِ حیات
ہے غلامی ظلمتِ شب اور آزادی سحر
تیرگی افزا وہ اور یہ روشنی سے خوب تر

نظم 'اٹھ' میں اہل وطن کو پیغامِ بیداری دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اٹھ کہ خورشید آسماں پر جلوہ افشاں ہوگیا
اٹھ کہ گویا تیری بیداری کا ساماں ہوگیا
اٹھ کہ تیرے ہاتھ میں ایقان کی شمشیر ہے
تو اگر چاہے تو یہ دنیا ترا نخچیر ہے

سرزمین ہند کی خوبیوں کو دیکھیے کتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

جہاں کی زمیں رشکِ خلدِ بریں
جہاں ماہ و پرویں کی خم ہے جبیں
جہاں کے جبل ہم سرِ کوہِ طور
جہاں کے بیاباں خیابانِ طور
جہاں کی ہر ایک رود ہے رودِ نیل
جہاں کی ہر اک نہر ہے سلسبیل
جہاں کا ہے پانی شرابِ طہور
جہاں کی فضا گویا آغوشِ حور
جہاں عام ہے علم و تہذیب و فن
جہاں کے لیے وقف ہے جان و تن
وہ کیا ہے وطن ہے وطن ہے وطن

(نظم وطن)

گاندھی جی کی پہلی برسی پر کہتے ہیں۔

روح کب نکلی جسمِ لاغر سے
قطرہ جا کر ملا سمندر سے

تو نے گویا اسے اماں بخشی
مار کر عمرِ جاوداں بخشی
موت کیا یعنی انتقالِ مکاں
غیر ممنونِ روز گار زماں
خون اس کا نہ رائگاں ہوگا
ہاں مگر زیبِ داستاں ہوگا

ہندوستان کی تقسیم کی وجہ سے نجمی کو گاندھی جی کی طرح بے حد قلق ہوا۔ پھر بھی انھوں نے لکھا۔

ہونے والی بات جو تھی آخرش ہو کر رہی
ہند کی تقسیم کا ہر وقت تو چرچا نہ کر
رہنما ہی جب کہ بٹوارے پہ راضی ہو گئے
خواہ مخواہ اس مسئلے پر ان سے تو الجھا نہ کر
ان کے جذبے پاک تھے اوران کی نیت صاف تھی
گردشِ افلاک کا کر ان کا تو شکوہ نہ کر

موصوف کی وطن دوستی، جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کا اندازہ ان کے چند اشعار سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ جن میں شاعر نے ہندوستانی مسلمانوں کو چند اہم اور مفید مشوروں سے نوازا ہے۔

اے مسلمِ ہندوستاں اپنے وطن کا ساتھ دے
تو جس چمن کا ہے صفیر آ اس چمن کا ساتھ دے
حق کے لیے پھر کر بپا ہنگامۂ منصور کو
حبِّ وطن میں ڈوب کر دار و رسن کا ساتھ دے
کوہِ ہمالہ سے یہی رہ رہ کے آتی ہے صدا
تو موجِ مضطر کی طرح گنگ و جمن کا ساتھ دے
پھر رشتۂ زنار میں تسبیح کے دانے پرو
اے شیخ عزلت سے نکل اور برہمن کا ساتھ دے

کلیاتِ نجمی میں یومِ آزادی کی تقریب کے سلسلے کی آٹھ نظمیں شامل ہیں۔ جنگِ آزادی کے سلسلے میں ہمارے اہلِ وطن نے جو سنہرے خواب بنے تھے حصولِ آزادی کے بعد سب چکنا چور ہو گئے اور فیض جیسے شاعر کو 'یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر' کہنا پڑا۔ امجد نجمی اپنی نظم آزادی کا دوسرا سال (1949) میں اس وقت کے سماجی حالات کی عکاسی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

تم بھی اب آزاد ہو اور ہم بھی اب آزاد ہیں
لیکن آزادی کے ہاتھوں کس قدر برباد ہیں
قحط سالی دیکھیے رشوت ستانی دیکھیے
دیکھیے اجناس و اشیا کی گرانی دیکھیے
چور بازاری کا اتنا ہو گیا بازار گرم
جس کے آگے حکمراں بھی پڑ گئے اک بار نرم

اس سلسلے کی آخری نظم 'آزادی کا چھبیسواں سال' ہے جو 15 اگست 1973 کو کہی گئی تھی۔ آخری نظم اس لیے کہ یکم فروری 1974 کو موصوف کا انتقال ہوگیا۔ اس نظم میں وقت سے ہر طرح کا شکوہ شکایت کے باوجود شاعر مستقبل میں امید کا دامن نہیں چھوڑتا۔ مذکورہ نظم کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

ہو مبارک تمھیں آزادی کے چھبیس برس
آج کی صبح ہے اک صبحِ درخشاں یارو
دل کے جو داغ ہیں رہ رہ کے مہک اٹھتے ہیں
ہے یہی اپنے لیے جشنِ چراغاں یارو
ہائے اس جوشِ بہاراں میں تہی دامانی
خون کیوں روئے نہ یہ دیدۂ گریاں یارو
شبِ مہتاب کا کچھ لطف نہ آنے پایا
چھپ گیا جا کے گہن میں مہِ تاباں یارو
دیکھیں پھر ہوتی ہے کب مزرعِ امید ہری
دیکھیں پھر برسے گا کب ابرِ بہاراں یارو
جتنے شکوے کیے نجمی نے وہ سب سچ ہیں مگر
پھر بھی آزادی پہ ہم آج ہیں نازاں یارو

امجد نجمی کو اپنے وطن عزیز سے کس قدر محبت تھی اس کا اندازہ اس شعر سے ہوسکتا ہے۔

کوپر (Cowper) نے انگلینڈ کو کہا تھا:

"With all thy a fault I Love thee still."

میں ہندی ہوں بے چین نہ ہو کیوں ہند کی خاطر میرا دل

خصوصاً موصوف کو اپنی جائے پیدائش اڑیہ کے ذرے ذرے سے محبت تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے 'قلعہ کٹک'، 'مہاندی'، 'اپنی کٹک' ہیرا کود، صبح جو برا، شام تلسی پور، چلکا جیسی دلکش نظمیں لکھیں۔ نظم 'قلعہ کٹک' کا نقشہ کس قدر موثر اور دل نشیں انداز میں کھینچا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

یہ مہاندی کا نظارہ یہ تیرے خد و خال
جیسے جمنا کے کنارے تاج کا حسن و جمال
یہ حصارِ آب، یہ خندق کا ہالہ چار و سو
اس میں درگہ کی جھلک جیسے چراغِ آرزو

رادھا رائے کی مشہور نظم 'چلکا' سے متاثر ہوکر نجمی نے اردو میں ایک نظم 'چلکا' لکھی ہے جسے حرمت الاکرام اور مظہر امام جیسی عبقری شخصیتوں نے ادب عالیہ کا درجہ عطا کیا ہے۔ امجد نجمی نے 'کلنگا ہمارا' نامی ایک ترانہ لکھا ہے جسے یہاں اردو کی تقریبات میں اسی طرح پڑھا جاتا ہے۔ جس طرح اڑیہ کی تقریبات کے آغاز میں 'بندے اتکل جننی' گایا جاتا ہے۔ اس کا پہلا بند یہ ہے۔

جگر ٹکڑے ٹکڑے تو دل پارہ پارہ
محبت میں جس کی ہے سب کچھ گوارا
ہماری امیدوں کا جو ہے سہارا
جو سنسار میں ہم کو ہے سب سے پیارا
وہ اُتکل اُڑیسا کلنگا ہمارا

موصوف نے اڑیہ کے تہواروں پر بھی بہت سی دلکش نظمیں لکھی ہیں جن میں 'دسہرے میں' اور 'بوایت بندان' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امجد نجمی نے ہندوستان کی عبقری شخصیتوں کی یاد میں متعدد کامیاب اور موثر نظمیں کہی ہیں، جن میں ٹیپو سلطان کی تلوار، آغا حشر، ٹیگور چل بسا، آہ گاندھی، آہ قائد اعظم، ڈوب گیا (مولانا ابوالکلام آزاد کی رحلت پر)، گرو نانک جی کی یوم پیدائش، گاندھی شتابدی (گاندھی جی کی صد سالہ یوم پیدائش) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے جہاں اپنی نظموں میں ایک طرف مسلم تمیحات کا استعمال کیا ہے وہیں دوسری طرف ہندو اساطیر و تلمیحات کو بھی اپنے فن کی گرفت میں لے لیا ہے مثلاً۔

(1)

اللہ ہو کا نعرہ ہو یا ہری ہری کی تان
دل ہی تیرا پاک نہیں تو کیا سمرن کیا دھیان
زمزم میں تو غسل کرے یا گنگا میں اشنان
لا حاصل سب سجدے تیرے پوجا سب بیکار
مایا یہ سنسار رے بابا، مایا یہ سنسار
(مایا یہ سنسار)

(2)

گوپیوں سے کہو گھر سے نکلیں نہ وہ
ہر اک آواز پر اتنا ریجھیں نہ وہ
اب نہ وہ کنج بن کا سماں ہی رہا
اب نہ وہ کشن کی بانسری ہی رہی

(3)

جو یہ بادلوں کو بھی دیتا ہے چیر
یہ ارجن کا رتھ ہے کہ رستم کا تیر
(نظم: میری پرواز)

امجد نجمی کی حب الوطنی کا جذبہ نظم 'آزاد ہندوستان' کے ذیل کے بند سے بہتر انداز میں اور کس طرح ظاہر ہوسکتا تھا؟

رہ آزادی ملک و وطن ہموار ہو جائے
وطن کے راستے سے دور ہر اک خار ہو جائے
وطن اپنا پنپ کر غیرتِ گلزار ہو جائے
وطن کا گوشہ گوشہ مطلعِ انوار ہو جائے
ہمارے ملک کی کشتی بھنور سے پار ہو جائے

■

Abdul Hai Payam Ansari
Village & Post: Piproli Bazar, Khajni
Distt.: Gorakhpur - 273212 (UP)
Mob.:9453814135

سائنس اور ادب کے امتیازات

معید الرحمن

> سائنس کے مطابق علم اسے کہتے ہیں جسے تجربہ گاہ میں ثابت کیا جاسکے۔ جس چیز کو ثابت نہ کیا جاسکے وہ احاطہ علم سے خارج ہے۔ جہاں تک ادب کا معاملہ ہے تو ادب کا مرکزی موضوع انسان ہے۔ انسان کے جذبات، اس کے داخلی، خارجی کوائف، اس سے متعلق مظاہر جیسے سماج، معاشرہ، سیاست، مذہب۔ ان اداروں کی رسومیات اور ان کے تقاضوں کی تعمیل یا انحراف کے سبب جو پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں ادب ان سب کو اپنی گرفت میں لینے کی سعی کرتا ہے۔ ادب کا طریقۂ کار سائنس کے برعکس وجدانی ہوتا ہے۔

ایک ایسے دور میں جب کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے تمام مظاہر حیات کے ساتھ ساتھ انسان کے داخلی شعور پر بھی غلبہ حاصل کرلیا ہے، ادب کے وجود اور اس کی اہمیت پر غور وخوض کرنا وقت کا تقاضا بن گیا ہے۔ کریلا اور نیم چڑھا صارفیت نے بھی ادب کے وجود کے تئیں شکوک پیدا کردیے ہیں۔ صارفی حربوں نے لوگوں کو یہ باور کرانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے کہ وہی مضمون معیاری ہے جو مادی منفعت کا حامل ہو۔ نتیجے میں شعروادب سے خطرناک حد تک بے توجہی کا منظرنامہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

سائنسی غلبے کے سبب ادب کے طرز وجود پر یہ سوالیہ نشان قائم ہونے لگا ہے کہ شعروادب کا کام محض وادیٔ تخیل میں ٹامک ٹوئیاں مارنا ہے۔ ارضی حقائق سے فرار اس کا وطیرہ ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق سے گھبرا کر حسن وعشق کے سائے میں پناہ لینا ہے۔

ان نکتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسائل سائنس اور ادب کے طرزعمل اور طرزفکر سے ناواقفیت کا نوزائیدہ ہے۔ اسی فکر کا شاخسانہ یہ بھی ہے کہ حقیقت تک رسائی کے لیے شعروادب کی بہ نسبت سائنس موثر طریقہ ہے۔

اس موضوع کی تہہ میں اترنے کے لیے ان سوالات پرغور کرنا لازمی ہے کہ سائنس کا موضوع کیا ہے، سائنس کا طریقۂ کار کیا ہے، سائنس میں کس طرح نتائج کا استخراج کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ادب کے موضوع، مزاج اور طریقۂ کار کے تجزیے سے مسائل کی تفہیم ممکن ہے۔

یہ امر بدیہی ہے کہ سائنس کا موضوع اشیا ہے۔ اس کی ساخت، خصوصیات اور دیگر عناصر کی شمولیت کے سبب اس میں رونما ہونے والی تبدیلیاں سائنس کے دائرۂ کار میں آتی ہیں۔ اس میں مفروضے کو بنیاد بنا کر تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعے کوئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ سائنس کے مطابق علم اسے کہتے ہیں جسے تجربہ گاہ میں ثابت کیا جاسکے۔ جس چیز کو ثابت نہ کیا جاسکے وہ احاطہ علم سے خارج ہے۔ جہاں تک ادب کا معاملہ ہے تو ادب کا مرکزی موضوع انسان ہے۔ انسان کے جذبات، اس کے داخلی، خارجی کوائف، اس سے متعلق مظاہر جیسے سماج، معاشرہ، سیاست، مذہب۔ ان اداروں کی رسومیات اور ان کے تقاضوں کی تعمیل یا انحراف کے سبب جو پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں ادب ان سب کو اپنی گرفت میں لینے کی سعی کرتا ہے۔ ادب کا طریقۂ کار سائنس کے برعکس وجدانی ہوتا ہے۔ غالب کا ایک شعر دیکھیے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

غالب کا یہ شعر ادب کے وجدانی طرز ادراک کی بہترین وضاحت کرتا ہے۔ شعروادب دیدۂ بینا سے کام لیتا ہے۔ قطرہ میں دجلہ دیکھ لینا اور جزو میں کل کا مشاہدہ کرلینا ادبی طرز تفہیم ہے۔

علم حاصل کرنے کے دو ذرائع ہیں، ایک مشاہدہ دوسرا وجدان۔ سائنس کی بنیاد مشاہدہ اور تجربہ پر ہے اور ادب کا ذریعہ ادراک وجدان ہے۔ یہ بات محتاج دلیل نہیں کہ ہر علم صداقت اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کا مدعی ہوتا ہے۔ امرواقعہ یہ ہے کہ صرف سائنس کے علمیاتی حربوں سے حقیقت کا حصول ممکن ہے نہ ہی وجدانی طرز سے، بلکہ ادراک حقیقت وصداقت کے لیے وجدان اور تجربہ دونوں وسائل کا متناسب امتزاج لازمی ہے۔ اسی سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ سائنسی مطالعات کے نتیجے میں جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کیسا ہوتا ہے اور ادبی مطالعات سے اخذ شدہ علم کی نوعیت اور فطرت کیسی ہوتی ہے۔ محمد ہادی حسین نے سولہویں صدی کے مصنف ڈوگلس بش کی کتاب سائنس اور انگریزی شاعری کی تلخیص پیش کی ہے۔ ان کا درج ذیل اقتباس اس ضمن میں معاون ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

شاعر کو فطرت سے جو خاص ملکہ ودیعت ہوتا ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس نے

اپنے آپ کو انسانی تجربہ کے متعلق ایک زاویہ نگاہ وضع کرنے اور پھر اس زاویہ نگاہ کا اظہار کرنے کے لیے وقف کردیا ہو۔ یہ ایک عمومی اور سیدھی سادی سی تعریف ہے، لیکن اس میں بھی یہ پہلو نکلتا ہے کہ شاعر زندگی اور انسان کی قدر و قیمت کا کسی نہ کسی حد تک معتقد ہوتا ہے۔ شاعر کو جو بصیرت نصیب ہوتی ہے اس کا سرچشمہ صرف اس کا تخیلی وجدان نہیں ہوتا بلکہ اس کا ذاتی تجربہ بھی اور وہ علم بھی جو اس کو اپنے تجربے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات ملاحظہ طلب ہے کہ موجودہ زمانے میں علم بیش از بیش سائنس کی صورت اختیار کرتا چلا جاتا رہا ہے، لیکن سائنس جس کا کام فطرت کے متعلق تحقیق پذیر صداقتوں اور فطرت پر غلبہ پانے کے وسائل کا دریافت کرنا ہے، زندگی اور انسان کی قدر و قیمت اور وقار سے کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ ارباب سائنس انسانوں کی حیثیت سے ان چیزوں کا شعور رکھتے ہوں تو یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ انسان کو بہ زعم خود ایک ربانی نظام میں جو مرکزی حیثیت حاصل تھی سائنس نے اسے اس حیثیت سے معزول کردیا ہے۔'' (بحوالہ مغربی شعریات، ص 70-269)

ہربرٹ ریڈ نے انجانی چیزوں کی ہیئت کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ محمد ہادی حسین نے اس کی تلخیص پیش کی ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ادب سے حاصل ہونے والے علم کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

''حقیقت کا جو علم فنون لطیفہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے وہ آپ اپنی قسم کا علم ہوتا ہے اور حقیقت کے اس علم کا ہم رتبہ نہیں ہوتا جو سائنس یا فلسفیانہ تفکر سے حاصل ہوتا ہے۔''
(بحوالہ مغربی شعریات، ص 256)

غالب کا ایک شعر دیکھیے:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

شعر میں کاروبار دنیا کی بے بضاعتی کا بیان ہے۔ شعر کا متکلم کہتا ہے کہ اس دنیا میں جتنے واقعات رونما ہوتے ہیں ان کی اہمیت بچوں کے کھیل سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ نتیجہ مشاہدے کی بنیاد پر اخذ کیا گیا ہے۔ یہ عمل سائنسی طریقۂ کار سے مماثل ہے، لیکن شاعر نے اس نتیجے تک رسائی کے عمل میں اپنے موقف پر اصرار کیا۔ شاعر نے ایک عام تجربے یا واقعے کو اپنے انفرادی نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کیا۔ سائنس دنیا کے ختم ہونے پر یقین رکھتی ہے، لیکن اس کے بارے میں اقداری فیصلے کے اظہار سے گریز کرتی ہے۔ اس کا موقف بھی انفرادی نہیں ہوتا ہے، بلکہ ایسے تعمیمی نتیجے پر منی ہوتا ہے جو سب کے لیے از روئے عقل قابل قبول ہو۔

سائنس اپنے نتائج کے ضمن میں حتمیت اور قطعیت کی مدعی ہوتی ہے۔ ادب حتمیت اور قطعیت کے برعکس امکان کی بات کرتا ہے۔ غالب کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

یہ شعر انسانی فکر اور انسانی حوصلے کی وسعت پر مشتمل ہے۔ زیر نظر شعر میں اس دنیا کے تمام ایجادات، تمام ترقیات اور نت نئے انقلابات کو انسانی تمنا کا محض ایک قدم قرار دیا گیا ہے۔ اس میں ایک ایسے انسان کا ذکر ہے جس کی تمنا کا وفور محدود نہیں ہے، جو اس کائنات کی امکانی ترقیوں کو بھی اپنے ایک نقش پا کے برابر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور خدا سے نہایت دلیری سے کہتا ہے کہ اے میرے خدا! اپنی تمنا کا دوسرا قدم کہاں رکھوں۔ شعر کا پہلا مصرعہ متعدد معنوی جہات کا حامل ہے۔ یہ کائنات جو ثری سے ثریا تک کو محیط ہے، اس کے علاوہ کوئی اور دنیا ہو تو بتایئے تاکہ میں وہاں اپنی فتح کا علم بلند کروں یا یہ کہ اے میرے خدا! ہماری خواہشات کے پیش نظر یہ دنیا محدود ہے، ہماری جولاں گاہی کے لیے یہ عرصہ کائنات تنگ ہے۔

ادب اور سائنس دونوں کا مقصد زندگی کی سچائیوں کی تلاش ہے، زندگی کی تفہیم ہے، لیکن دونوں کے طریقۂ کار اور طرز ادراک مختلف ہیں۔

کسی کمپنی کا ایک ملازم جس کی تنخواہ مختصر اور خاندان بڑا ہے۔ اقتصادی زبوں حالی کے سبب اس شخص نے خودکشی کرلی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ وجہ سامنے آئی کہ اس کی موت زہر کھانے سے ہوئی۔ اگر غور کیا جائے تو اس کی موت کی اصل وجہ وہ غربت ہے جس نے اسے اپنی زندگی کو خود ختم کرنے کے لیے مجبور کیا۔ اب اگر ڈاکٹر غربت کو اس کی موت کا سبب قرار دے تو یہ غیر سائنسی عمل ہوگا۔ اور اگر ادیب اس کی ہلاکت کی وجہ زہر خوری کو قرار دے تو یہ غیر حقیقی رویہ ہوگا۔ خودکشی کی اصل وجہ صرف زہر یا صرف معاشی تنگ دستی کو قرار دیا جائے تو درست نتیجے تک رسائی کے لیے صرف ایک ہی پہلو کو مدنظر رکھنے کا عمل تصور کیا جائے گا۔

شعر و ادب کی تشکیل و تعبیر میں وجدان کے علاوہ ذاتی تجربہ، مشاہدہ اور دیگر علوم سے واقفیت کا اہم رول ہوتا ہے۔ ان سب کو جذبہ اساس فراہم کرتا ہے جب کہ سائنس جذبات کی نفی کرتی ہے۔ جذبات کا سرچشمہ دل ہے۔ تمام جذبات میں عشق و محبت کو سب سے اعلیٰ و ارفع تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسے کائنات کے وجود میں آنے کا محرک اور راز حیات تسلیم کیا جاتا ہے۔ عالمی ادب کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں عشق و محبت اور دل کے موضوع پر بکثرت اشعار ملتے ہیں۔

اس ضمن میں میر کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

لوگ بہت پوچھا کرتے ہیں کیا کہیے میاں کیا ہے عشق
کچھ کہتے ہیں سر الٰہی کچھ کہتے ہیں خدا ہے عشق

میر کو کائنات کے ہر ذرّے میں عشق ہی عشق نظر آتا ہے۔

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق ہے طرز و طور عشق کے تئیں
کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق
عشق معشوق عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

اسی طرح دل کے موضوع پر بکثرت اشعار موجود ہیں۔

ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

قائم چاندپوری

ہر دھڑکتے پتھر کو لوگ دل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں

بشیر بدر

سائنس کی وکالت کرنے والے احباب کو ادب کی اظہاری تدابیر بھی برگشتہ کرتی ہیں۔ ادب میں عام طور پر اظہاری وسائل کے لیے تشبیہ، استعارہ کنایہ اور مبالغہ جیسی صنعتوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان سب اظہاری تدابیر کی بنیاد تخیل پر ہے۔ فن کار دو اشیا کے مابین نقطہ اشتراک و اختلاف کی تلاش کے ذریعے اپنا تخلیقی و فنی نظام مرتب کرتا ہے۔ ادبی و فنی جمالیات کی اساس بھی انھی جدلیاتی الفاظ پر استوار ہوتی ہے۔

بودلیر شاعری کی اس خصوصیت کو عالمگیر مماثلت (Universal analogy) سے تعبیر کرتا ہے۔ بودلیر کے خیالات کو محمد ہادی حسین ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

''شاعری کا منبع وہ عالمگیر مماثلت (Universal analogy) ہے جو فلکی و ارضی، حقیقی و مجازی، باطن و ظاہر کو مربوط کرتی ہے۔ شاعر علامات کے ذریعے ان کے ربط باہمی کو بے نقاب کرتا ہے۔'' (مغربی شعریات، ص 387)

عالمگیر مماثلت کو سمجھنے کے لیے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ اردو شاعری میں حسن محبوب کو چاند کے حوالے سے بیان کرنے کا رویہ عام ہے۔ میر کا مشہور شعر دیکھیے:

پھول گل شمس و قمر سارے ہی تھے
پر ہمیں ان میں تمھیں بھائے بہت

ایک معروف جدید شاعر فرحت احساس کا شعر اس ضمن میں دیکھیے۔

چاند بھی حیران دریا بھی پریشانی میں ہے
عکس کس کا ہے کہ اتنی روشنی پانی میں ہے

مذکورہ اشعار میں حسن محبوب کا اظہار چاند کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ چاند اور محبوب میں مشترک اوصاف کیا ہیں۔ دیکھیے چاند سے کیا کیا تصورات ہمارے معاشرے سے وابستہ ہیں۔ چاند سے چمک کا تصور وابستہ ہے، ٹھنڈک کا تصور وابستہ ہے۔ رخ محبوب کو بھی درخشاں و تاباں کہا جاتا ہے۔ محبوب کو دیکھنے سے قلب کو راحت ملنے کا تصور رائج ہے۔ چاند میں قوت کشش ہوتی ہے، اس لیے سمندر میں سب سے زیادہ مدوجزر چودھویں رات میں ہوتا ہے۔ رخ محبوب میں بھی کشش ہوتی ہے۔ عاشق بے اختیار ہو جاتا ہے۔ چاند سے متعلق ایک نظریہ اور ہے وہ ہے پاگل پن کا۔ انگریزی میں چاند کو Lunar کہتے ہیں۔

> ”ارباب سائنس ادبی متن کے متعدد معنوی ابعاد کے حامل ہونے کے سبب اسے حقیقت سے بعید بیان قرار دیتے ہیں۔ ادبی اظہار کا وہ حربہ جسے حاملین سائنس قدرے زیادہ مشکوک سمجھتے ہیں، وہ مبالغہ ہے۔ کسی صفت کی زیادتی کو مبالغہ کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی شاعرانہ تدبیر ہے جسے ادب میں بھی بعض مکاتب فکر نے مبنی بر دروغ خیال کیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مبالغہ حقیقت کے اظہار کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے“

Lunar eclipse، Solar eclipse جیسے الفاظ انگریزی لغات میں درج ہیں۔ انگریزی لغات میں پاگل کے لیے Lunatic کا لفظ بھی مذکور ہے۔ محبوب کے لیے پاگل ہو جانے کا مضمون اردو شاعری میں اس قدر عام ہے کہ وہ محتاج دلیل نہیں۔

اب دیکھیے چاند اور محبوب کے درمیان کتنی مماثلتیں ہیں جو عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔

ارباب سائنس ادبی متن کے متعدد معنوی ابعاد کے حامل ہونے کے سبب اسے حقیقت سے بعید بیان قرار دیتے ہیں۔ ادبی اظہار کا وہ حربہ جسے حاملین سائنس قدرے زیادہ مشکوک سمجھتے ہیں، وہ مبالغہ ہے۔ کسی صفت کی زیادتی کو مبالغہ کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی شاعرانہ تدبیر ہے جسے ادب میں بھی بعض مکاتب فکر نے مبنی بر دروغ خیال کیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مبالغہ حقیقت کے اظہار کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ غالب کا ایک شعر دیکھیے۔

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اس شعر میں وحشت کے محض اندیشے کی وجہ سے صحرا کے جل جانے کا بیان ہے۔ وحشت کے اندیشے کی گرمی اتنی شدید ہے کہ اس سے صحرا کے جل جانے کا مضمون نظم کیا گیا ہے۔ مقصود وحشت کی زیادتی کو دکھانا ہے۔ شاعر نے یہ اسلوب اس لیے اختیار کیا کہ وحشت کی شدت کو قاری بھی محسوس کر سکے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے خیال اور جذبے جیسی لطیف اور مجرد شے کی بیکرانی کو ایک حسی تجربے میں منقلب کر دیا۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سائنس ابھی تک جذبات کی پیمائش کے لیے کوئی پیمانہ ایجاد کرنے سے قاصر ہے۔

سائنس کی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سائنسی تسلط کے سبب انسانی تخیل کی پرواز محدود ہوتی جا رہی ہے۔ تعقل پسندی اور علت و معلول پر مبنی طرز فکر کی بنا پر انسان کا وجدان سے رشتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ نتیجے کے طور پر شعرا و ادبا عظمت کی اس منزل پر فائز ہونے میں ناکام ہو رہے ہیں، جو ہمارے قدما کا امتیاز تھا۔

منطقی طرز فکر سے اپنے شعر و ادب کو پرکھنے کے سبب داستان جیسی اہم صنف کو بھی ہم شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اردو شعر و ادب میں داستان ہی وہ صنف ہے جو ہمارے تخیل کی لامحدودیت اور اس کی فعالیت پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔ اپنے ثقافتی سرمایے سے واقفیت اور لسانی ذخیرے میں اضافہ کرنے کے علاوہ یہ صنف ہمارے تخیل کو بھی جلا بخشتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب فن داستان گوئی میں کیا پتے کی بات کہی ہے:

”اگر ہم کولرج کے الفاظ پر عمل کریں تو داستانوں سے کافی لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی بے اعتقادی کو بہ رضا و رغبت معرض التوا میں ڈال دیں۔ اگر ہم تخیل کی اس موہوم پیداوار کا عارضی طور پر اعتبار کر لیں تو ہمارے لیے ایک دلچسپ دنیا کا دروازہ کھل جائے گا اور اس دنیا کی سیر محض تضییع اوقات نہ ہوگی، بلکہ ہمارے تخیل ہمارے دماغ ہماری روح کو تازگی اور فرحت بخشے گی۔“

(فن داستان گوئی، ص 32)

انسانی زندگی کو پرکشش بنانے میں جمالیات کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔ تناسب و توازن کے علاوہ انسان کی انفرادیت بھی خوشگوار زندگی کا لازمہ ہے۔ سائنس کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ماورائے مادہ مظاہر کو گرفت میں لینے سے قاصر ہے۔ سائنس انسان کی انفرادیت کو معرض بحث میں لانے سے عاجز ہے۔ ادب ہی وہ شے ہے جو جمالیات کو جوہر حیات قرار دیتی ہے۔ وجود کے امتیازات کو ادب ہی قابل احترام اور مرکز اظہار گردانتا ہے۔

شمیم حنفی نے انسان کو سائنس کی جانب سے لاحق خطروں اور اس کے مضمرات کا ذکر کرتے ہوئے، جن نکات کی نشان دہی کی ہے وہ اندیشے ادب کے سلسلے میں بھی صادق آتے ہیں۔

”مختصر یہ کہ انسان کو سائنس کی طرف سے جو اندیشے لاحق ہیں ان میں دو کی حیثیت مرکزی ہے۔ ایک تو صنعتی معاشرے میں انفرادیت کے زوال کا خوف یعنی فرد کی حیثیت سے انسان کی بے توقیری۔ دوسرے جدید اسلحوں سے اجتماعی موت کا خوف۔ روح پر بھی یلغار ہے اور جسم پر بھی۔ انفرادی اظہار کے راستے اس لیے محدود ہیں کہ معاشرہ اجتماعی مقاصد کا غلام ہے۔ ٹکنالوجی اقتصادی فلاح کی جویا ہوتی ہے، چنانچہ اجتماعی جدوجہد کی طالب۔ نتیجتاً انسان کو معاشرے سے ناآسودگی کی صورت میں بھی اپنے جذباتی فیصلوں اور انفرادی رویوں پر اجتماعی فیصلوں اور ضرورتوں کو ترجیح دینا پڑتی ہے۔ اس ذہنی فضا میں تہذیب کے اسی تصور کو قبولیت مل سکتی ہے، جس کی بنیادیں مادی ہوں۔ مورخوں کی اکثریت نے اسی لیے انسانی فلاح و نجات کا راستہ صرف مادی ترقی میں ڈھونڈا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عہد جدید کے ذہنی اور نفسیاتی مسائل کا حل مزید صنعتی ترقی اور مادی سہولتوں میں فروغ پر منحصر ہے یا کسی اور وسیلے سے کام لینا ہوگا۔“

(جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، ص 204)

شمیم حنفی نے عہد جدید کے انسانوں کو درپیش مسائل کے حل کے لیے جس تریاق کی جانب اشارہ کیا ہے وہ ادب ہی ہے۔ ادب انسان کو سائنسی طریقۂ کار سے استفادے کے ساتھ ساتھ وجدان سے اپنا رشتہ استوار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ کائنات کے بظاہر غیر مربوط عناصر میں داخلی ہم آہنگی کی تلاش سے ایک نظام نو کی دریافت و تشکیل کرتا ہے۔ ادب زمان و مکان میں محصور واقعات کو فنا ہونے سے بچا کر زندہ جاوید بنا دیتا ہے۔ صنعتی ترقی کی یبوست سے محفوظ رکھ کر جمالیاتی ارتفاع عطا کرتا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر اکیسویں صدی میں ادب کا مطالعہ کرنا وقت کا اہم تقاضا بن گیا ہے۔

■

Dr. Moidur Rahman
Asst. Professor, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001
Mob.:8126410482

عمران عراقی

ساحر لدھیانوی
ایک مقبول اور حقیقت پسند شاعر

ہمارے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں خاص طور پر ان ادب پاروں کا یا ان ادیب وشاعروں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے جو اپنے عہد ہی میں نہیں بلکہ بعد میں بھی بے حد مقبول ہوتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بعض ادب پارے یا ادیب وشاعر اتنے مقبول کیوں ہوتے ہیں؟ جبکہ اسی زمانے میں انھیں موضوعات کو مختلف انداز سے برتنے والے بھی کم نہیں ہوتے۔ لیکن مقبولیت ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی۔ ظاہر ہے اس سوال کے جواب میں فن پاروں یا ادیب وشاعروں کو مختلف زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ بلکہ ان کی ذاتی زندگی کی پرتوں کو بھی ان کی مقبولیت کے آئینے میں ادھیڑنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی غور کرنے والی بات ہے کہ بعض دفعہ کسی ادیب وشاعر کا ایک ہی فن پارہ، یا نظم یا شعر انھیں مقبول نہیں تو کم از کم اس قابل ضرور بنا دیتا ہے کہ وہ یاد رکھے جائیں۔ سوال پھر وہی آن پڑتا ہے کہ آخر اس شعر یا نظم میں ایسی کون سی بات ہے جس نے اپنے لکھنے والے کو لازوال کر دیا؟ ایسی ہی ایک مثال راجہ رام نرائن کی ہے، جنھیں اردو ادب میں محض اس ایک شعر کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو، ویرانے پہ کیا گزری

الفاظ کے دروبست کو سلیقے سے برتنا، شدت جذبات پر غالب آنا اور خاص طور پر ہنگامی صورت حال کو لطیف احساسات کے ساتھ جمالیاتی انبساط عطا کرنا، کسی شعر کو لازوال کرتا ہے۔ گویا یوں کہا جائے کہ شاعر وادیب اپنے احساسات وجذبات یا تجربات ومشاہدات کے ردعمل اور عصری حسیت میں جب تک جمالیاتی انبساط کی تشکیل نہیں کرتے، وہ ادب پارہ وقتی طور پر مقبول تو ہو سکتا ہے لیکن اپنی قبولیت کو تادیر قائم رکھنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ ساحر لدھیانوی (6 مارچ 1921-25 اکتوبر 1980) کے شعری سرمایے کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں یہ تمام پہلو بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یوں تو ساحر فطرتاً نازک مزاج اور حساس طبیعت کے مالک تھے لیکن تجربات نے انھیں تلخیوں کا ایک طویل سلسلہ بھی عطا کیا۔ دراصل یہی تلخ تجربات ان کے الفاظ کو بعض دفعہ کرخت لہجہ بھی عطا کرتے ہیں لیکن حساس مزاج انھیں رومانویت کے سانچے میں ڈھالنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسی لیے ہمیں ان کے یہاں جذبات کی مغلوبیت نظر نہیں آتی بلکہ الفاظ میں ایک دھیما رچاؤ اور شائستہ رکھ رکھاؤ نظر آتا ہے۔ ساحر کی بیش تر نظموں میں ان اوصاف کی آمیزش صاف طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ دراصل ساحر کی شاعری کی انھیں خصوصیات نے انھیں مقبولیت عطا کی۔

ساحر کے کلام کی بنیادی خصوصیات

ساحر کے یہاں رومان وانقلاب کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ساحر اپنے پہلے مجموعہ کلام 'تلخیاں' کی ابتدائی نظموں میں خالص رومانوی نظر آتے ہیں البتہ بعد کی نظموں میں ساحر کا انقلابی اور احتجاجی رنگ

دیکھنے کو ملتا ہے لیکن ان نظموں میں بھی رومان کی چھینٹیں جا بہ جا بکھری ہوئی ملتی ہیں گویا یہ نظمیں رومان اور انقلاب کی آمیزش سے تخلیق پاتی ہیں۔ ان نظموں میں ساحر اپنے ابتدائی زمانہ شاعری کے برخلاف براہ راست خطابانہ انداز سے گریز بھی کرتے ہیں۔ جیسے کوئی پختہ کار شاعر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے ولولہ انگیزی کو رومان کے پردے میں پیش کر رہا ہو۔ گویا ساحر جب عملی سطح پر تنظیم کے جلسوں میں سرگرم تھے اور اپنی جس انداز کی نظموں کے لیے پہچانے جاتے تھے، تلخیاں میں وہ بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ تلخیاں کی ابتدائی نظموں میں اس طرح کے بھی اشعار قاری کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔

جب تمھیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر مری یاد میں یوں اشک بہانی کیوں ہو
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

ان اشعار میں ساحر کسی شکست کھائے عاشق کی طرح نظر آتے ہیں۔ بعض ناقدین نے ان اشعار کو ان کی ناکام محبت کا نتیجہ بھی قرار دیا ہے۔ حالانکہ ساحر نے جس طرح کا لاابالی مزاج پایا تھا، اس میں محبت کی ناکامی تو نہیں البتہ محبت کو پانے کی ضد نہ کرنا کہا جا سکتا ہے یا حقیقت کا ادراک کہ فن کار کی حیثیت سے چاہے جانا اور محبوب کی حیثیت چاہے جانا دونوں مختلف باتیں ہیں۔ ساحر کو نہ صرف اپنی حقیقت کا ادراک بخوبی تھا بلکہ وہ زمانہ شناس بھی تھے۔ کھردری حقیقتوں کو خوب پہچانتے تھے۔ ایسے میں ان سے آگاہ نہ ہونا خود کو اذیت میں ڈالنے کے مترادف ہے، جو ساحر جیسے باشعور ذہن رکھنے والے انسان سے قطعی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ساحر کی پوری زندگی کا آپ مطالعہ کیجیے ان کے یہاں آوارگی ملے گی لیکن تیرگی نہیں کہ جس میں انسان اپنے حالات اور آس پاس کے ماحول اور سماج سے بے خبر ہو جائے۔ اسی لیے وہ ایک نظم 'کسی کو اداس دیکھ کر' میں لکھتے ہیں۔

یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں
خریدی جاتی ہیں اٹھتی جوانیاں جن کی
یہ بات بات پہ قانون و ضابطے کی گرفت
یہ ذلتیں یہ غلامی یہ دور مجبوری
یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

ساحر کا یہ رنگ 'تلخیاں' کی ابتدائی چند نظموں کو چھوڑ کر بقیہ نظموں میں کثرت سے نظر آتا ہے۔ سرزمین یاس، مرے گیت، سوچتا ہوں، مجھے سوچنے دو، صبح نوروز، گریز اور متعدد ایسی نظمیں ہیں جن میں ساحر کی اس حقیقت پسندی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ان نظموں کے ابتدائی بند رومانوی اثر رکھتے ہیں لیکن انھیں اشتراکی رنگ میں ڈھالتے ہوئے حقیقت پسندی سے کام لینا ساحر کا ہی کمال ہے۔ اسی کمال فن نے ان نظموں کو امیجری نظم کے قریب لا کھڑا کیا ہے۔

ساحر بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ حالانکہ انھوں نے کچھ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ جو کچھ ہیں وہ ان کے پہلے مجموعہ کلام 'تلخیاں' میں موجود ہیں۔ بقیہ دونوں مجموعے خالصاً نظموں پر مبنی ہیں۔ البتہ ساحر کا تیسرا مجموعہ کلام مکمل طور پر 'گاتا جائے بنجارا' فلمی نغموں پر مبنی ہے۔ اس لیے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ساحر کی مقبولیت میں جس قدر ان نظموں نے اہم رول ادا کیا ہے اسی قدر ان کے فلمی نغموں نے بھی ساحر کی مقبولیت میں چار چاند لگایا ہے۔ ساحر نے جتنے فلمی نغمے لکھے تقریباً وہ تمام ہی مقبول ہوئے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے فلمی نغموں میں بھی اسی سماجی شعور کی جھلک ملتی ہے جو ان کی بیشتر نظموں میں موجود ہے۔ ساحر اپنے نغموں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک ان نغموں کی مقبولیت کا تعلق ہے، یہ اس دور کے مقبول ترین نغمے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک کسی فنی تخلیق کی مقبولیت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اگر اس مجموعے کو پڑھ کر آپ محسوس کریں کہ یہ نغمے آپ کی دل بستگی کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کے سیاسی اور سماجی ذوق کی بھی تسکین کرتے ہیں، تو میں سمجھوں گا کہ میری کوشش بیکار نہیں گئی۔'' (گاتا جائے بنجارہ)

اس زاویے سے دیکھا جائے تو ان کے فلمی نغمے کو ان کی ادبی شاعری سے کسی قدر الگ کر کے دیکھا نہیں جا سکتا۔ لیکن ہمارے یہاں عام طور پر فلمی نغمے لکھنے والے شاعروں کو ادب اور تنقید کے میدان کے شہ سوار عموماً ترچھی نظروں سے دیکھا کرتے ہیں اس لیے بعض اوقات ایسے شاعروں کے ساتھ ناانصافی بھی ہوتی ہے کہ ان کے فن کو محض اس لیے قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا کیوں کہ وہ فلم کے لیے لکھتے ہیں۔ اختر الایمان نے تو اسی وجہ سے فلموں کے لیے صرف مکالمے لکھے جب کہ وہ ایک مستند شاعر بھی تھے لیکن ہزار اصرار کے باجود انھوں نے اپنا شعری کلام فلمی پروڈیوسر کو نہیں دیا۔ لیکن ساحر نے ''ادب لطیف'' کی ادارت سے ''شاہراہ'' تک کی ادارت کر کے میدان ادب میں اپنی پہچان بنائی اس کے بعد ایک وقت آیا کہ وہ فلموں کے لیے گانے لکھنے میں مصروف ہو کر رہ گئے۔ لیکن جب ایک حقیقت پسند سوچ و فکر کا مالک کسی میدان میں جاتا ہے تو وہ اس میدان میں بھی اپنی انفرادیت ضرور قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساحر نے فلم جیسے خالص کمرشیل میدان میں پہنچ کر بھی اپنے گیتوں میں سماج کی ناہمواریوں کی تصویر کشی کرنے سے گریز نہیں کیا۔

تاج محل جو کہ محبت کی نشانی ہے اس پر کوئی بھی شاعر نظم لکھے گا تو وہ محبت کے لطیف جذبات سے سرشار ہو کر لکھے گا لیکن یہ ساحر کا کمال ہے کہ اس نے تاج محل پر نظم لکھی تو بھی سماج میں موجود امیری غریبی کی خلیج کا نقش ابھار دیا

اور یہ نظم ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید ہو گئی۔ نظم 'تاج محل' کو آپ مختلف زاویے سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس نظم میں جہاں محبت کے لطیف جذبات کی عکاسی مختلف انداز سے کی گئی ہے وہیں اس نظم میں جب ساحر کہتے ہیں کہ

بزم شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوت شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی؟

تو شاہانہ نظام پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ نظم کے اس بند کو جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت کی ایک شکل میں دیکھا جا سکتا ہے کہ ساحر محبت کی اس نشانی کو بھی عصری آگہی اور سیاسی شعور سے پرکھنا نہیں بھولتے۔ لیکن ایسا

ساحر کی شاعری حقیقت اور رومان کے امتزاج کی شاعری ہے جہاں رومان کا حسن بھی ہے اور حقیقت کا کھردرا پن بھی۔ اسی طرح ساحر کی شاعری احساسات کے ساتھ مشاہدات کی بھی شاعری ہے۔ ساحر نے اپنے مشاہدے کا کینوس سماج کی بے رحم حقیقتوں سے وسیع کیا اور اپنی شاعری کو اسی کینوس سے سجایا۔ ساحر کی ایک ایسی ہی طویل نظم 'پرچھائیاں' ہے جس میں مشاہدے کی گہرائی نے اسے مختلف جہات عطا کیا ہے اور حقیقت کے احساس نے اسے مستقبل کی کربناکیوں کا آئینہ دار بھی بنایا ہے۔

بھی نہیں ہے کہ ساحر نے تاج کی خوبصورتی اور اس کی کاریگری کا اعتراف نہیں کیا۔ دراصل ساحر کا اصل کمال تو یہی ہے کہ وہ اپنی بیشتر نظموں میں بیک وقت اعتراف کے پہلو کے ساتھ بھی نظر آتے ہیں اور احتجاج کی زیریں لہر بھی لیے رہتے ہیں۔ ان دونوں پہلوؤں کا اظہار ساحر نے کبھی براہ راست نہیں کیا بلکہ ساحر نے انھیں اپنے احساسات کی شدت میں پگھلا کر جمالیاتی انبساط کی تشکیل سے کام لیا ہے۔ اسی باعث ساحر کے یہاں رومانویت کا ایک انوکھا انداز نظر آتا ہے۔

آپ اس پوری نظم کا بغور مطالعہ کریں کہ اس مختصری نظم میں ساحر نے کس خوبی سے اعتراف اور احتجاج کے پہلوؤں کے ساتھ طنز کے نشتر بھی چلائے ہیں۔ اس نظم کا اصل کمال یہ ہے کہ اس مختصری نظم میں ساحر نے بیک وقت ان تینوں پہلوؤں کو بڑے ہی رومانوی انداز سے پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر اعتراف کا یہ پہلو دیکھیے۔

یہ عمارت، یہ مقابر، یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
دامنِ دہر پہ اس رنگ کی گلکاری ہیں
جس میں شامل ہے، ترے اور مرے اجداد کا خون

اس کے اگلے ہی بند میں لہجے کی تبدیلی آتی ہے۔ نظم کے آخر کے دو بندوں میں ساحر نے ان تینوں پہلوؤں کو اپنی آخری اور انتہائی شکل میں پیش کیا ہے۔

میری محبوب! انھیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے، بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل
یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

ایسا بھی نہیں کہ ساحر کی تمام نظمیں اسی رکھ رکھاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ رومانوی اور دبی دبی سی چنگاریوں سے بھرے لہجے میں لکھی گئی ہیں۔ بلکہ یہ تو وہ نظمیں ہیں جو ساحر کو ایک رومانی شاعر بناتی ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ ساحر کے یہاں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں براہ راست انقلابی اظہار ہے۔ نعروں کی بلند صدائیں ہیں۔ جوش و ولولے کا رنگ ہے۔ ان نظموں میں اشتراکیت پسندی کی بازگشت ہے۔ مثال کے طور چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مسکرا اے زمین تیرہ و تار
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ساحر کا یہ انداز دیگر اشتراکیت پسند شعرا سے مختلف بھی نہیں۔ ان نظموں میں ندرت بیان یا اظہار کے رکھ رکھاؤ سے زیادہ جوش و ولولہ اور بلند آہنگ نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے یہ وقت کا تقاضا بھی تھا جسے ساحر نے اپنی رومانویت کی نذر نہیں ہونے دیا بلکہ اپنی اشتراکیت پسندی کو اپنے گیتوں اور نظموں کے ذریعے بخوبی پیش کیا۔

ساحر اپنی ان انقلابی نظموں کے ذریعے اعلیٰ اونی کی تفریق پر مبنی سماج پر چوٹ کرتے ہیں۔ شاعری میں وہ وہی افکار پیش کرتے تھے جن افکار پر وہ حقیقی زندگی میں کاربند تھے۔ وہ انسان کی تکریم کے قائل تھے اور ایسے سماج کی تشکیل کے قائل تھے جہاں انسان، انسان کے کام آئے، جہاں انسانوں کے درمیان امن اور محبت قائم ہو، نہ کہ جنگ و رقابت کا شور سنائی دے۔ وہ انسانوں کو سرحدوں سے ماورا ایک اکائی سمجھتے تھے اس لیے دوملکوں کے درمیان اظہار برتری کے لیے ہونے والی جنگوں پر سخت لعنت بھیجتے تھے۔ ان کی ایک بہت مشہور نظم کا ایک مصرع بے حد مقبول ہے کہ ؎

جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے...

حاصل یہ کہ ساحر کی شاعری حقیقت اور رومان کے امتزاج کی شاعری ہے جہاں رومان کا حسن بھی ہے اور حقیقت کا کھردرا پن بھی۔ اسی طرح ساحر کی شاعری احساسات کے ساتھ مشاہدات کی بھی شاعری ہے۔ ساحر نے اپنے مشاہدے کا کینوس سماج کی بے رحم حقیقتوں سے وسیع کیا اور اپنی شاعری کو اسی کینوس سے سجایا۔ ساحر کی ایک ایسی ہی طویل نظم 'پرچھائیاں' ہے جس میں مشاہدے کی گہرائی نے اسے مختلف جہات عطا کیا ہے اور حقیقت کے احساس نے اسے مستقبل کی کربناکیوں کا آئینہ دار بھی بنایا ہے۔

اس طویل نظم پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے اسے محاکاتی نظم کا ایک عمدہ نمونہ کہا ہے۔ ساتھ ہی سردار جعفری نے اس نظم کے ایک حصے کو تیسری عالمی جنگ کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش بھی کی ہے جس میں ساحر نے گزشتہ جنگ سے تقابل کرتے ہوئے کہا کہ

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

اس بند کے تعلق سے سردار جعفری کا یہ بیان کہ ''تیسری جنگ... ایٹمی ہتھیاروں سے لڑی جائے گی'' بے معنی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ آج جب پوری دنیا ایک وبائی مرض کے نرغے میں ہے اور ہر طرف جنگ جیسا ماحول ہے۔ ایسے میں انسان اپنی ہی پرچھائیوں سے خوف میں مبتلا ہے۔ گوکہ آج کی بیشتر عالمی طاقتیں ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہیں تاہم آج ایٹمی ہتھیاروں سے جنگیں نہیں لڑی جاسکتی البتہ ایک غیر مرئی شے سے ضرور لڑی جارہی ہیں۔ ایک ایسی شئے جس کے خوف نے انسانوں کو ہجوم سے علیحدہ کر دیا ہے بلکہ اس کی اس علیحدگی نے جس کا ماحول پیدا کیا ہے جہاں انسان کی اپنی پرچھائیاں غیر محفوظ ہے۔ آج کا انسان اتنا تنہا اور بے بس ہوکر رہا گیا ہے کہ وہ اپنی تنہائیوں سے خوف کھانے لگا ہے۔ اس جنگ میں انسان کا اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ کہتے ہیں کہ کسی بھی چیز کی ضد کا ہونا، اس کے ہونے کی دلیل ہے۔ ایسے میں جب آج کے ماحول میں انسانوں کا ہجوم اپنا وجود کھونے لگا ہے تو کسی انسان کی تنہائیاں یا اس کی پرچھائیوں کے وجود پر خطرے کے بادل کا منڈرانا کیوں نہ لازم ہو؟ اس غیر مرئی شئے نے نہ صرف دنیا کی معیشت کو تباہ کیا ہے بلکہ نہ جانے کتنے ہی کنبوں کو برباد کر دیا ہے۔ ساحر مستقبل کی اسی خوف ناکی کا تقابل گزشتہ جنگوں سے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں

■

Dr. Imran Iraqi
Guest Faculty, Dept of Wamens College
RW3+X2F,
Chaibasa- 833201 (Jharkhand)

سالک جمیل براڑ

ساحر لدھیانوی بطور بچوں کا شاعر

ساحرلدھیانوی نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچّوں کے لیے بھی نظمیں، گیت، غزلیں اورلوریاں لکھی تھیں۔لیکن یہ تحریریں ان کی کسی کتاب حتیٰ کہ کلیات میں بھی شامل نہیں ہیں اورنہ ہی کبھی کسی نے ان کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ ساحر کی بہن سرور شفیع نے اکتوبر 1998 میں 'بچے من کے سچے' کے عنوان سے ایک کتابچہ بھی شائع کیا تھا۔ جو ساحر بچوں کے لیے لکھی نظمیں، غزلیات اورگیتوں پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کے جملہ حقوق ہندوستان میں سرور شفیع کے پاس جبکہ پاکستان میں حوری نورانی، مکتبۂ دانیال، وکٹوریہ چیمبر 2، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی کے پاس محفوظ ہیں۔اس کتاب کا سرورق جس پر پیلے کلر میں ساحرلدھیانوی کی تصویر چھپی ہے اُسے انور سلیم نے ڈیزائن کیا ہے۔ پوری کتاب کے ہر صفحے پر الگ الگ پھولوں کی بیلوں کے ساتھ حاشیہ لگایا گیا ہے۔اس کے علاوہ تحریر کی ضرورت کے مطابق کارٹون بھی بنائے گئے ہیں۔ کتاب کی تزئین کاری کا کام آرٹسٹ ہرجیت سنگھ سوہی نے بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ یہ کتاب کلیم راہی کے زیرِ اہتمام ادبی پرنٹنگ پریس، 8۔شیفر روڈ ممبئ 400008 میں چھپی ہے۔ کتاب پر قیمت بائیس روپے درج ہے اور ناشر سرور شفیع نے ساحر پبلشنگ ہاؤس، پرچھائیاں، اے بی نائر روڈ، جوہو چرچ، ممبئ 400049 سے شائع کی ہے۔ یہ کتاب محض 64 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے پہلے صفحے پر جلی حروف میں درج ہے 'ساحرلدھیانوی اور بچے' کتاب کے دوسرے صفحے پر صابردت کا یہ شعر درج ہے۔

تم ان کو دیوتا سمجھو کہ آدمی لیکن
گلی میں کھیل کے بچے جوان ہوتے ہیں

کتاب کا انتساب سرور شفیع صاحبہ نے کچھ یوں کیا ہے۔

محترم جناب اِسحاق جمخانہ والا کے نام
جو میرے بھائی ساحرلدھیانوی
کے عزیز دوست اور ہندوستان کے ایک عظیم
تعلیمی ادارے انجمنِ اسلام کے صدر ہیں

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مرتبہ نے ساحرلدھیانوی کی مختصر طور پر سوانح حیات رقم کی ہے۔ دوسرے حصے میں ساحر کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی تحریریں درج کی ہیں۔

کتاب کے آغاز میں سرور شفیع نے 'سنو بچو!' کے عنوان سے ساحرلدھیانوی کے سوانحی کوائف پیش کیے ہیں۔ جو سات صفحات پر مشتمل ہے۔اس مضمون میں مرتبہ نے ساحر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی دالی ہے۔ اس مضمون کی زبان نہایت آسان، عام فہم اور دلکش ہے۔ تحریر کا اندازِ بیان متاثرکن، نصیحت سے بھرپور ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ نہایت ہی اختصار کے ساتھ سرور شفیع نے ساحر کی زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ان کے لہجے میں اپنا پن۔ وہ بچوں سے اس طرح محوِ گفتگو ہیں جیسے وہ اس کتاب کے قارئین کو اچھی طرح جانتی ہو۔ مضمون کا آغاز پیش ہے :

''پیارے بچو! سنو...میں تمہاری باجی، سرور شفیع تمھیں اپنے مرحوم بھائی۔ ساحرلدھیانوی کی زندگی کی کہانی سنا رہی ہوں۔ ہاں...تم ٹھیک سمجھے، وہی ساحرلدھیانوی جو بہت ہی مقبول شاعر تھے اور جن کے لکھے ہوئے فلمی گیت تم آئے دن ٹی۔وی اور ریڈیو پر سنتے رہتے ہو۔

سب سے پہلے تو میں تمھیں وہ بات بتاؤں گی جو تم شاید بالکل نہیں جانتے۔اور وہ بات یہ کہ میرے بھائی کا اصلی نام ساحرلدھیانوی نہیں تھا بلکہ عبدالحیٔ تھا۔ جب انھوں نے شاعری شروع کی تو دوسرے شاعروں کی طرح اپنے لیے ایک تخلص چن لیا۔ ساحر.... چونکہ ان کی پیدائش لدھیانہ میں ہوئی تھی اور یہی شہر ان کا آبائی وطن تھا اس لیے ساحر کے ساتھ اپنے وطن کا نام بھی جوڑ لیا اور ساری دنیا میں ساحرلدھیانوی کے نام سے مشہور ہوئے۔''

(بچے من کے سچے، ص7)

ساحر کے قلمی نام کے ساتھ لدھیانوی لکھنے کے تعلق سے مرتبہ نے شہرلدھیانہ کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ پھر ساحر کے والدین، تعلیم، شاعری کی طرف رغبت، شاعری کا آغاز، پہلے ہی مشاعرے میں نظم 'تاج محل' کی شہرت کی کہانی بیان کی ہے۔ چند جملے دیکھیے :

''بچو!....جانتے ہو انھوں نے اپنے پہلے مشاعرے میں کون سی نظم سنائی تھی۔ 'تاج محل' جو آج بھی نہ صرف ساحر کی بلکہ اردو کی مشہور ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ پھر کیا تھا، نظم سنتے ہی مشاعرہ گاہ میں ہنگامہ ہوگیا۔ ہر ایک کی زبان پر ساحر صاحب کا نام تھا اس طرح وہ راتوں رات ملک بھر میں مشہور ہوگئے۔شہرت ملی تو شاعری میں دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔'' (ایضا، ص9)

لدھیانہ کی عوام ساحر کو بے پناہ چاہتی تھی۔ لدھیانہ کی زراعتی یونیورسٹی نے ایک نیا پھول ایجاد کیا اور اُس کا نام 'گل ساحر' رکھا تھا۔اس کے متعلق لکھا ہے۔ آخر میں مرتبہ بچوں سے مخاطب ہوکر سوال پوچھتی ہے کہ کیا آپ کو پتہ ہے کہ ساحر اتنے مشہور شاعر کیوں تھے۔ پھر خود کا اس سوال کا جواب یوں تحریر کرتی ہیں:

''بات صرف اتنی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں صرف سچ بولا کرتے تھے۔ انھوں نے زمیندار کو غریب کسانوں پر ظلم کرتے دیکھا تھا اس لیے انھیں زمینداروں، سرمایہ داروں غرض ہر اُس شخص سے نفرت ہوگئی جو دوسرے انسانوں پر زور زبردستی کرتا ہو، جو دوسروں کا حق چھینتا ہو۔ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں

ظالموں، دھنوانوں اور زمین داروں کے خلاف آواز بلند کی اور یہ آواز عام انسانوں کو بہت بھائی۔ اس لیے وہ ساحر لدھیانوی سے پیار کرنے لگے۔" (ایضاً، ص10)

اصل میں عظیم شخصیات کی سوانح حیات اور کارناموں سے بچوں کو روبرو کرنے کا واحد مقصد اُن کو زندگی میں کچھ بہتر کرنے کے لیے تیار کیا جانا ہے۔ اسی بات کے مدنظر مرتبہ نے ساحر کی زندگی کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ جو دلچسپی بھرا اور سبق آموز ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ ساحر کی بچوں کے لیے لکھی نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔ اس حصّے میں ساحر کی بائیس نظمیں اور گیت لکھے گئے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی زندگی کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ساحر کے معاشقے ضرور چلے اور اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ امریتا پریتم نے اپنی سوانح حیات 'رسیدی ٹکٹ' میں خود ساحر سے اپنی یک طرفہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ساحر کے یہ معاشقے کامیابی کی منزل تک نہ پہنچ پائے اور وہ تاعمر کنوارے رہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کو بچوں سے بے انتہا محبت تھی۔ جس کی شہادت نظمیں اور گیت دے رہے ہیں۔

ساحر کی نظر میں بچے من کے سچے ہوتے ہیں۔ بچے انسان کے علاوہ بھگوان کو بھی پیارے ہوتے ہیں۔ ساحر نے ایک گیت 'بچے من کے سچے' مشہور ہندی فلم 'دو کلیاں' کے لیے لکھا تھا۔ جس کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ آج بھی یہ گیت اسکولوں کے خاص پروگراموں میں گایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ گیت you.tube پر دستیاب ہے۔ ایک بند پیش خدمت ہے:

بچے من کے سچے، سارے جگ کی آنکھ کے تارے
یہ وہ ننھے پھول ہیں جو بھگوان کو لگتے پیارے
خود روٹھیں خود من جائیں، پھر ہم جولی بن جائیں
جھگڑا جس کے سات کریں، اگلے ہی پل پھر بات کریں
ان کو کسی سے بَیر نہیں، ان کے لیے کوئی غیر نہیں
(ایضاً، ص14)

ساحر کو بچے اتنے معصوم نظر آتے ہیں کہ اُن کو بچّوں میں ایشور، اللہ، جیسز، بھگوان اور رحمٰن نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ بچے اُن کو گیتا، بائبل، اور قرآن کی طرح مہان نظر آتے ہیں۔ نظم 'بچہ ہے مہان' جملے دیکھیے۔

تجھ میں ایشور/ اللہ تجھ میں
تجھ میں جیسز پایا/ بچے میں ہے بھگوان
بچّے ہیں رحمٰن/ بچہ جیسز کی شان
گیتا اس میں/ بائبل اس میں
اس میں ہے قرآن/ بولو بچہ ہے مہان
جگ میں بچّہ ہے مہان
مندر مسجد اور گرجے میں اس کا نُور سمایا
اِس ننھی سی جان میں چھپ کر وہ اپنے گھر آیا
پاپی من کو پاون کرتی اس کی ہر مُسکان
بولو بچہ ہے مہان (ایضاً، ص31)

ساحر لدھیانوی ہندوستان کے بچوں کو اپنے بچے مانتے ہیں اور ان کو اچھی باتیں بتانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کو ہر ماں باپ کی طرح بھارت کے بچوں سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ کیونکہ وہ ملک کا مستقبل ہیں۔ نظم 'بھارت کے بچے' میں وہ پورے ملک کے بچوں سے مخاطب ہوکر کہہ رہے ہیں کہ جس دیش یعنی بھارت ماں نے انھیں جنم دیا ہے، پالا پوسا ہے۔ بڑے ہونے کے بعد انھیں اس دیش کی حفاظت کر کے بھارت ماں کا قرض چکانا ہے۔ نظم کے دو بند پیش ہیں۔

بھارت ماں کی آنکھ کے تارو ننھے منے راج دُلارو
جیسے میں نے تم کو سنوارا ویسے ہی تم دیش سنوارو
بھارت ماں ....
یہ جو ہے اک چھوٹا سا بستہ علم کے پھولوں کا گلدستہ
کرشن ہے اس میں رام ہے اس میں
بُدھ مت اور اسلام ہے اِس میں
یہ بستہ عیسیٰ کی کہانی یہ بستہ نانک کی بانی
اِس میں چھپی ہے ہر سچائی اپنا سُکھ، اوروں کی بھلائی
اِس بستے کو سیس نواؤ اِس بستے پر تن وارو
بھارت ماں ....
(بچے من کے سچے، ص16)

اسی طرح نظم 'ہندوستانی بچے' میں بھی شاعر ہندوستان کے بچوں سے مخاطب ہوکر کہہ رہا ہے کہ "بچو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی"۔ شاعر چاہتا ہے کہ 'ہندوستانی بچے' جب بڑے ہو کر ملک کی باگ ڈور سنبھالیں گے تو ملک خوب ترقی کرے گا۔ اُن کے ملک میں ہندو مسلمان کو برابر کے حق ملیں گے۔ دیش میں مذہب کے نام پر کسی طرح کی پھوٹ نہ ہو۔ دھن، دولت کے لیے ایمان کی توہین نہیں ہونی چاہیے۔ ساتھ ہی ہمیں جنگ سے بھی بچنا چاہیے۔ غریبوں، کسانوں اور مزدروں کو اُن کا حق ملنے چاہیے اور لٹیروں اور سرمایہ داروں کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ شاعر ہندوستانی بچوں سے کچھ یوں کہتا ہے۔

بچو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی
باپو کے وردان کی، نہرو کے ارمان کی
آج کے ٹوٹے کھنڈروں پر تم کل دیش بساؤ گے
جو ہم لوگوں سے نہ ہوا، وہ تم کر کے دکھاؤ گے
تم ننھی بنیادیں ہو، دنیا کے نئے ودھان کی
بچو ! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی

نظم کے آخری اشعار دیکھیے۔

رہ نہ سکے اب اس دُنیا میں یُگ سرمایہ داری کا
تم کو جھنڈا لہرانا ہے محنت کی سرداری کا
ہل ہوں اب مزدوروں کے اور کھیتی ہو دہقان کی
بچو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی
(بچے من کے سچے، ص23)

نظم 'بچو بناؤ نیا ہندوستان' ایک منفرد انداز میں لکھی ہوئی نظم ہے جس میں بچہ یعنی شاگرد استاد سے ہندوستان کے متعلق گفتگو کر رہا ہے۔ بچہ ملک کی خستہ حالت کے متعلق استاد سے کئی سوال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر قرآن اور وید پران ایک ہی پیغام دیتے ہیں تو پھر یہ شور شرابہ اور خون خرابہ کیوں ہے؟ وہ مزید سوال پوچھتا ہے کہ اگر برہمن اور ہریجن انسان ہیں تو پھر ایک کی اتنی عزت کیوں ہے اور دوسرے کی اتنی ذلت کیوں؟ بچہ مزید سوال کرتا ہے کہ اب تو دیش میں آزادی ہے لیکن اب بھی جنتا کیوں فریادی ہے؟ استاد بچہ کے ہر سوال کا بہت ہی متاثر کُن جواب دیتا ہے۔ بچے کا ایک سوال اور استاد کا جواب پیش خدمت ہے؟

بچے: وہی ہے جب قرآن کا کہنا
جو ہے وید پُران کا کہنا
پھر یہ شور شرابہ کیوں ہے ؟
اتنا خون خرابہ کیوں ہے ؟
اُستاد: صدیوں تک اس دیس میں بچو رہی جس حکومت غیروں کی
آج تلک ہم سب کے منہ پر دھول ہے ان کے پیروں کی
'لڑواؤ اور راج کرو' یہ اُن لوگوں کی حکمت تھی
ان لوگوں کی چال میں آنا، ہم لوگوں کی ذلّت تھی
یہ جو بیر ہے اک دوجے سے، یہ جو پھوٹ اور رنجش ہے
اُنھیں بدیشی آقاؤں کی سوچی سمجھی بخشش ہے
(بچے من کے سچے، ص25)

نظم 'بچوں کی سرکار' بھی اس کتاب کی ایک الگ انداز میں لکھی نظم ہے۔ ساحر اس نظم میں تصوراتی دنیا میں چلا گیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کبھی بچوں کی بھی سرکار بنے کیونکہ صدیوں سے بڑوں کا ہی راج ہے۔ بچوں کی سرکار بننے کے بعد بچے اپنی خواہشات کی تکمیل کس طرح کریں گے اس ضمن میں شاعر مزاح پیدا کرتے ہیں کہ پھر دنیا میں نیا کیلنڈر بنے گا جس میں دو دو دن بعد اتوار ہوگا۔ اس کے علاوہ اسکولوں میں یونیفارم کی پابندی بھی ختم ہوجائے گی۔ ساتھ ہی شاعر کو اُمید ہے کہ بچّوں کی سرکار میں ساہوکار کے ساتھ مفلس بھی منسٹر بنے گا اور ملک بھر میں عید اور دیوالی لوگ مل کر منائیں گے۔

ہم منسٹر ہوں تو وہ سسٹم بنے
جس میں مفلس ہو نہ ساہوکار ہو
قومی دولت کے خزانے ہوں بھرے
خود ہی لے لے جس کو درکار ہو
عید، دیوالی سبھی مل کر منائیں
آدمی کو آدمی سے پیار ہو
ملک میں بچوں ....

(ایضاً،ص21)

ماں اور بچے کا رشتہ انسانی رشتوں میں اٹوٹ ہے جو بے لوث رشتہ ہے۔ ماں اپنے بچے سے بے انتہا پیار کرتی ہے اور اس کی پرورش میں دن رات ایک کردیتی ہے۔ ساحر لدھیانوی نے ماں اور بچے کے اس رشتے پر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ بچپن میں جب بچہ روتا ہے تو ماں اسے چپ کرانے کے لیے لوری سناتی ہے۔ ساحر نے بچوں کے لیے ایک لوری بھی لکھی ہے۔ ایک بند پیش ہے۔

رات آگئی چمن کے نظارے بھی سو گئے
ندیا کو نیند آگئی، دھارے بھی سو گئے
نیلے گگن کے راج دُلارے بھی سو گئے
سویا ہوا ہے چاند ستارے بھی سو گئے
نیندیں گھلی ہوئی ہیں نشیلی ہواؤں میں!
سوجا رے لاڈلے مرے آنچل کی چھاؤں میں

(ایضاً،ص33)

نظم 'میرا منا' بھی ماں اور بچے کے رشتے پر مبنی ہے۔ جس میں ماں بچے سے مخاطب ہے۔ وہ اس نظم میں اپنے بیٹے کو عمر بھر اس کے پاس اور ساتھ رہنے کے لیے کہہ رہی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ میرے پاس رہنا کہیں تم میری محبتوں کو بھول نہ جانا۔ وہ کہتی ہے کہ میں تمھیں زندگی کی کڑی دھوپ میں جلا کر کندن بنا دوں گی۔ لیکن دیکھنا جس دن میں اس دنیا سے چلی جاؤں گی تو اس دنیا میں تیرا کوئی نہیں رہے گا۔ لیکن وہ اپنے بچے سے وعدہ لیتی ہے کہ تمھیں ساری عمر اُس کے ساتھ رہنا ہوگا اور اس طرح اُس کے دودھ کا قرض چکانا ہوگا۔ اصل میں یہ نظم ساحر کی اپنی کہانی ہے۔ ساحر کی ماں نے اس کے والد سے طلاق لے لیا تھا۔ اس طرح ساحر کی پرورش اُس کی ماں کی دیکھ ریکھ میں ہی ہوئی تھی۔ اس طرح ساحر ہی اُس کا سہارا تھا اور وہ ساحر کا سہارا تھی۔

تُو میرے ساتھ رہے گا مُنّے!
تا کہ تو جان سکے
تجھ کو پروان چڑھانے کے لیے
کتنے سنگین مراحل سے تری ماں گزری
کتنے پاؤں میری ممتا کے کلیجے پہ پڑے
کتنے خنجر مری آنکھوں میرے کانوں میں گڑے

(ایضاً،19)

اسی طرح نظم 'میرے منے' میں ماں اپنے بیٹے کے لیے دُعا گو ہے کہ وہ زندگی میں کامیابی سے ہمکنار ہو۔ ماں چاہتی ہے کہ اُس کا بیٹا دنیا میں اچھے کام کرے اور سیدھی راہ پر چلے۔ کیسے بھی زندگی کے مشکل حالات ہوں لیکن اُس کے پاؤں نہ ڈگمگائیں۔ نظم کا دوسرا اور آخری بند پیش خدمت ہے۔

کیسی بھی مشکل آئے
تیرا پاؤں نہ ڈولنے پائے
تو اُن کا مان بڑھائے
میں تجھ پر بلیہاری
تو سیدھی راہ پہ چلنا
جگ جگ تک کھول نہ پنا

(ایضاً،ص38)

ساحر بے حد حساس شاعر تھا۔ وہ پورے ملک کے امیر،غریب اور بے سہارا بچوں سے مخاطب ہے۔ ساحر کی نظر ایک بچے پر پڑی ہے جسے کوئی طوائف کے کوٹھے پر چھوڑ گیا ہے۔ شاعر اس بچے کو دیکھ کر تلملا اُٹھاتا ہے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ وہ بچہ اس بدنام بستی میں پرورش پا کر غنڈہ اور بدمعاش بنے۔ شاعر اس ننھے بچے سے یوں مخاطب ہے۔ نظم 'ننھے گلفام' کے دوسرے بند میں بچے سے سوال پوچھ رہا ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کس کا پڑا تجھ پر سایہ؟ کس نے یہ رستہ دکھلایا
کون تجھے اس گھر میں لایا؟ یہ گھر ہے رُسوا بدنام
ان گلیوں کی قسمت ہے ٹوٹے گجرے جھوٹے جام
زخمی سازوں کی جھنکار گھایل گیتوں کی گنجار

(ایضاً،ص36)

ساحر کو بچیاں بھی بہت پیاری لگتی ہیں جیسے پری۔ وہ ان کی معصومیت سے بہت متاثر ہیں۔ ساحر نے بیٹیوں سے اپنے دل کے جذبات کا اظہار اپنے مشہور گیت 'ننھی پری' میں پیش کیا ہے۔ یہ گیت مشہور ہندی فلم 'کبھی کبھی' میں گایا گیا تھا۔ جسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ جو آج بھی اسکولوں کے خاص پروگراموں میں پیش کیا جاتا ہے۔ گیت 'ننھی پری' کا پہلا بند پیش ہے۔

میرے گھر آئی ایک ننھی پری
چاندنی کے حسین رتھ پہ سوار
میرے گھر آئی ایک ننھی پری
اُس کی باتوں میں شہد جیسی مٹھاس
اُس کی سانسوں میں عطر کی مہکار

(ایضاً،ص40)

اسی طرح نظم 'ننھی لاڈلی' میں بھی ساحر اپنے دیش کی بیٹیوں اور بچیوں سے مخاطب ہے۔ گیت 'ممی کے لیے ایک گیت' میں بچہ اپنی ماں سے اس کی جانب سے کی گئی شرارت کی معافی مانگ رہا ہے۔ اسی طرح نظم 'بھیا کو سندیسا' میں بہن اپنے بھائی کی ترقی اور کامیابی کے لیے دعا کر رہی ہے اور چندا یعنی چاند سے کہہ رہی ہے کہ وہ اُس کی بات اُس کے بھائی تک پہنچا دے۔ نظم 'ماما جی کا راکٹ' ایک منفرد قسم کی نظم ہے۔ جس میں بچہ ماما جی کے راکٹ میں بیٹھ کر چاند کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ چاند پر جا کر مل جل کر دودھ ملائی کھانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی دیدی کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا کیونکہ وہاں اُس کے کپڑے کون دھوئے گا۔

ساحر نے نظم 'انسان کی اولاد' میں بچے کو انسانیت کا سبق پڑھایا ہے اور اُسے یہ بتایا ہے کہ ہندو مسلمان سے پہلے وہ انسان ہے۔ اس لیے مذہب کے نام پر اُس کو کسی انسان سے تفریق نہیں کرنی چاہیے۔ شاعر چاہتا ہے کہ اس کے دیش کا بچہ ہندو مسلمان کی دیواروں میں قید نہ ہو بلکہ وہ نفرت کی ان دیواروں کو گرا کر آگے بڑھے تاکہ ملک کی ترقی کرے۔

تو ہندو بنے گا، نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے، انسان بنے گا
اچھا ہے ابھی تک ترا کچھ نام نہیں ہے
تجھ کو کسی مذہب سے کوئی کام نہیں ہے
جس علم نے انسانوں کو تقسیم کیا ہے
اُس علم کا تجھ پر کوئی الزام نہیں ہے
تو بدلے ہوئے وقت کی پہچان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

(ایضاً،ص29)

بلاشبہ ساحر لدھیانوی بچوں کے ایک باکمال شاعر ہیں۔ موصوف نے ادبِ اطفال کے میدان میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ ساحر نے بالکل جدا اور منفرد انداز میں بچوں کے لیے نظمیں اور گیت تخلیق کیے ہیں اور ہیئت اور تکنیک کے نئے نئے تجربات کیے ہیں۔ ان کی زبان آسان، سلیس اور عام فہم ہے۔

ساحر کی یہ تخلیقات یقیناً ادبِ اطفال کا ایک عظیم سرمایہ ہیں۔ لیکن اردو دنیا اب تک اس سے فیضیاب نہیں ہو سکی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ساحر لدھیانوی کے بچوں کے لیے لکھے گیتوں اور نظموں کو نصابی کتب میں شامل کیا جائے۔

■

Dr. Salik Jamil Brar
Asst Professor, Desh Bhagat University
Mandi Gobindgarh - 147301 (Punjab)
Moh.: 8360203095

1857 کی جنگ آزادی کا عظیم سپہ سالار
بخت خاں

درخشاں تاجور

ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں 1857 کا سال ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے جب صدیوں سے دبے کچلے عوام نے انگریزوں کے غاصبانہ اور جابرانہ اقتدار کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ 1857 میں جب ہندوستانیوں کے دلوں میں پکتا ہوا لاوا شعلۂ جوالا بن کر پھوٹا تو ہر شخص سر پر کفن باندھ کر اس لڑائی میں حصہ لینے کے لیے کود پڑا۔ اس لڑائی کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں بادشاہ، علما، بوڑھے، جوان، مرد و عورت سبھی انگریزوں سے آر پار کی جنگ کرنے کو اُٹھ کھڑے ہوئے اور شجاعت اور بہادری کی وہ مثالیں پیش کیں جو تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ 1857 کی جنگ آزادی میں جن لوگوں نے قیادت کی ذمے داریاں سنبھالیں ان میں بخت خاں کا نام منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔

بخت خاں کو جنگ آزادی میں شمولیت حاصل کرنے کی ترغیب مولانا سرفراز علی گورکھپوری نے دلائی جو گورکھپور کے سوداگر محلے کے رہنے والے تھے ان کی فکری تبدیلی میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ سرفراز علی جنگ آزادی کے نمائندہ قائدین میں سے تھے۔ بخت خاں پہلے انگریزوں کی فوج میں صوبیدار تھے۔ سرفراز علی نے انھیں اپنی صلاحیتوں کو انگریزوں کے خلاف استعمال کرنے اور ان سے برسرِ پیکار ہونے کی ہدایت دی۔

بخت خاں کو جنگ آزادی میں شمولیت حاصل کرنے کی ترغیب مولانا سرفراز علی گورکھپوری نے دلائی جو گورکھپور کے سوداگر محلے کے رہنے والے تھے ان کی فکری تبدیلی میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ سرفراز علی جنگ آزادی کے نمائندہ قائدین میں سے تھے۔ بخت خاں پہلے انگریزوں کی فوج میں صوبیدار تھے۔ سرفراز علی نے انھیں اپنی صلاحیتوں کو انگریزوں کے خلاف استعمال کرنے اور ان سے برسرِ پیکار ہونے کی ہدایت دی۔ شروع میں تو انھوں نے کچھ تامل کیا، لیکن آخر میں انھوں نے بخت خاں کو بغاوت میں حصہ لینے کے لیے آمادہ کرلیا اور وہ انگریزوں کے غاصبانہ تسلط سے نجات حاصل کرنے کی لڑائی میں شریک ہونے کو تیار ہوگئے[1] بریلی سے بخت خاں تحریک میں حصہ لینے کے لیے جب دہلی پہنچے تو ان کے ساتھ سو علما بھی تھے[2] جن کی رہنمائی سرفراز علی گورکھپوری کر رہے تھے[3] مراد آباد کی پلٹن نمبر 29 بھی ان کے ساتھ تھی[4] ان کا دہلی آنا بہادر شاہ کے لیے نیک شگون ثابت ہوا۔ بہادر شاہ نے انھیں انقلابی فوجوں کی کمان سونپ دی[5]۔ جس وقت وہ دہلی پہنچے تو بہادر شاہ نے ان کے استقبال کے لیے احمد قلی خاں کو بھیجا ان کے ہمراہ حکیم احسن اللہ خاں، ابراہیم خاں جنرل صمد خاں، غلام علی خاں اور چند افسر بھی موجود تھے[6] بخت خاں نے دہلی آنے کے بعد تحریک میں تیزی لانے کے لیے ایک فتوئ جہاد مرتب کرایا[7] ساتھ ہی انھوں نے ایک حلف نامہ بھی تقسیم کرایا جن پر سات آٹھ ہزار سپاہیوں سے عہد لیا گیا کہ وہ آخر دم تک انگریزوں سے لڑیں گے[8] وہ اپنے ساتھ چار لاکھ خزانہ بھی لائے تھے اور جو فوج ان کے ہمراہ آئی تھی اس کو وہ چھ ماہ کی تنخواہ پیشگی دے چکے تھے[9] بخت خاں کو دہلی پہنچنے کے بعد بڑے ہی اعزاز و مراتب سے نوازا گیا۔ انھیں معزالدولہ فرزند کا خطاب دیا گیا، گورنر کا عہدہ ملا اس کے علاوہ انھیں صاحب عالم اور بخت بلند خاں کا خطاب دے کر ان کی پذیرائی بھی کی گئی[10] بہادر شاہ نے انھیں ایک ڈھال اور تلوار بھی دی[11] ان کے نام کی مہر بھی بدرالدین مہر کن سے تیار کروائی[12] اور

انھیں دہلی میں موجود باغی فوج کا کمانڈر انچیف بھی بنادیا[13] ان کی تقرری کا استقبال صادق الاخبار میں بھی کیا گیا۔اس نے اپنی 6 جولائی 1857 کی اشاعت میں یہ لکھا:

’’ آسائش رعایا ہند منظور خدا ہے اس لیے منتظم دوراں جناب محمد بخت خاں بہادر جنرل کو عدالت، مدبری اور انتظام میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہمارا شفیق بنایا ہے اور جناب موصوف نے حضور سے خلعت فاخرہ سپرد و شمشیر پائی ہے۔شہر کا انتظام بخوبی کردیا۔‘‘[14]

بخت خاں نے قیادت کی کمان سنبھالنے کی بعد بہت سے اہم فیصلے کیے شہر میں امن و امان کی فضا بحال کرنے کی کوشش کی شہر کوتوال کو یہ واضح کردیا کہ بدامنی اور لاقانونیت کو کسی طرح برداشت نہیں کیا جائے گا اور اگر انھوں نے لاپروائی کی تو وہ بھی سزا کے حقدار ہوں گے[15] لوٹ مار میں ملوث شہزادوں اور مہاجنوں پر قدغن لگائی[16] شکر اور نمک کے محصول کو معاف کرایا[17] کیونکہ ان سے عام انسانی زندگی متاثر ہوتی تھی فوج کو نئے سرے سے درست کیا۔ بچھرا پلٹن کے نام سے ایک نئی پلٹن کی تشکیل کی جس نے کئی مورچوں پر انگریزوں سے سخت مقابلہ کر کے انھیں مشکل میں ڈال دیا۔[18]

بہادر شاہ چاہتے تھے کہ انگریزوں کے خلاف یہ لڑائی ہندو مسلمان مشترکہ طور پر لڑیں اس لیے انھوں نے ہر وہ کوشش کی جس کی ذریعے ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بھائی چارے کا ماحول قائم ہو۔شاہ دہلی یہ جانتے تھے کہ گائے ہندوؤں کے لیے قابل تعظیم ہے اس لیے انھوں نے بخت خاں کو احکام دیے کہ وہ منادی کرادیں کہ اگر کوئی شخص گائے کی قربانی کرے گا تو اسے توپ سے باندھ کر اُڑا دیا جائے گا[19] چنانچہ بخت خاں نے شہر میں بہ آواز دہل یہ اعلان کرادیا کہ کوئی شخص گائے کی قربانی نہ کرے[20] اس بات کا ذکر اس عہد کے سبھی وقائع نگاروں نے کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 1857 میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے کندھے سے کندھا ملا کر انگریزوں کو داو شجاعت دی اور انگریز اپنی بھرپور توانائیاں صرف کرنے کے باوجود ان کی متحدہ قوت کو توڑنے میں ناکام رہے۔اس بات کی تصدیق کے لیے ملاحظہ ہو کیتھ ینگ کے خط کا یہ اقتباس جسے اس نے 12 اگست 1857 کو اپنی بیوی کے نام لکھا:

’’ بظاہر کل شہر میں زبردست فساد کے لیے ہماری امیدیں پوری نہیں ہوسکیں بادشاہ نے نہ صرف گائے بلکہ بکری تک کی قربانی کے لیے شہر میں ممانعت کردی ہے اور ایسا عمل کیا گیا تو یہ یقیناً ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ لوگ آپس میں لڑتے ہمارے خلاف متحدہ اور بھرپور حملہ کرنے کے لیے ایک ہوگئے ہیں تاکہ ہمیں برباد کردیں اور صفحۂ زمین سے ہمارا نام و نشان بھی مٹا ڈالیں۔[21]

ان کے مدبرانہ فیصلوں کی وجہ سے ان کی عزت میں بہت اضافہ ہوگیا 27 جولائی کو صادق الاخبار میں ان کی مدح میں ایک مثنوی شائع ہوئی جسے مولوی ظہور علی تھانہ دار نجف گڑھ نے لکھا تھا۔[22]

بخت خاں ایک بہادر اور نڈر سپاہی تھے انھوں نے اپنی آخری سانس تک دہلی کو بچائے رکھنے کی کوشش کی مختلف مورچوں پر شریک ہوئے اور وہاں کامیابی کے جھنڈے گاڑے جس کی تصدیق اس عہد کے بیشتر وقائع نگاروں نے کی ہے[23] ان کی رہنمائی میں انقلابیوں نے انگریزوں سے زبردست مقابلے کیے۔ان کے اندر فوجی حکمت عملی کی صلاحیت بھی موجود تھی لیکن ان کی قیادت کو سبھی انقلابی تسلیم نہیں کررہے تھے وہ شہزادگان جو بدعنوانی

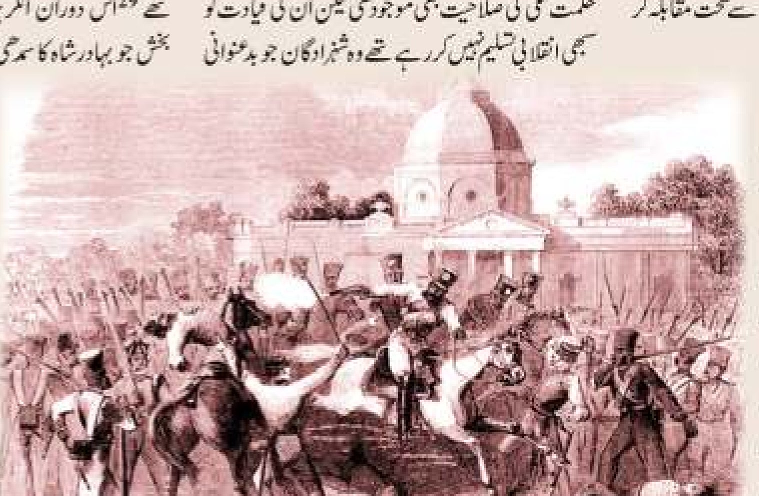

میں ملوث تھے اور فوج کے وہ افسران جنھیں کم اختیارات حاصل تھے وہ ان کے احکامات کو ماننے کو تیار نہیں تھے خصوصاً غوث خاں اور سدھاری سنگھ جن کا رتبہ پہلے میں برابر تھا دہلی میں اُن کا مرتبہ بخت خاں سے کم ہوگیا تھا اس لیے ان کے اندر بخت خاں کے لیے زبردست حسد کا جذبہ تھا اور وہ انھیں اپنا سپہ سالار ماننے کو تیار نہیں تھے[24] یہ آپسی پھوٹ انگریزوں کے لیے سودمند ثابت ہوئی اور اکثر مورچوں پر انقلابیوں کو شکست کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ سازشوں کے جال نے انقلابیوں کی طاقت کو کمزور بھی کیا

وہ الگ کمانڈر مقرر کرنے کی بہادر شاہ سے سفارش کرتے رہتے تھے خود بخت خاں نے بھی یہ خواہش ظاہر کی کہ میں صرف بریلی برگیڈ کی کمان سنبھالوں گا[25] اس آپسی چپقلش نے بھی تحریک کو کمزور کرنے میں حصہ لیا اور ملک وقوم کو نااتفاقیوں کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ بخت خاں مورچے میں مصروف تھے کہ انھیں خبر ملی بہادر شاہ نے قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرے میں جانے کا فیصلہ کرلیا ہے[26] اس خبر نے انھیں بےچین کردیا وہ اسی رات بہادر شاہ کے پاس گئے اور کہا کہ حالات بے شک نازک ہیں انگریز شہر پر قابض ہوگئے ہیں انھوں نے قلعہ بھی لے لیا ہے لیکن ابھی پورا ملک ہماری طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے اور آپ کے نام سے جنگ جاری رکھی جاسکتی ہے آپ ہمارے ساتھ چلیں ہم محفوظ مقامات سے انگریزوں سے جنگ جاری رکھیں گے آدمی رسد اور ہتھیار فراہم کرنے کی ذمے داری ہماری ہوگی[27] بخت خاں کی تقریر کا بہادر شاہ پر اثر بھی ہوا۔ انھوں نے دوسرے دن یعنی 20 ستمبر 1857 کو انھیں قلعہ میں بلایا[28] دوسرے دن وہ پھر گئے ان کے ساتھ وزیر خاں اور مولانا فیض احمد بدایونی بھی تھے[29] اس دوران انگریزوں کا جاسوس اور ایجنٹ الٰہی بخش جو بہادر شاہ کا سمدھی بھی تھا بہادر شاہ کو شیشے میں اتار چکا تھا[30] بہادر شاہ مایوس تھے اس دوران وہ دیسی راجاؤں سے مدد کی درخواست کرچکے تھے جنھوں نے ان کی درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا تھا اور ان کی پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوچکی تھی[31] بہادر شاہ نے اپنی صحت اور ضعیف العمری کا حوالہ دے کر بخت خاں سے معذرت کرلی اور کہا کہ میرے جسم کی قوت جواب دے چکی ہے بخت خاں کی اس دوران الٰہی بخش سے تیکھی گفتگو بھی ہوئی بخت خاں نے غصّے میں تلوار بھی نکال لی بہادر شاہ نے بخت خاں کو روک دیا اور کہا کہ اب مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور تم خود ہندوستان کی لاج رکھ لو اور اپنے فرض کو انجام دو۔[32] بخت خاں ناامیدی اور مایوسی کی کیفیت میں وہاں سے لوٹ آئے۔ الٰہی بخش نے ہڈسن کو مطلع کردیا۔ بہادر شاہ کو انگریزوں نے گرفتار کرلیا[33] اور انھوں نے اپنے اس مجرم کو جلاوطنی کی کرب ناک اذیت میں مبتلا کرکے ان سے اس جنگ آزادی میں

شریک ہونے کی قیمت وصول کرلی۔

دہلی سے شکست کے بعد وہ بدایوں ہوتے ہوئے فرخ آباد پہنچے اور فتح گڈھ اور فرخ آباد کے معرکوں میں شریک ہوئے ولیم میور کے مطابق بخت خاں نانا صاحب کے بھائی (400 سو محافظ عملہ) کے ہمراہ بدایوں ہوتے ہوئے 23 اکتوبر 1857 کو فرخ آباد پہنچے تھے 34 فرخ آباد میں بھی وہ انگریزوں سے نبرد آزما ہوئے لیکن شکست کھائی۔ انگریزوں کے تسلط سے قبل ہی دسمبر 1857 کے آخری ہفتے میں فرخ آباد سے نکل گئے 35 اور وفادار ساتھیوں کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہوگئے تاکہ اودھ میں ہونے والی لڑائیوں میں شریک ہوسکیں اس مرتبہ بھی ایک کثیر فوج ان کے ہمراہ تھی۔ 36

بیگم حضرت محل نے ان کا استقبال کیا انھیں خلعت اور رومال عطا کرکے ان کی پذیرائی کی 37 سلطان بہو نے انھیں خلد منزل میں ٹھہرایا 38 لکھنؤ میں بھی انقلابی رہنماؤں میں گروہ بندی تھی وہ کسی گروہ بندی میں شامل نہیں ہوئے اور بیگم حضرت محل کی فوج میں شامل ہو گئے۔ 16 مارچ 1858 کو عالم باغ کے مورچے میں شریک ہوئے 39 جب لکھنؤ بھی انقلابیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا تو بخت خاں نے شاہجہاں پور کا رُخ کیا جہاں احمد اللہ شاہ، ان کے پیر سرفراز علی اور نانا صاحب موجود تھے 40 شاہجہاں پور میں بھی انگریزوں سے سخت مقابلے ہوئے وہاں بھی جب انگریزوں کا پلڑا بھاری ہوگیا تو ان سبھی رہنماؤں نے محمدی کا رُخ کیا۔ محمدی میں احمد اللہ شاہ نے ایک عارضی حکومت کا قیام کیا تو بخت خاں اور نانا صاحب کے ساتھ ان کی کابینہ میں شامل ہوئے اس کابینہ میں بخت خاں وزیر جنگ نانا صاحب دیوان اور سرفراز علی (قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بنائے گئے 41 جب کولن کیمپبل کی فوجوں نے محمدی پر قبضہ کرلیا تو وہ تحریک کے دوسرے رہنماؤں سرفراز علی، محمود خاں حضرت محل، نانا صاحب اور عظیم اللہ خاں کے ہمراہ نیپال کی طرف نکل گئے 42 نیپال میں پہنچنے کے بعد بخت خاں کے بارے میں کوئی خاص جانکاری نہیں ملتی۔ رکٹس نے لکھا ہے کہ بخت خاں بڑی جستجو کے بعد کہیں نہ ملا 43 ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ وہ 13 مئی 1859 کو ایک لڑائی میں مارا گیا 44 ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آبائی وطن بنیر ضلع سوات زخمی حالت میں پہنچ گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا 45 لیکن اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں کہ انگریز اپنے ازلی دشمن کو پکڑنے میں ناکام رہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے رہنماؤں میں بخت خاں کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

جواہر لال نہرو کے اس بیان کی صداقت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ:

''اگر دہلی کی ساری جنگ کا 'تاج' بہادر شاہ ظفر تھا اور ہاتھ پاؤں ہندو، مسلمان تھے تو اس جنگ کا دماغ بخت خاں تھا۔'' 46

بخت خاں نے اپنی پوری زندگی انگریزوں کے غاصبانہ تسلط سے نجات دلانے کے لیے صرف کردی۔ شجاعت اور اولوالعزمی کے اس پیکر نے وطن مالوف کو غیر ملکی قبضے سے نجات دلانے کے لیے جو کوششیں کیں وہ تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں اور جنھیں فراموش نہیں کیا جانا چاہیے۔

حواشی

1 ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما از انتظام اللہ شہابی فاروقی پریس دہلی، ص73
2 1857 کا تاریخی روز نامچہ، از خلیق احمد نظامی، الجمعیۃ پریس دہلی 1958، ص15
3 اٹھارہ سو ستاون (دہلی، میرٹھ، اودھ اور روہیل کھنڈ) از خورشید مصطفیٰ رضوی، رام پور رضا لائبریری رامپور 2000، ص285
4 اخبار الصنادید، از حکیم نجم الغنی خاں رام پوری، رامپور پرنٹرس نئی دہلی ص48
5 اٹھارہ ستاون (دہلی، میرٹھ، اودھ اور روہیل کھنڈ) از خورشید مصطفیٰ رضوی ص286
6 تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ ہند، از ذکاء اللہ شمس المطابع دہلی 1940، ص594
7 جنگ آزادی 1857 (واقعات وشخصیات) از ایوب قادری پاک اکیڈمی کراچی ص402
8 بہادر شاہ اور ان کا عہد، از رئیس احمد جعفری، علمی پرنٹنگ پریس لاہور 1957، ص842
9,10 اٹھارہ سو ستاون (دہلی، میرٹھ، اودھ اور روہیل کھنڈ) از خورشید مصطفیٰ رضوی ص286
11 57، کے ہیرو از سیدہ انیس فاطمہ بریلوی اقبال بکڈپو، بار دوم ص88 جنگ آزادی کے سرخیل از۔
ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 2013، ص64
12 اٹھارہ سوستاون کے راہ نما (سوانحی خاکے) مرتبہ۔ اقبال حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی 2009، ص52
13 1857 کے مجاہد، از غلام رسول مہر، کتاب منزل لاہور، 1960، ص173
14 اٹھارہ سوستاون کے راہنما (سوانحی خاکے) مرتبہ اقبال حسین ص54
15 اٹھارہ سوستاون (دہلی، میرٹھ، اودھ اور روہیل کھنڈ) از خورشید مصطفیٰ رضوی ص286
16 اٹھارہ سوستاون کے راہنما (سوانحی خاکے) مرتبہ اقبال حسین، ص54
17 ایضاً، ص56
18 1857 کا تاریخی روز نامچہ، از عبداللطیف، مرتبہ خلیق احمد نظامی، الجمعیۃ پریس دہلی 1958 ص164,165
19,20 سرگذشت دہلی، مرتبہ: ڈاکٹر درخشاں تاجور، رام پور رضا لائبریری رام پور 2007، ص167-68
21 KEITH YOUNG: Delhi 1857,P 171
بحوالہ اٹھارہ سو ستاون (دہلی، میرٹھ، اودھ اور روہیل کھنڈ) از خورشید مصطفیٰ رضوی ص297
22 جنگ آزادی کے سرخیل، از ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی، ص78
23 سرگذشت دہلی، مرتبہ: ڈاکٹر درخشاں تاجور، ص144
24 اٹھارہ سو ستاون کے راہ نما (سوانحی خاکے) مرتبہ: اقبال حسین۔ ص56-57
25 سرگذشت دہلی، مرتبہ۔ ڈاکٹر درخشاں تاجور، ص236
26,27,28 دلی کی جاں کنی، از خواجہ حسن نظامی۔ ص37,39
بحوالہ جنگ آزادی کے سرخیل از ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی ص74
29 جنگ آزادی کے سرخیل، از ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی، ص74
30 آزادی کی پہلی لڑائی (1857) کے سورما، از جلیس عابدی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 1989، ص38
31 سرگذشت دہلی، مرتبہ ڈاکٹر درخشاں تاجور، ص250
32,33 اٹھارہ سو ستاون (دہلی، میرٹھ، اودھ اور روہیل کھنڈ) از۔ خورشید مصطفیٰ رضوی ص329
34 Sir William Muir,Record of intelligence Deptt-217
بحوالہ جنگ آزادی کے سرخیل، از ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی، ص86
35 جنگ آزادی کے سرخیل، از ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی، ص75
36 قیصر التواریخ، جلد دوم، از سید کمال الدین حیدر نامی منشی نولکشور لکھنؤ 1896، ص313
37 قیصر التواریخ، جلد دوم، از۔ سید کمال الدین حیدر، ص313-14
38 اٹھارہ سوستاون کے راہ نما (سوانحی خاکے) مرتبہ۔ اقبال حسین، ص64
39 اٹھارہ سوستاون کے راہ نما (سوانحی خاکے) مرتبہ اقبال حسین، ص65
40,41 اٹھارہ سوستاون (دہلی، میرٹھ، اودھ اور روہیل کھنڈ) از۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، ص617
42 علمائے ہند کا شاندار ماضی (جلد چہارم) از مولانا سید محمد میاں کتابستان دہلی 1985، ص430-31
جنگ آزادی 1857 (واقعات وشخصیات) از محمد ایوب قادری، ص460
43 جنگ آزادی کے سرخیل، از ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی، ص76
44 اٹھارہ سوستاون کے راہ نما (سوانحی خاکے) مرتبہ: اقبال حسین، ص65
45 وکی پیڈیا۔
46 سرگذشت دہلی، مرتبہ۔ ڈاکٹر درخشاں تاجور۔ ص95-296

■

Darakhshan Tajwar
Kainat, B-34, Tewari Pur
Awas Vikas Colony
Gorakhpur - 273001 (UP)
Mob.: 7007281376

جنگِ آزادی کا ایک عظیم مجاہد

مولوی سید علاؤالدین حیدر

عظیم انصاری

ہندوستان نے ایک طویل جدوجہد کے بعد آزادی حاصل کی اور اس کے لیے ہمارے اجداد نے بے مثال قربانیاں پیش کیں۔ انھوں نے بادِمخالف میں تحریک آزادی کی شمعیں جلائیں اور قید و بند کی بے شمار صعوبتیں جھیلیں، یہاں تک کہ ہنستے ہنستے تختۂ دار پر بھی چڑھ گئے۔ ان جانبازوں کے پرعزم حوصلوں اور امنگوں کی باتیں سن کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔ انگریزوں نے مظالم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اپنائی۔ فرقہ وارانہ ماحول پیدا کیا، منافرت پھیلائی یعنی انھوں نے کچل ڈالنے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن قربان جائیے ان بہادر اور جانباز مجاہدین آزادی کے متوالوں پر، جنھوں نے ہر حال میں انگریزوں اور ان کے ہم نواؤں کا جم کر مقابلہ کیا اور اپنی قربانیاں دیں، جس کی وجہ سے ہمیں یہ آزادی نصیب ہوئی۔

معروف مؤرخ اشوک مہتہ کے مطابق 1857 کی بغاوت صرف ایک سپاہی بغاوت نہیں تھی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ یہ ایک طرح کا آتش فشاں تھا اور اس کے دھماکے سے کچھ دبی ہوئی چنگاریوں کو بھی باہر آنے کا موقع نکل آیا۔ یہاں یہ بات واضح کردوں کہ انگریزوں نے اس جہدِ آزادی کو بغاوت کا نام دے رکھا تھا۔ نوآبادیاتی مورخین اور بعد میں ان کے پیروکاروں کے ذریعے 1857 کی جنگِ آزادی کو مقامی واقعے کا رنگ دینے کی پرزور کوششیں کی گئیں اور انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ شمالی ہندوستان کے میدانی علاقوں سے باہر کے خطوں پر اس کا اثر بہت کم رہا جبکہ بات ایسی نہیں تھی بلکہ پورا ہندوستان آزادی کے جذبے سے سرشار انگریزوں سے برسرِ پیکار تھا۔ 1857 میں لکھنؤ، جھانسی، میرٹھ، کانپور (یوپی) دلی، آرہ (بہار) اور بارکپور (مغربی بنگال) میں جو بغاوت ہوئی اس سلسلے میں اکثر مورخین نہ جانے کیوں چپی سادھ لیتے ہیں۔ اگر ہم بہ نظرِ غائر مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ پورے ملک میں بہادری کی بیشمار مثالیں ملتی ہیں اور ہم ان کی شجاعت اور دلیری کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ حیدرآباد کے مولوی سید علاؤالدین حیدر کی انگریزوں کے خلاف بہادری کی لڑائی ایسی ہی ایک زبردست داستان ہے جسے فراموش کردیا گیا ہے۔ یادگار کے طور پر کچھ اگر باقی بھی ہے تو ان کی قربانیوں کو دیکھ کر ہمیں کچھ کم ہی لگتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی عظیم قربانی کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کا کردار اہم اور نمایاں رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ رہی کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے ہی اقتدار چھینا تھا۔ جنِ آزادی کی ابتدا 1857 میں ہی ہوگئی تھی، اس بات سے زیادہ تر مورخ متفق ہیں۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ 1857 میں میرٹھ کی بغاوت کی خبر جب حیدرآباد پہنچی تو مسجدوں، مندروں، گرجا گھروں اور چوراہوں پر پوسٹر چسپاں نظر آئے جس میں نظام اور عوام سے یہ استدعا کی گئی تھی کہ وہ انگریزوں کے مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں لیکن نظام افضل الدولہ نے اپنے امرا اور سرداروں کے ساتھ انگریزوں کا ساتھ دیا، ورنہ حیدرآباد کی تاریخ جنگِ آزادی کے پس منظر میں کچھ اور ہی ہوتی۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ نظام نے 1800 عیسوی میں ہی انگریزوں سے Subsidiary Alliance کرلی تھی۔ اس زمانے میں طرہ باز خان اور مولوی علاؤالدین جیسے عظیم مجاہد آزادی بھی تھے جو جان و مال کی پرواہ کیے بغیر انگریزوں سے بھڑ گئے۔

مولوی علاؤالدین کا پورا نام سید علاؤالدین حیدر تھا۔ ان کے والد کا نام حفیظ اللہ تھا۔ وہ 1824 میں ریاست حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مبلغ دین اور مکہ مسجد، حیدرآباد کے امام تھے۔ ان کے علم و تقویٰ کا ریاست حیدرآباد میں کافی شہرہ تھا۔ وہ فارسی، اردو اور تیلگو زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں انھیں مولوی علاؤالدین کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ غازی کی طرح جینا اور شہید کی طرح مرنا چاہتے تھے۔ 1857 کی جنگِ آزادی میں ان کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ 17 جولائی 1857 کو حیدرآباد کی برطانوی ریزیڈنسی پر حملے میں ان کا اہم کردار تھا۔ اپنے دوست طرہ باز خان اور دیگر مجاہدین آزادی کے ساتھ مل کر کیا گیا حملہ سالار جنگ کی دھوکہ دہی کے بدولت ناکام رہا۔ جس کے نتیجے میں برطانوی افواج نے انھیں گرفتار کرلیا اور عمر قید کی سزا سنائی۔ ریزیڈنسی پر ہوئے حملے کی خونی کہانی ان کے محب وطن ہونے کا بین ثبوت ہے۔ یہ پہلے قیدی اور مجاہد آزادی ہیں جنھیں انڈمان وتکوبار جزائر میں کالے پانی کی سزا دی گئی۔ ان کی گرفتاری کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔ ریزیڈنسی کے حملے میں پسپا ہونے کے بعد وہ بھاگ کر کنڈا پہنچے اور پھر وہاں سے منگلی پلی پہنچے، جہاں وہ ڈیڑھ سال تک پیر محمد نام کے ایک شخص کے مکان میں روپوش رہے لیکن ایک وبا کے دوران جب انھوں نے بیماری سے شفا پانے کے لیے تعویذ دیا تو ان کی پہچان وہاں ظاہر ہوگئی اور پھر نظام کے فوجیوں کو انھیں گرفتار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ تقریباً 30 سال جیل میں رہنے کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ آیئے ان کے کردار کو اجاگر کرنے سے پہلے حیدرآباد کی تحریک آزادی کا پس منظر بھی دیکھ لیں۔

نظام کے سپاہیوں میں جو ہندوستانی سپاہی تھے، انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کے خلاف بغاوت کردی۔ ان باغیوں میں سب سے نمایاں نام جمعدار چیدا

خان کا تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حیدرآباد پہنچا، نظام کے وزیر میر تراب علی خان نے اسے گرفتار کرلیا اور Resident کے حوالے کردیا۔ چیدا خان کے وفادار ساتھیوں میں جن کے نام تاریخ کے صفحات میں محفوظ رہ گئے ہیں، وہ ہیں شیو چرن، مادھو داس، انوپ سنگھ، کشن داس، لال خان اور قادر خان۔

مولوی علاؤالدین نے 17 جولائی 1857 کو جمعے کی نماز میں مقتدیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ چیدا خان اور اس کے ساتھیوں کی رہائی کی حمایت میں آگے بڑھیں اور اپنی جان کی پرواہ نہ کریں اور یہ بھی اعلان کیا کہ وہ خود بھی شہادت کے لیے تیار ہیں۔ وزیر اعظم سالار جنگ نے ریزیڈنسی پر حملہ نہ کرنے کی تلقین کی لیکن مولوی علاؤالدین اپنے ہمنواؤں کے ساتھ بیگم بازار پہنچ گئے اور روہیلہ رہنما طرہ باز خان کے ساتھ مل کر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں لگ گئے۔ اس بابت مورخ ڈاکٹر ڈی۔ آر سبرامنیم ریڈی نے لکھا ہے کہ طرہ باز خان اور دوسرے باغیوں نے اپنے ہاتھوں میں پرچم لیے ہوئے کوٹی (Koti) میں تعمیر شدہ British Residency کو گھیر لیا اور پانچ ہزار روہیلوں، انگریز مخالف طلبا اور عوام کو لے کر ریزیڈنسی پر حملہ کیا۔ اسی درمیان مولوی علاؤالدین بھی اپنے ہمنواؤں کے ہمراہ جنوب۔مغرب کی طرف پتلی (Putli) سے نکلے اور طرہ باز خان کے ساتھ اس مہم میں شامل ہوگئے۔ واضح ہو کہ طرہ باز خان مولوی علاؤالدین کو اپنا روحانی پیشوا مانتا تھا۔

ریزیڈنسی کی مغربی دیوار کی طرف عبن صاحب اور جے گوپال داس کے گھر تھے۔ ان لوگوں نے اس عظیم مہم کے لیے اپنے گھروں کو خالی کردیے اور شام ساڑھے چھ بجے مولوی علاؤالدین اور طرہ باز خان کے ہمنواؤں نے ریزیڈنسی کو چاروں طرف سے محصور کرلیا اور دیوار کو منہدم کرکے وہ ریزیڈنسی کے باغیچے کے دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔ لیکن وہاں Major Cuthbert Davidson پہلے سے ہی ان کا انتظار کررہا تھا۔ طرہ باز خان اور مولوی علاؤالدین کے ساتھیوں کے پاس ہتھیار کم تھے اس کے باوجود انھوں نے جم کر مقابلہ کیا لیکن انگریزوں کے تربیت یافتہ سپاہیوں کے سامنے ان کا ٹکنا مشکل ہوگیا۔ ساری رات مقابلہ جاری رہا لیکن صبح کے چار بجے ان کو پسپا ہونا پڑا۔ اس حملے میں بہت سارے جانبازوں کو اپنی جانیں گنوانی پڑیں اور نتیجتاً یہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ مولوی علاؤالدین پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہیں تھے بلکہ جام شہادت نوش کرنا چاہتے تھے لیکن طرہ باز خان نے انھیں سمجھایا کہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا دانشمندی نہیں ہے اور یہ بھی کہا کہ اس طرح موت کو گلے لگانے سے شاید کفن بھی نصیب نہ ہو۔ بہتر یہی ہوگا کہ فی الحال پسپائی اختیار کرلیں اور مناسب وقت پر پھر انگریزوں سے ان کے مظالم کا بدلہ لیں۔ 22 جولائی کو طرہ باز خان کو گرفتار کرلیا گیا۔ حیدرآباد کی عدالت میں سماعت ہوئی اور آخرکار ان کو کالا پانی کی سزا سنادی گئی۔ کالا پانی بھیجے جانے سے قبل ہی وہ جیل سے فرار ہوگئے۔ عدالت میں سماعت کے دوران اس سازش میں مولوی علاؤالدین کے کردار کی بابت بار بار پوچھا گیا لیکن طرہ باز خان نے آخر آخر تک لاعلمی کا اظہار کیا اور ساری ذمے داری اپنے سر لے لی۔ 18 جنوری 1859 کو یہ جیل سے فرار ہوئے۔ انگریزوں نے ان کی گرفتاری کے لیے پانچ ہزار روپے کا انعام رکھ دیا۔ آخرکار وہ پکڑے گئے اور ان کو 24 جنوری 1859 کو گولی ماردی گئی۔ مارنے کے بعد ان کی لاش کو دوسرے انقلابیوں کے لیے بطور عبرت ریزیڈنسی کے باہر لٹکا دیا گیا۔ طرہ باز خان اور مولوی علاؤالدین اپنی اس بہادری کے لیے آج بھی حیدرآباد کی تاریخ میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی داستان جدوجہد ملک آزاد کرانے کے پرزور عزم اور حوصلے سے واقف کراتی ہے۔ وہ ایک باوقار مجاہد آزادی تھے۔ ان کے کردار کی بلندی کے قائل خود انگریز بھی تھے۔

> **1857 کی جنگِ آزادی سے لے کر حصولِ آزادی تک کے پورے سفر میں بہت سے مجاہدین نے اہم انقلابی کارنامے انجام دیے مگر ہم ان کے نام اور کام سے واقف نہیں ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ جانباز مجاہدین کے کارناموں سے لوگوں کو واقف کرائیں تاکہ مولوی علاؤالدین جیسے مجاہدین آزادی ماضی کے دھندلکے میں گم ہو کر نہ رہ جائیں۔**

ریزیڈنسی کے حملے کے دوران ایک انگریز کی گولی نے مولوی علاؤالدین کے بازو کو نشانہ بنایا اور ان کا داہنا ہاتھ مفلوج ہوگیا۔ مزید برآں ان کے کاندھے اور پیشانی پر تلوار کے بھی زخم تھے۔ ریزیڈنسی حملے کی پاداش میں گرفتار ہوئے اور انھیں 28 جون 1859 کو Cellular Jail یعنی کالا پانی بھیج دیا گیا۔ انھوں نے قید کے دوران لگاتار عرضی لگائی کہ انھیں خرابی صحت کی بنا پر جیل سے رہائی دے دی جائے لیکن انگریز حکمرانوں نے ریاست حیدرآباد کے دباؤ میں ان کی ایک نہ سنی اور آخرکار یہ عظیم مجاہد 1889 میں ملک عدم کو روانہ ہوگیا۔

مولوی سید مہدی نے 1883 میں اپنی کتاب Hyderabad Affairs (Volume.3) میں مولوی علاؤالدین کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت The Times of India Steam Press, Bombay سے ہوئی تھی۔ ایک اور دانشور جن کا نام فرانسیس زیویرس نیلم ہے، اپنی کتاب The life in Kalapani میں جہاں دوسرے مجاہدین کا ذکر کیا ہے وہیں مولوی سید علاؤالدین حیدر کا بھی ذکر خاص کیا ہے۔ ڈاکٹر ایل. پنڈورنگا ریڈی نے اپنی معرکتہ الآرہ کتاب The unwept and unsung heroes of Telengana میں مولوی علاؤالدین کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔

حیدرآباد اسٹیٹ کمیٹی (1956) کے ذریعے ترتیب دی گئی کتاب The freedom strugle in Hyderabad میں مولوی علاؤالدین کا ذکر نمایاں ہے۔

23 ستمبر 2019 کو ٹائمز آف انڈیا میں ایک مضمون آیا جس کا عنوان Molvi Alauddin, The Other Hero تھا۔ اس مضمون میں مولوی علاؤالدین کی حب الوطنی اور شجاعت کے ذکر کے ساتھ جیل کی صعوبتوں کا بھی ذکر ہے۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ 20 برس کی قید کے بعد دوسرے قیدیوں کو رہا کردیا جاتا تھا مگر مولوی علاؤالدین حیدر کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔

1857 کی جنگِ آزادی سے لے کر حصولِ آزادی تک کے پورے سفر میں بہت سے مجاہدین نے اہم انقلابی کارنامے انجام دیے مگر ہم ان کے نام اور کام سے واقف نہیں ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ جانباز مجاہدین کے کارناموں سے لوگوں کو واقف کرائیں تاکہ مولوی علاؤالدین جیسے مجاہدینِ آزادی ماضی کے دھندلکے میں گم ہوکر نہ رہ جائیں۔ ایسے مجاہدینِ آزادی کی یادیں اور ان کے تذکرے صرف اس لیے ضروری نہیں ہیں کہ وہ اندھیرے میں گم ہوکر رہ جائیں گے بلکہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کی مضبوط روایتوں کو تازگی ملتی رہے۔

■

Azim Ansari
Rahmat Manzil
20/2, B.P. Road, BL No.: 5
Po.: Jagatdal - 743125 (West Bengal)
Mob.:9163194776

پروفیسر محمد شفیع

ایک اردو نواز معروف جغرافیہ داں

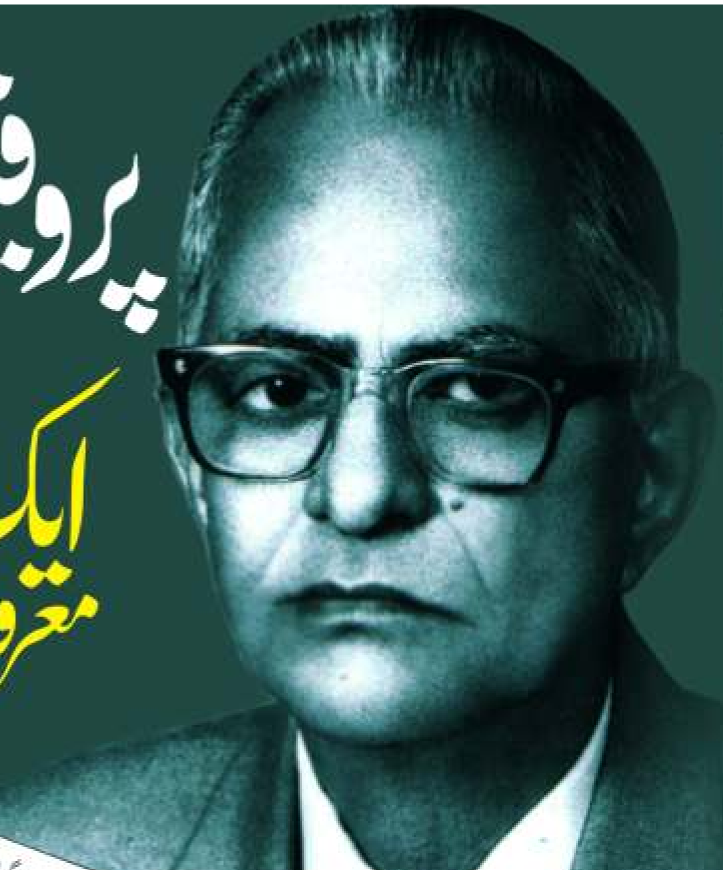

محمد خلیل

گذشتہ 8 دسمبر کو پروفیسر محمد شفیع جو ایک مشہور و معروف جغرافیہ داں تھے۔ 85 سال کی عمر میں علی گڑھ میں رحلت کر گئے۔ ان کی پیدائش ایک متوسط گھرانے میں یکم اگست 1924 میں جونپور (شیرازِ ہند) اترپردیش میں ہوئی۔ ڈاکٹر شفیع ایک طویل عرصے تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ جغرافیہ میں 1948 سے وابستہ رہے اور عرصے تک شعبے سے منسلک رہے اور تقریباً 27 سال تک شعبے کے صدر رہے۔ انھوں نے لندن یونیورسٹی سے جغرافیہ کے زراعتی موضوع پر پی ایچ ڈی کی تھی۔ ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع 'مشرقی یوپی میں زرعی زمین کے صحیح استعمال' پر تھا۔ ان کے تحقیقی مقالے کو ملک و بیرونی ممالک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مقالے پر شائع کتاب 'مشرقی یوپی میں زمین کا استعمال' نے زرعی جغرافیہ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے مشرقی اترپردیش کی زراعت کا جائزہ لیتے ہوئے تقریباً بارہ خود کفیل دیہی علاقوں کا تحقیقی سروے کیا تھا اور ہرگاؤں کی زرعی زمین کی پیداوار جو خوراک پر مشتمل تھی اس کو عالمی معیار پر کیلریز میں تبدیل کیا اور گاؤں کی آبادی سے اس کا تغذیاتی (غذائی فراہمی) رشتہ معلوم کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جن گاؤں میں کیلریز کی دستیابی فی کس فی دن دو ہزار کیلریز یا اس سے زیادہ ہے، لوگ نسبتاً صحت مند ہیں اور جہاں دستیابی دو ہزار کیلریز سے کم ہے وہاں طرح طرح کی بیماریاں جو تغذیہ (غذائی فراہمی) کی کمی یا خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں پائی جاتی ہیں۔ اس تحقیقی مطالعے میں ڈاکٹر شفیع نے ایک اصول دریافت کیا کہ ایک ایکڑ زمین جو زرخیز ہو آبپاشی کی سہولتیں موجود ہوں، اس کے علاوہ دوسری سہولتیں بھی ہوں تو اس سے ایک شخص کو اتنی تغذیہ (غذائی فراہمی) مل سکتی ہے جو اس کو پورے سال صحت مند رکھنے کے لیے کافی ہے۔

زمینی منصوبے کے سلسلے میں ڈاکٹر شفیع نے زرعی زمین کی ترتیب (کلاسی فکیشن) پر زور دیا ہے اور کہا کہ زمین کی تقسیم اس کی زرخیزی اور پیداوار کی بنا پر کی جائے اور مثال کے ذریعے اسے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر یہ تقسیم تین طرح کی زمین الف، ب اور ج ہے اور الف کی زرخیزی ب کے مقابل میں دو ہے اور ب کی الف ہے اور ج کی ب کے مقابلے میں نصف تو اگر ایک کارخانے (مل) کے لیے ایک ہزار ایکڑ زمین کی ضرورت ہے اور ب زمین لی گئی تو ہر اعتبار سے وہ ایک ہزار ایکڑ ہوگی لیکن اگر الف قسم کی زمین لی جائے تو ہر اعتبار سے وہ ایک ہزار ایکڑ ہوگی لیکن اگر الف قسم کی زمین لی جائے تو ہر اعتبار سے وہ ایک ہزار ایکڑ ہوگی لیکن اگر الف قسم کی زمین لی جائے تو بظاہر ایک ہزار ایکڑ ہوگی لیکن اگر الف قسم کی زمین لی جائے تو بظاہر ایک ہزار ایکڑ لی گئی لیکن درحقیقت صرف پانچ سو ایکڑ زمین لی گئی کیونکہ اس کی زرخیزی ب زمین کے مقابلے میں نصف ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر محمد شفیع نے اس بات پر زور دیا کہ زمین جو قوم کا آخری سرمایہ ہے اس کی تقسیم اوپر ذکر کی گئی ہے کے اصولوں پر کرنے کے بعد ان کے نقشے تیار کیے جائیں اور الف قسم کی زمین کو صرف زراعت کے لیے مخصوص کر دینا چاہیے۔

ڈاکٹر شفیع نے زرعی پیداوار کے معیار کو جانچنے کے زاویے متعین کیے ہیں اور زرعی جغرافیہ میں تحقیق کا ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ جرمن جغرافیہ داں ٹھیونن جن کے اصول کے مطابق جیسے جیسے بازار سے دوری ہوتی جاتی ہے زمین کی کاشت کی شدت میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ اس اصول کو اپنے کشادہ (پیٹینٹس) گاؤں کے تحقیقی جائزے کے بعد ڈاکٹر شفیع نے ایک نیا اصول مرتب کیا کہ ہندوستان میں زمین کی کاشت کی زیادتی (شدت) کا انحصار آبپاشی سے نزدیکی ہے خواہ وہ زمین بازار سے کتنی ہی دور ہو۔ اس طرح انھوں نے زرعی پیداوار میں نظام پر زور دیا۔ اس کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کے جسم میں مختلف اعضا مختلف کام انجام دیتے ہیں لیکن ان سب کا مقصد انسان کی صحت کو قائم رکھنا ہے اور اگر کسی ایک کے کام میں فرق آتا ہے تو پورے جسم کی صحت کو نقصان پہنچتا

ہے۔ چنانچہ کاشت کے پہلے کے جتنے مراحل ہیں اور فصل کے تیار ہونے کے بعد جو مراحل ہیں ان سب کو علیحدہ علیحدہ نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ ایک ساتھ دیکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر محمد شفیع کے گراں قدر تحقیقی کام کو دیکھتے ہوئے بین الاقوامی جغرافیائی یونین نے ان کی خوراک کے نظام (سسٹم) کی تحقیق کے لیے ایک عالمی کمیشن کی تشکیل کی اور ان کو اس کا چیئرمین مقرر کیا گیا اس سے ان کی عالمی سطح پر جغرافیائی تحقیقی معیار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

عالمی کلچرل کاؤنسل نے جس کا صدر مقام میکسیکو ہے ڈاکٹر شفیع کو ایک اعزازی ڈپلوما ان کے اہم تحقیقی جغرافیائی کام پر عطا کیا تھا۔ ان کو لندن کی رائل جغرافیائی سوسائٹی نے کاؤنسل کا اعزازی (آنریری) ممبر مقرر کیا تھا۔ جغرافیہ کے میدان میں یہ اعزاز کسی ہندوستانی کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ ماسکو (روس) نے ان کی تحقیقی کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے 'روسی اکیڈمی آف سائنس' کے جغرافیائی انسٹی ٹیوٹ نے ان کو اپنا بیرونی اعزازی ممبر مقرر کیا تھا اور اپنے سب سے بڑے اعزاز 'اکیڈمیشین' سے نوازا تھا اور یورپ کی کئی یونیورسٹیوں نے ان کو اعزازی تمغے بھی عطا کیے تھے۔ امریکہ نے بھی اپنی جغرافیائی سوسائٹی کا ان کو فیلو بنایا تھا۔ اقوام متحدہ (یونائیٹڈ نیشن) کی باڈی اسکیپ نے ان کی خدمات خوراک کی منصوبہ بندی (پلاننگ) کے سلسلے میں طلب کی۔ ان کو یوگینڈا (افریقہ) کی مشہور یونیورسٹی میکریرے نے یونیورسٹی کے سالانہ کانووکیشن کو خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ ان کے خطبے کا موضوع 'تعلیم کی گوناگوں وسعت' کو بے حد سراہا گیا۔ وہ انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی (انسا) کی عالمی تنظیم کے صدر رہ چکے ہیں۔ ہندوستان کی جغرافیائی کونسل نامی 'قومی جغرافیائی تنظیم' کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے انھیں جغرافیہ کے موضوعات پر ملک میں قومی خطبات دینے کے لیے مقرر کیا تھا۔ یونیسکو نے بھی ان کے ایک اہم مضمون پر امان (جارڈن) میں انھیں مدعو کر کے انعام (ایوارڈ) سے نوازا تھا۔ یونیسکو نے انٹرنیشنل سوشل سائنس کاؤنسل کی سائنس کمیٹی کا ممبر بھی ان کو پیرس کی منعقدہ کمیٹی میں نامزد کیا تھا۔

عالمی جغرافیائی یونین نے گلاسکو (برطانیہ) میں منعقدہ تیسویں کانفرنس میں ڈاکٹر شفیع کو جغرافیائی تحقیقی خدمات پر 'لاریٹ آف آرٹز' کے اعزاز سے نوازا تھا۔ وہ پہلے ہندوستانی جغرافیہ داں تھے جسے اس اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ ڈاکٹر شفیع مسلسل 1964 سے زندگی کے آخری برسوں تک عالمی جغرافیائی کانفرنسوں میں سیشن کی صدارت کرتے رہے۔ یہ کانفرنسز لندن، کنگسٹن (امریکہ)، میکسیکو، پیرس، ٹوکیو (جاپان)، کناڈا، فرانس، بوڈاپسٹ (ہنگری)، لیگ (بلجیم)، ٹورنٹو (امریکہ)، ارکاجو (برازیل) اور بیجنگ (چین) میں منعقد ہوئی تھیں۔ اس طرح ڈاکٹر شفیع تقریباً ساٹھ سال تک ایک معروف عالمی شہرت یافتہ جغرافیہ داں کی حیثیت سے علمی دنیا کی اونچائیوں پر جلوہ گر رہے جو آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

بھارت سرکار نے بھی انھیں ان کی علمی تحقیقی خدمات کے لیے 2001 میں پدم شری اعزاز سے نوازا تھا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے 2002 میں انھیں ماحولیاتی خدمات کے لیے 'سرسوتی سمان' عطا کیا تھا۔ پوروانچل یونیورسٹی نے بھی انھیں 'پوروانچل رتن' کے خطاب سے 2003 میں نوازا تھا۔ حیدرآباد کے زمینی تحقیقی مطالعے کے مرکز نے ان کی خدمات کے لیے انھیں 'کلما' ایوارڈ پیش کیا تھا۔ ان کے گراں قدر جغرافیائی تحقیقی کاموں کو ملکی اور بیرونی سطح پر ماہرین نے تفصیلی طور پر ذکر کیا ہے اور وہ جا بجا تحریری طور پر موجود ہے۔ ڈاکٹر شفیع کی جغرافیہ پر چودہ کتابیں ہیں اور تحقیقی مقالوں کی تعداد ایک سو چالیس ہے۔ ڈاکٹر شفیع کی سربراہی میں تقریباً چوبیس لوگوں نے پی ایچ ڈی کی جو آج ملکی سطح پر مختلف یونیورسٹیوں میں پروفیسر اور ٹیچرس کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

یہاں یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد شفیع کو اردو زبان میں بڑی دلچسپی تھی وہ عرصے تک اردو زبان میں سائنسی موضوعات کو مقبول انداز میں یا ہندی سے لکھتے رہے ہیں۔ آپ کے مضامین ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ خاص طور پر 'سائنس کی دنیا' آواز اور افکار اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے مقبول سائنسی مضامین کی طویل فہرست ہے جو اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین میں کچھ ایسے مضامین جو اپنے اہم موضوعات کی وجہ سے نہایت معلوماتی اور دلچسپ تھے ان میں سے کچھ مضامین کے موضوع یہ تھے: مانسون آئے گا، ریموٹ سینسنگ کے مقاصد اور فوائد، آتش فشاں پہاڑ اور ماحولیاتی تباہی، سائنسی مزاج اور ہماری زندگی، ماحولیاتی تحفظ اور زندگی، زلزلے کیوں آتے ہیں، جنگلات کی تباہی اور ماحولیاتی اثرات، ان کے اردو زبان میں معروف شخصیات کے کچھ خاکے بھی شائع ہوئے۔ کئی کتابوں کے تبصرے اور پیش لفظ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حالاتِ حاضرہ پر ان کے تبصرے نشر ہوئے ہیں ان کے انٹرویو کی تعداد متعدد ہے جو اردو نشریات کے ساتھ انگریزی میں خاص طور پر شائع ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان میں بچوں کے لیے بھی مقبول سائنس پر مضمون تحریر فرمائے ہیں مثلاً دنیا کی جھیلوں کی کہانی جسے بے حد پسند کیا گیا۔ یہ دلچسپ سائنسی مضامین جو مقبول سائنس کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو گذشتہ برسوں میں شائع ہوئے ہیں ان کو یکجا کرنا اہمیت کا حامل ہوگا۔ آپ کی مشہور تصنیف 'زرعی جغرافیہ' کو ترقی اردو بورڈ (این سی پی یو ایل) شائع کرچکی ہے جو اردو حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس کتاب کو یوپی اردو اکیڈمی کی جانب سے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آپ کے مضامین آکاش وانی کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہوتے رہے ہیں۔ بی بی سی لندن اردو سروس سے بھی انٹرویو نشر ہوئے ہیں۔ آپ ترقی اردو بورڈ کے مشاورتی پینل میں رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جغرافیہ پینل اور ترقی اردو بورڈ کے جغرافیہ ٹرمینالوجی کمیٹی کے بھی چیئرمین رہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے ایگزیکیٹیو کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ علی گڑھ سے شائع ہونے والے رسالہ 'فکر و نظر' کے مشاورتی بورڈ کے ممبر رہے۔

ڈاکٹر شفیع کی اس گراں قدر تحقیق کے ابتدائی دنوں کا ذکر بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے۔ یہ انکشاف انھوں نے اپنے کسی انٹرویو میں کیا تھا ''1954 میں جب میں نے لندن یونیورسٹی میں ریسرچ کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے درخواست بھیجی، کچھ عرصے بعد خط آیا کہ داخلے کی منظوری ہوگئی ہے لیکن شروع میں داخلہ ایم اے میں ہوگا۔ اگر کام اطمینان بخش ہوا تو اسی تاریخ سے پی ایچ ڈی کے لیے منتقل کردیا جائے گا۔ اس خط کو پڑھ کر مجھے افسوس ہوا کیونکہ میں ایم اے تھا اور میں نے لندن جانے کا خیال چھوڑ دیا لیکن میرے دوستوں نے مجھے سمجھایا کہ یہ ایماندار لوگ ہیں اگر آپ کا کام اچھا رہا تو آپ کو پی ایچ ڈی میں منتقل کردیں گے۔ اس وقت ہوائی جہاز کا چلن نہ

ڈاکٹر شفیع نے زرعی پیداوار کے معیار کو جانچنے کے زاویے متعین کیے ہیں اور زرعی جغرافیہ میں تحقیق کا ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ جرمن جغرافیہ داں برتھونن جن کے اصول کے مطابق جیسے جیسے بازار سے دوری ہوتی جاتی ہے زمین کی کاشت کی شدت میں کمی ہوتی جاتی ہے۔

تھا پانی کے جہاز کا کرایہ کم تھا، اس طرح اٹھارہ دن کا سفر کر کے لندن پہنچا اور وہاں تحقیق کے کام میں لگ گیا۔ لیکن نو مہینے گزر گئے اور منتقلی نہیں ہوئی۔ اس وقت لندن اسکول میں تقریباً پندرہ لوگ جن کا تعلق مختلف ملکوں سے تھا وہاں ریسرچ میں مصروف تھے۔ ایک دن یہ خبر سننے کو ملی کہ تیرہ لوگوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے ملک میں جا کر فیلڈ ورک (زمین کا کام) کر کے چھ مہینے میں لندن واپس آجائیں۔ یہ خبر سن کر بڑی فکر پیدا ہوئی جب کہ اس فہرست میں میرا نام نہیں تھا۔ میں اور میرے ایک ساتھی جن کا تعلق پنجاب سے تھا فیلڈ ورک کر کے گئے تھے پھر بھی شبہ اپنی جگہ موجود تھا۔ میرے دو نگراں تھے ایک لکچرر مسٹر راسن اور دوسرے مشہور جغرافیہ داں سر ڈڈلے اسٹیپ، مسٹر راسن سے دو ہفتے میں ایک بار ایک گھنٹے کے لیے ملاقات ہوتی تھی۔ اس وقت وہ تحقیقی کام کو دیکھتے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ اب دس مہینے ہوگئے تھے لیکن انتظار کے باوجود لندن اسکول سے منتقلی کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ ایک دن مسٹر راسن نے کہا کہ مسٹر شفیع میں تمہارے نام کو پی ایچ ڈی کی منتقلی کے لیے سفارش نہیں کرسکتا۔ میں نے کہا میں ہندوستان کا ایم اے ہوں پھر ایم اے کی ڈگری لے کر کیا کروں گا۔ مسٹر راسن نے کہا کہ جو بھی ہو میں سفارش نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر تم چاہو تو پروفیسر ڈڈلے اسٹیپ سے مل لو۔ جب میں ان کے کمرے سے نکلا تو بے حد فکرمند تھا۔ ہندوستان میں اگر کوئی پروفیسر کسی ریسرچ اسکالر کو ریسرچ کرانے سے منع کردے تو اسے دوسرا پروفیسر ریسرچ کرانے سے قاصر رہتا ہے لیکن میں نے یہ روایت توڑی تھی۔ جب ایک صاحب نے کسی ریسرچ کرنے والے کو ایک سال گزرنے کے بعد تحقیق کرانے سے منع کردیا تھا تو وہ پریشان حال میرے پاس آئے۔ میں نے کہا میں تم کو ریسرچ کراؤں گا۔

کافی پریشانی اور مایوسی میں میں نے اسٹیپ صاحب سے ملنے کے لیے پوسٹ گریجویٹ آفس سے درخواست کی اور وقت طے ہوگیا۔ میں اپنا سارا تحقیقی کام جو فیلڈ ورک کی شکل میں تھا لے کر حاضر ہوا۔ اسٹیپ صاحب میرے کام کو تقریباً ایک گھنٹے تک دیکھنے کے بعد کرسی سے کھڑے ہوگئے اور پوچھا کہ ''کیا یہ سارا کام تم نے خود کیا ہے'' میں نے جی ہاں میں جواب دیا۔ مجھ سے اسٹیپ صاحب نے کہا تمہاری منتقلی تو پی ایچ ڈی میں ہوچکی ہوگی۔ میں نے جواب دیا نہیں۔ راسن صاحب نے منع کردیا۔ یہ سن کر اسٹیپ صاحب نے ٹیلی فون پر تقریباً دس منٹ تک راسن صاحب سے بات کی اور مجھ

ہندوستان میں اگر کوئی پروفیسر کسی ریسرچ اسکالر کو ریسرچ کرانے سے منع کردے تو اسے دوسرا پروفیسر ریسرچ کرانے سے قاصر رہتا ہے لیکن میں نے یہ روایت توڑی تھی۔ جب ایک صاحب نے کسی ریسرچ کرنے والے کو ایک سال گزرنے کے بعد تحقیق کرانے سے منع کردیا تھا تو وہ پریشان حال میرے پاس آئے۔ میں نے کہا میں تم کو ریسرچ کراؤں گا۔

سے کہا کہ آج کی تاریخ سے صرف میں تمہارا سپروائزر رہوں گا اور آج ہی پوسٹ گریجویٹ آفس کو لکھ رہا ہوں کہ جس تاریخ سے تمہارا داخلہ ہوا ہے اسی تاریخ سے پی ایچ ڈی میں داخلہ سمجھا جائے گا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے اور اس طرح میں نے اپنا پی ایچ ڈی کا کام (تھیسس) دو سال کے بعد داخل کردیا۔

ڈاکٹر شفیع نے اپنے انٹرویو کے دوران ایک اور اہم واقعے کا ذکر کیا ہے جس نے ان کے جسم میں کپکپی کی کیفیت پیدا کردی میں (شفیع) کارٹوگرافیک لیب میں کام کر رہا تھا اور کچھ نقشے بنا رہا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی کارٹوگرافک لیب کی انچارج لڑکی نے مجھ سے کہا کہ پروفیسر اسٹیپ ٹیلی فون پر ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ وہ شخص (اسٹیپ) جس کو لندن میں پکڑنا مشکل ہے جس کے لیے دنیا کے مختلف کونوں سے دعوت نامہ آتا رہتا ہے اور پھر اس کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ مجھ سے ٹیلی فون پر بات کرے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت خاص بات ہے۔ یقین کیجیے کہ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹیلی فون اٹھایا اور خدا کو یاد کیا۔ پروفیسر اسٹیپ نے کہا ''مسٹر شفیع میں نے تم کو اس لیے ٹیلی فون کیا ہے کہ میں اپنا صدارتی خطبہ بین الاقوامی جغرافیائی کانگریس کے لیے لکھ رہا ہوں اور تمہاری تھیسس سے کچھ مواد (میٹر) لینا چاہتا ہوں کیا تمہاری اجازت ہے۔'' یہ ایمانداری اور دیانت داری کا عالم تھا۔ ایک عالمی شہرت یافتہ جغرافیہ داں پروفیسر اسٹیپ سے میں نے کہا یہ تو میری عزت افزائی ہے۔ راسن صاحب کا منع کرنا جو میرے لیے اس وقت بہت مایوسی پیدا کرنے والا تھا اللہ نے اس میں میرے لیے خیر رکھا تھا۔ جو بات میرے لیے دیکھنے میں نقصاندہ تھی اصل میں وہی بات میرے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔

انٹر کرنے کے بعد مجھے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اس زمانے میں وہ بہت مشہور و معروف یونیورسٹی مانی جاتی تھی اور اس کا سکہ پورے ملک میں چلتا تھا۔ خاص طور پر انگریزی شعبہ بہت مشہور تھا۔ اس شعبے کے پروفیسر دیب اور دستور صاحب بے حد مشہور تھے اور طالب علم ان کی ہی کلاس میں جانا چاہتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ کسی طرح ان کے سیکشن میں داخل ہوجائے۔ میری بھی یہ خواہش تھی۔ جب لسٹ نکلی تو میرا نام ہری ونش رائے بچن کے سیکشن میں تھا۔ بچن صاحب کیمبرج سے اسی سال پی ایچ ڈی کر کے واپس آئے تھے اور ہندی کے مشہور شاعر تھے۔ کلاس کے لڑکوں نے مجھ سے کہا زندگی چوپٹ اب دو سال تک ہری ونش جی سے گیت سنو لیکن وہ محنتی استاد تھے بہت پڑھ کر گھر سے تیار ہو کر آتے تھے۔ میرے نزدیک وہ ایک مثالی استاد تھے اور کلاس میں ایک دن بھی اپنی شاعری نہیں سنائی۔ وہ انگریزی تنقید کے بادشاہ تھے، فلسفے کے ماہر تھے۔ میں نے بہت کچھ ان سے سیکھا۔ آدمی سخت تھے اور شروع کے چار ہفتے میں ایک دن بھی ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ ششماہی امتحان ہوا ،چھٹی ہونے پر گھر آ گیا۔ یونیورسٹی کھلنے پر آنے میں دیر ہوگئی تھی۔ یونیورسٹی گیٹ پر کچھ طلبہ ملے جو مجھے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ معلوم ہوا بچن صاحب ساری کاپیاں لائے تھے اور لڑکوں میں تقسیم کردیں۔ دوسرے دن وہ میری کاپی لائے کہا یہ صاحب کھڑے ہوجائیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بخشنے والے آدمی نہیں ہیں۔ دیکھیے کیا سزا ملتی ہے۔ اب ایک ایک سوال اور اس کا جواب پڑھتے گئے اور لڑکوں سے کہا اسے ماڈل (عمدہ) تصور کرو اور اس کاپی کو غور سے پڑھو۔ کاپی لڑکوں میں گھومی اور مجھے نہیں ملی۔ اتنا ضرور ہوا کہ بچن صاحب مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے۔ ان ابتدائی واقعات سے ان کی علمی قابلیت اور صلاحیت کا اندازہ ہوجاتا ہے جو مستقبل میں ان کو ترقی اور شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔

اپنے انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر رہتے ہوئے یونیورسٹی کے طالب علموں میں بے حد عزت کے ساتھ مقبول رہے۔ وہ اچھے طالب علم کی ترقی کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ مرحوم ڈاکٹر صاحب بے حد خوش اخلاق، مددگار لائق استاد بہترین منتظم اور عالمی شہرت یافتہ جغرافیہ داں اور سائنسداں تھے۔ آپ کا شمار عالمی سطح پر مستند ترین جغرافیہ داں میں ہوتا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی موت نے جغرافیہ کے میدان میں ایک خلا پیدا کردیا ہے۔

■

Mohammad Khalil
Ex Scientist
H-51, Dr. Iqbal Lane
Batla House, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Tel.:011-26985491

اسلم عمادی

شمس الرحمٰن فاروقی
ایک دُرِ نایاب

”یہ نابغۂ روزگار، ماہر علم وادب، درجہ اوّل کا مدیر، تنقیدنگاری کا سرخیل، فن شعر کا پارکھ، افسانہ، ناول نگاری اور داستان گوئی کا بے بدل نباض، تحریر و تقریر، بحث و تدلیل و تحقیق کا اُستادِ بے مثل 25 دسمبر 2020 کو وفات پاگیا۔ ان کے انتقال سے میں ایک شفیق مہربان ماہر ادب دوست سے محروم ہوگیا۔ہیہات۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔“

شمس الرحمٰن فاروقی ایک نابغہ ،روزگار تھے۔تحریرو تصنیف وتالیف کی کون سی نوع ہے جہاں اُنھوں نے اپنے قلم سے معرکتہ الآرا نقوش نہیں ثبت کیے ہیں۔اُردو اَدب کے ارتقا، ترویج، عالمی شہرت، معیار میں تازہ کاری، قدیم وجدید کے مباحث، مراسلاتی معرکہ آرائی، تردید و تنسیخ اور بہت سے عناوین اُن کی ذات سے متعلق ہیں۔

یہ نابغۂ روزگار، ماہر علم واَدب، درجہ اوّل کا مدیر، تنقیدنگاری کا سرخیل، فن شعر کا پارکھ، افسانہ، ناول نگاری اور داستان گوئی کا بے بدل نباض، تحریر وتقریر، بحث و تدلیل وتحقیق کا اُستادِ بےمثل 25 دسمبر 2020 کو وفات پاگیا۔ان کے انتقال سے میں ایک شفیق مہربان ماہرادب دوست سے محروم ہوگیا، ہیہات۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

میرا اور فاروقی صاحب کا تعلق 1967 میں شروع ہوا۔ 1971 میں جب انھوں نے شب خون میں میری غزل جس کا مطلع ہے۔

”اتنے گہرے ساگر میں مدتوں سے پیاسا ہوں
بے پناہ سازش ہوں ، دلفریب دھوکا ہوں“

شائع کی۔اس واقعہ سے اہلِ حیدرآباد میں کچھ لوگ مجھے پہچاننے لگے۔پھر تو انھوں نے میری کئی تخلیقات اور مراسلات شائع کیے۔میرے لیبیا اور کویت کے قیام کے دوران بھی ان سے مراسلت رہی۔ایک خط میں انھوں نے مجھے ڈاکٹر عمادی کے نام سے خطاب کیا، تو میں نے اُنھیں لکھا کہ محترم میں انجینئر ہوں ڈاکٹر نہیں۔ جواباً اُنھوں نے لکھا کہ آپ اتنے برسوں سے اَدب اور انجینئرنگ میں کامیاب رہے ہیں کہ میں آپ کو ڈاکٹر ہی سمجھتا ہوں (یہ ان کی محبت تھی!!)۔شب خون کے معرکہ آرا انتخاب میں انھوں نے بہ حسن وخوبی میری نظمیں شامل کیں۔ جو میرے لیے باعث افتخار ہے۔اپنا مجموعہ ’آسماں محراب‘ بھجوایا تو اس پر مجھے یوں خطاب کیا: ”محبِّ ’شب خون‘ برادرم اسلم عمادی کی نذر“۔ ایک اچھے انسان، ان تھک جہد کرنے والے، معیار کے شائق، نئی فکر اور ایجاد کو فروغ دینے والے فاروقی صاحب اُردو اَدب کے آسمان پر ایک تابندہ ستارے کی طرح درخشاں رہیں گے۔فاروقی مرحوم کو یاد کیا جائے تو اس ضمن میں سب سے اہم رول ان کے رسالے ’شب خون‘ کا ذکر لازم وملزوم کی طرح ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ’شب خون‘ کا اجرا 1965 کے اطراف ہوا۔ایک اَدبی رسالے کا یہ عنوان بڑا عجب سا اور چونکا دینے والا لگا۔’شب خون‘ کی ترکیب میں نے جلال الدین خوارزم شاہ کی جنگوں کے تناظر میں پڑھ رکھی تھی (غالباً صادق حسین سردھنوی یا نسیم حجازی کے کسی ناول میں)۔حیدرآباد میں ان دنوں عابد شاپ پر ’آصف علی‘ کی بک اسٹال پر ایسے اَدبی معیاری رسائل ملتے تھے۔میرا پاکٹ منی کم تھا، میں انجینئرنگ کا طالب علم تھا، پھر بھی بصد اشتیاق ’شب خون‘ کا پابند گاہک بن گیا۔رسالہ دیدہ زیب تھا، عناوین دل چسپ ، قدیم وجدید وجدید تر کی بحث، اشعار کی بے مثل تشریح، نمائندہ شاعروں،

افسانہ نگاروں اور ناقدین کی تخلیقات سے آراستہ اور مجھ جیسے اُردو اَدب میں نئی آوازوں کے شائقین کے لیے تو یہ انمول تحفہ تھا۔

اُن دِنوں ایک سے ایک اَدبی رسائل کی بہار تھی، حیدرآباد سے صبا، پونم، پیکر، دلی سے آجکل، تحریک (سماجی رسائل میں: شمع، بانو، شبستاں، روبی، بیسویں صدی، سریتا)، بنگلور سے سوغات، لکھنؤ سے کتاب، پٹنہ سے مریخ، گیا سے آہنگ، مورچہ اور نہ جانے کتنے ہی رسائل کے نام یاد آرہے ہیں... لیکن شب خون کا انداز اور معیار ہند و پاک کے جدید شعر و اَدب کے چاہنے والوں کا دلربا بن گیا۔

1967 کے دوران ادارہ شب خون نے جدید شاعری کی ایک انتھالوجی 'نئے نام' شائع کی۔ اس کتاب کا کلیدی مضمون 'ترسیل کی ناکامی کا المیہ' جسے شمس الرحمٰن فاروقی نے تحریر کیا تھا۔ کیا معرکتہ الآرا مضمون تھا! اَدبی ماحول میں بجلی سرایت کرگئی، مضمون خوب تھا تحریر میں عمدہ زبان، پیش کردہ نکات کی پرزور اور کچھ حد تک تشفی بخش وکالت، مثالوں کے ذریعے زاویے موڑتے ہوئے حوالے؛ لب و لہجے میں معیاری تدبر کے استعمال نے

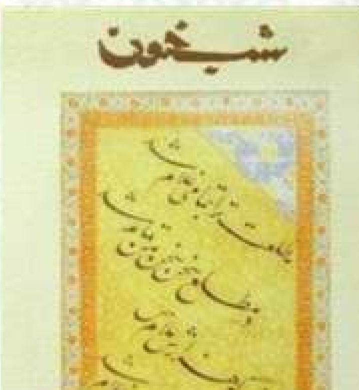

معیار بلند رکھا۔ غرض بہت متوازن مقالہ تھا، جس نے اکثروں کو انگیخت کیا تو وہیں کچھ حلقوں میں اینٹی شب خون فکر بھی پیدا ہوگئی۔ عموماً یہ فکری سطح پر کم اور ناراضگی کی بنا پر زیادہ تھا۔ یہ موضوع الگ تفصیل چاہتا ہے۔

غرض 'نئے نام' میں نئی شاعری کی قوی تر نمائندگی تھی۔ بہت سے نمایاں جدید شاعری کے نام اس میں شامل تھے شمال و جنوب، مشرق و مغرب سب کی نمائندگی تھی۔ دکن کے بہت سے واردان باغ اَدب نے اپنے کلام کو باوقار طور سے ملک کے ممتاز ناموں کے درمیان شانہ بہ شانہ، ایک ہی صف میں دیکھا تو مسرت سی دوڑ گئی۔ اُردو کے قلمدانوں کے چودھری اور جاگیردار، پرانی شاعری کے کرتا دھرتا، کمزور سانس لیتی ہوئی ترقی پسندی اس کاری ضرب سے تاب لینے کی جستجو میں لگ گئے۔

کچھ بھی ہو اَدبی ماحول میں ایک مثبت سی ہل چل تو ہوگئی: بقول شاعر

''مری جاں
اس قدر اندھے کنویں میں،
بھلا یوں جھانکنے سے کیا ملے گا...
کوئی پتھر اٹھاؤ اور پھینکو
اگر پانی ہوا تو چیخ اٹھے گا...!!''

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام 'گنج سوختہ' میں بدرچاچ کے اس بیان کو نقل کیا ہے کہ ''جب کسی نے اس سے کہا کہ اُس کی شاعری مشکل سے دو آدمیوں کو محظوظ کرسکتی ہے، تو اُس نے کہا کہ وہ انھیں دو آدمیوں کے لیے لکھتا ہے۔'' یہاں پر اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ فاروقی صاحب کے انقلابی مضمون کا اہم نکتہ یہ تھا کہ زبان و بیان اظہار مطلوب کے لیے ایک غیر مکمل واسطہ ہے۔ اس مضمون میں فاروقی صاحب نے بے حد مہارت کے ساتھ ترسیل کے موضوع کا جائزہ لیا ہے اور ملخ ترسیل کے مختلف زاویے پیش کیے ہیں۔ ایسے بے مثل رجال اُردو اَدبی دنیا میں صدیوں میں آتے ہیں، فاروقی کی عمر کا تقابل ان کی کتابوں، تحریروں اور اَدبی خدمات کی طویل فہرست کے تناظر میں کیا جائے، تو صحیح معنوں میں 'اچنبھا' ہوتا ہے۔

میرے کتب خانے اور مطالعے میں ان کی بہت سی کتابیں آئیں، یادداشت پر زور ڈال کر جو نام یاد آئے ہیں، وہ ہیں:

تنقیدی کتب: شعر، غیر شعر اور نثر، تفہیم غالب، غالب پر چار تحریریں، اُردو کا ابتدائی زمانہ، تنقیدی افکار، لغات روزمرہ، لفظ و معنی، شعر شور انگیز، عروض آہنگ اور بیان، انداز گفتگو کیا ہے، اثبات و نفی، افسانے کی حمایت میں، خورشید کا سامان سفر، ساحری، شاعری، صاحبقرانی، صورت و معنی سخن، تعبیر کی تشریح۔

مجموعہ کلام: سبز اندر سبز، گنج سوختہ، چار سمت کا دریا، آسماں محراب۔

ناول / افسانہ: سوار اور دوسرے افسانے، کئی چاند تھے سر آسماں

میری نگاہ میں ایسے نادر ادیب انعام و اعزاز سے برتر ہوتے ہیں۔ جب ان کو 1996 میں سرسوتی سمان ملا تو اُردو حلقے میں مسرت پھیل گئی، انھوں نے بذات خود مجھے اس خوش خبری کی اطلاع دی، یہ ان کا بڑا پن تھا۔ اور بہت سے اعزازات ان کو ملے جن میں ڈی لٹ، پدم شری (2009)، ستارہ امتیاز (2010 پاکستان) قابل ذکر ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا مطالعہ وسیع تھا اور فن سخن، ایجاد، علامتی صورت گری اور لغت دانی سب میں بے مثال۔ وہ بعض اوقات لفظ پرستی کے سنگلاخ رجحان کی طرف نکل جاتے اور ارادی ابہام سے شاعری کو خوب صورت بھی بنا دیتے۔

ان کی نظمیں بلا شبہ اچھی، معیاری، درجہ اول کی عالمی شاعری میں ضرور شمار ہوں گی، یوں تو بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں، پھر بھی چند نظمیں جو مجھے پسند ہیں، ان کے عنوانات ہیں: مناجات، کہ پیش آمدم بر پلنگے سوار، بیت عنکبوت، شیشہ ساعت کا غبار، نامکمل سوانح حیات، قصیدہ شہر آشوب، رات، شہر اور اس کے بچے، مورنامہ

میں مثال کے طور پر مناجات کے پہلے استانزہ کو پیش کرتا ہوں، دیکھیے کس طرح شاعر اللہ جل جلالہ سے دعا کے لیے رجوع کرتے ہوئے، ماحول عجیب سی تشنگی اور کیفیت انتظار کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

''اس سے پہلے کہ
نقاب گل و گل زار میں پوشیدہ کہیں
اپنے پیوند میں جبہ صد رنگ میں ملبوس
مسخرہ موت کا میرے چمنستان در و بام پہ کالک لیپے...''

فاروقی نے سارے ناتج مناظر بھی ایسے دکھائے کہ قاری، اس نظم کے لفظی اور فکری طلسم میں غرق ہوکر رہ جاتا ہے۔ اپنی ہر نظم میں وہ بہت چابک دستی سے ایسا ماحول تخلیق کردیتے ہیں کہ قاری مناظر و افکار کی بھول بھلیاں بلکہ بارہ دری / ارژنگ میں گم ہو جاتا ہے۔ اب اس استانزہ ہی کی چار سطروں میں دیکھیے کہ کس طرح کئی منظر پارے، ڈرامائی لمحے، اور تخلیق کردہ بصری صورتیں مستعمل ہوئی ہیں۔

نقاب گل / نقاب گلزار، پیوند، جبہ صد رنگ، موت کا مسخرہ، چمنستان اور در و بام

شاعر قاری کو کہاں کہاں کے تماشے اور کن کن کیفیات سے گزار رہا ہے۔ سوچتے رہ جایئے، داد بھی دیتے رہیے۔

اسی طرح ایک اور نظم 'شیشہ ساعت کا غبار' کی آخری سطروں کی جھلک نذر قارئین ہے۔

شب برات

آتشیں تماشوں کا سماں، اٹھا کے میری بچیوں نے ناگہاں

پچاس پیسے کے انار کے لبوں پر ایک قطرہ نار رکھ دی
خاک کو یہ گرم بوسہ کب نصیب تھا!
انار میں جو قید تھا، وہ ذرہ ذرہ صید تھا
وہ جن ابل پڑا
سیاہیاں: سفید، سرخ، نیلگوں طیور سے چمک اٹھیں!!!

قارئین اس گوشے میں کئی عام زندگی کی علامتیں نوٹ کرلیں:

- شب برات (یاد رہے کہ اب شب برات میں آتش بازیوں کا رواج معدوم ہو چکا ہے)،
- میری بچیاں (ذاتی تجربہ سے ربط)،
- پچاس پیسے، گرم بوسہ، جن وغیرہ۔

ان علامتوں کو اپنے احساسے کے تصوراتی پس منظر میں جس طرح فاروقی صاحب نے چابک دستی سے ضم کر دیا ہے۔ وہ کوئی فن کا ماہر ہی کر سکتا ہے۔ ہم تو داد ہی دے سکتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے دلنشین غزلیہ اشعار کی چند مثالیں پیش ہیں۔

سطح پہ تازہ پھول ہیں، کون سمجھ سکا یہ راز..
آگ کدھر کدھر لگی، شعلہ کہاں کہاں گیا

کرب کے اک لمحہ میں لاکھ برس گزر گئے...
مالک حشر کیا کریں عمر دراز لے کے ہم

ان کا خیال ہر طرف، ان کا جمال ہر طرف
حیرت جلوہ روبرو، دست سوال ہر طرف

مجھے سب کچھ سکھا کر کاٹ ڈالے گا زباں میری
نشانی میں وہ آنکھوں سے تکلم کا ہنر دے گا

ادھر سے دیکھیں تو اپنا مکان لگتا ہے
اک اور زاویے سے آسمان لگتا ہے

کاغذ قلم ہیں سامنے لکھتا گیا ہوں بھول
دامن میں جوش اشک سے ڈھیروں پڑا ہے پھول

میں دریا ہوں مگر کوزے میں ہوں بند
مری تقدیر میں بہنا نہیں ہے

ان کی غزلیہ شاعری کے مطالعے سے جو مندرجہ ذیل تاثرات ذہن میں آتے ہیں:

- انھوں نے عموماً رواں زمینوں کا انتخاب کیا کہ شاعری ترنم یا لحن میں کمزور نہ ہو۔
- عمومی طور پر موضوعات ان کی ذات پر مرکوز ہیں وہ اکثر اشیا اور تجربوں کو اپنی ذات سے منسلک / متعلق کر کے دیکھتے ہیں۔
- ان کے بہت سے لفظی استعمالات، مصطلحات، لفظی مرکبات اظہار کے واسطے سے ان کے داخلی منظرنامے سے قریں تر لگتے ہیں
- نئے اوزان اور تجرباتی بحور میں جو غزلیں ہیں، نمایاں تو ہیں لیکن کوئی خاص نقش ثبت نہیں کرتیں۔
- غزلیہ کلام میں 'آمد' اور 'آورد' دونوں کی مثالیں مل جاتی ہیں۔

اسی طرح ان کی شعری تخلیقات (نظم، غزل، رباعی، قطعات، ابیات) سب اپنی اپنی انفرادی نہج اور ڈکشن کی آئینہ دار ہیں۔ اور قاری انکی قدر و قیمت اپنے مقرر کردہ پیمانے کے مطابق کرسکتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی جس تندہی، خلوص اور باریک بینی سے تنقید و تبصرے کے میدان میں جولانی طبع دکھاتے تھے اُس سے اَدب کا ہر رسیا واقف ہے۔ فاروقی کے اَنداز تنقید میں حسب ذیل چھ خصوصیات کی ترکیب ہے:

1 تجرباتی نگاہ سے ہر نکتہ کی شناخت اور تحقیق۔
2 دعویٰ اور دلیل کا توازن
3 مخالف نقطۂ نظر کا مقابلہ اور شدت سے تردید۔
4 نظریاتی رجحان اور اخذ و تحصیل سے افادہ۔
5 ہیئت کی تفہیم اور ہیئتی نظام پر خصوصی نگاہ۔
6 زبان اور تراکیب کا جائزہ

ان کے مضامین کا انداز منظم ہوتا ہے۔ پہلے وہ ابتدائیہ کے طور پر زیر بحث بات کی اہمیت اور مطالب پر نظر ڈالتے ہیں۔ پھر ان تمام اراکین کا جائزہ لیتے ہیں جو بحث کے لیے ضروری ہوں۔ پھر ایسے مفروضات کو لیتے ہیں جو اُن مضامین کے مطابق مقبول ہوں۔ ان مفروضات اور نظریات کی روشنی میں وہ ایک خاص زاویے کی وکالت کرتے ہیں اور جتنے بھی مخالف نظریات ہوں ان کو شدید طور پر رد کر دیتے ہیں۔ اس تردید میں بھی بلا کا مدلل انداز اور ذہانت کی شعلگی ملتی ہے۔ فاروقی نے ہیئت اور لفظیات کو بہت اہمیت دی ہے۔ وہ الفاظ کے بناؤ سنگھار، تراش و خراش پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

فاروقی کا انداز بیان ابتداً بہت تیز و ترش تھا جس سے تازگی جھلکتی رہتی ہے۔ ان کی تحریروں میں 'اَدب کے غیر اَدبی معیار' ایسا ہی مضمون ہے۔ اس قسم کے مضامین میں تحقیقی صلاحیت زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے بہ شرطیکہ انداز تحریر صحافتی نہ ہو جائے۔ آہستہ آہستہ فاروقی کے لہجے میں سنجیدگی پیدا ہوگئی اور جھکاؤ تجزیاتی اور کاملیت پسند گفتگو کی جانب ہوگیا ہے۔

فاروقی کی تنقیدی زبان شستہ اور معنی خیز ہے۔ وہ قاری کو رہ رہ کر نئے رخوں کی جانب موڑ دیتے ہیں۔ ایک مرکزی فکر کے تحت فاروقی ایک مباحثے کو ترتیب دیتے ہیں۔ لیکن وارث علوی کی طرح ہر اس بات کو جو جملے میں آ گئی ہو ٹھونک ٹھونک کر بجاتے نہیں بلکہ کم الفاظ میں مختلف عکس رخوں کا جائزہ لیتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے پاس تجزیاتی نکات کی کمی نہیں ہوتی۔ اس طرح ایک طویل بیان سادہ اور سلیس نہیں رہ جاتا ہر جملے میں ارتکاز پیدا ہو جاتا۔

فاروقی کے پاس بلا کی خود اعتمادی اور بے باکی تھی اور خوش اسلوبی کے ساتھ وہ بات کو صاف اور بہترین طریقے پر پیش کرنے کے شائق تھے۔ اَدبی تنقید میں شخصی عناصر اور اَخلاقیاتی فلسفے کو نہیں الجھاتے تھے۔ الفاظ کی پرکھ اور معانی کی تفہیم میں وہ زیر بحث ادیب سے ایک مختلف روپ میں ملتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فاروقی ادیب کو کم تر سمجھتے ہیں لیکن اَدب کی پرکھ کے لیے ایک غیر ملوث ذہن کی جس شدت سے ضرورت ہوتی ہے اس کا انھیں مکمل احساس ہے۔ اسی لیے وہ ادیب سے مرعوب ہو کر نہیں لکھتے اور نہ ہی وہ موضوع اَدب پر بحث کرنے سے جان بچاتے۔ ہر دقیق موضوع پر سلجھے ہوئے انداز میں اپنی بات کہتے تھے۔

مثالیں دینے کا رویہ فاروقی تنقید کا ایک اہم رخ ہے۔ وہ اُردو افسانے پر بات کرتے کرتے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن افسانے کا ایک باذوق اور مکمل قاری کی طرح جائزہ لیتے ہیں۔ اکثر مجھے یوں لگا ہے کہ فاروقی صاحب اختیاری (Intentional) طور پر عجمیت اور مغربیت کی جانب جھکاؤ پیدا کرتے۔

شعر غیر شعر اور نثر، افسانے کی حمایت میں ن۔م۔ راشد صوت و معنی کی کشاکش میں اور اکثر مضامین اسی مفروضے پر مبنی ہیں کہ قاری اَدب کے بین الاقوامی نظریات سے نہ صرف واقف ہے بلکہ ہر زبان کا قاری ہے اور ایسی ہی صورت میں قاری ان مضامین میں شریک ہو سکتا ہے۔ ان کے اکثر مضامین معرکتہ الآرا ہیں خصوصاً علامت کی پہچان، شعر، غیر شعر اور نثر، نظم اور غزل کا امتیاز، یے ٹس، اقبال اور ایلیٹ، تبصرہ نگاری کا فن، غالب اور جدید ذہن اور 'برف اور سنگ مرمر'۔

ان کے اکثر مضامین ان عنوانات پر ہیں جن پر بہت کم اُردو نقادوں نے کھل کر بات کی۔ خصوصاً اس وضاحت کے ساتھ... اس کی ایک عمدہ مثال ''صاحب ذوق قاری اور شعر کی سمجھ'' ہے۔

فاروقی کی ہر تحریر باوزن اور صریح فکر سے مالا مال ہے۔ ان کی ہر کتاب کا انداز متوازن اور معلوماتی ہے۔ سطحی اور تعلیمی لہجے کی بدرنگی کہیں نہیں ملتی۔ ہر مضمون میں

خوش بیانی کی رطوبت محسوس ہوتی ہے۔ زبان میں فاروقی کے لہجے کی صداقت اور ذاتی تجربے کی جھلک ان کی تحریروں میں رنگ بھر دیتی تھی۔ مثال کے طور پر سلیمان اریب پر ان کے مضمون ''کن حرفوں میں جان ہے میری'' کا یہ اقتباس دیکھیں:

''1953 سے 1958 تک میں انگریزی زیادہ پڑھتا رہا تھا۔ اُردو اَدب میں جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا تھا اُس کی خبر زیادہ نہ تھی۔ جب خود شاعری اور تنقید نگاری شروع کی تو محسوس ہوا کہ اس جنس ارزاں کا کوئی بھی خریدار نہیں ہے۔ نظمیں، غزلیں، مضامین یا تو کوہ ندا میں جانے والے مسافروں کی طرح 'خبرش باز نیامد' کا افسانہ سنانے لگے، یا کبھی کبھی ایک آدھ معذرت نامہ مل جاتا۔ پاکستانی رسالوں میں شائع کرانا اس وقت کسی نہ کسی وجہ سے میرے لیے ممکن نہ تھا، اس کے باوجود وہاں بھی کوشش کر دیکھی، صدائے برنہ خاست کا معاملہ رہا۔ مجھے اپنی صلاحیتوں پر کبھی بہت زیادہ بھروسہ نہیں رہا۔ کوئی چیز لکھ لینے کے فوراً ہی بعد تشکیک اور تذبذب کا عمل شروع ہو جاتا ہے لیکن تذبذب اور تشکیک بھی غنیمت ہے، کیوں کہ اکثر تو یہ بھی ہوا ہے اور اَب بھی ہوتا ہے کہ مجھے یقین کامل ہو گیا ہے کہ جو کچھ لکھا ہے محض بکواس ہے۔ اس دو دھاری تلوار پر سفر کرنا میرے لیے کس قدر مشکل رہا ہوگا، یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

یہ مضمون فاروقی صاحب نے اس حقیقت کو منشرح کرنے کے لیے لکھا کہ کس طرح سلیمان اریب نے اپنے رسالے ''صبا'' میں انھیں بہ شوق شائع کیا اور ان کی ہمت افزائی کی۔

فاروقی صاحب کے تبصرے اپنی مثال آپ تھے، کتاب کی وقعت و معیار کا وہ بڑی آزادی سے جائزہ لیتے، کسی تکلف اور تصنع سے بلند ہو کر۔ انھوں نے بہت سارے تبصرے لکھے اور پابندی کے ساتھ لکھے۔ اپنے متفق اور ہم مزاج ادیبوں کے معاملہ میں ان کے تبصرے، تعارف اور قدر و قیمت کے تعین کے معاملے میں عمدہ تجزیوں کی مثالیں ہیں چاہے وہ کمار پاشی ہوں، یا قاضی سلیم، شہریار، بلراج کومل، وزیر آغا، عمیق حنفی، باقر مہدی، انتظار حسین، بشر نواز، یا ایسے ہی نمائندہ جدید شعرا۔ ایسے تبصروں میں تخلیقات و تالیفات کا دلآویز جائزہ بھی ہوتا اور موضوعات کی تشریح بھی۔ ایسے تبصرے واقعی ذہن سازی اور سمت شناسی کی مثال تھے۔

مثال کے طور پر قاضی سلیم کے مجموعے 'نجات سے پہلے' پر ان کے تبصرے کا یہ گوشہ ملاحظہ فرمایئے:

''کوئی کوئی شاعری ایسی ہوتی ہے جس کو پڑھ یا سن کر فن کارانہ مہارت، قوت ایجاد، ریزہ ریزہ مرصع کاری کا شدید تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ایسی شاعری میں شعر گوئی کی جگہ شعر سازی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ افتخار جالب کی ہر نظم اس کی اچھی مثال ہے۔ کوئی کوئی شاعری ایسی ہوتی ہے جس کا تاثر اس کا بالکل اُلٹا ہوتا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ پوری کی پوری نظم ایک ہی وقت میں کسی غنائی یا موسیقیاتی ہیئت کی شکل میں آپ سے آپ خلق ہو گئی ہے۔ قاضی سلیم کی ہر نظم اس کی اچھی مثال ہے۔ نظم گوئی ہو یا نظم سازی دونوں اپنی اپنی جگہ بالکل مناسب اور صحیح طریق کار ہیں، نہ یہ اس سے بہتر ہے نہ وہ اس سے بدتر۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ جو نظم وجود میں آئی ہے وہ اپنے معنی و آہنگ کے اعتبار سے ایک مکمل وجود ہے کہ نہیں۔ نظم سازی اور نظم گوئی کا فرق صرف ذہنی ساخت کا فرق ہے۔ افتخار جالب اور قاضی سلیم میں وہی فرق ہے جو ایلیٹ اور والیس اسٹیونز میں ہے۔''

یوں تو کئی ماہرین نے غالب شناسی کے جادو جگائے ہیں۔ 'تفہیم غالب' میں فاروقی کا انداز نادر اور قیمتی ہے۔ الفاظ و تراکیب کی تحلیل، شعر کے داخلی عناصر تک رسائی کی جستجو، لفظیات میں چھپے معانی کی مختلف زاویوں سے تشریح ان کو عام ناقدین سے بلند درجہ پر پہنچا دیتی ہے۔

کبھی کبھی وہ کسی مطبوعہ کتاب سے بددل ہو جاتے تو شدید لب و لہجہ اختیار کر لیتے تو ان کی ضرب کاری ہو جاتی۔ مجھے دو واقعے یاد ہیں جب میں کچھ ان کے تبصروں کی شدت سے آزردہ ہو گیا تھا۔

ایک تو واقعہ 'کیف احمد صدیقی کی کتاب: گرد کا درد' پر ان کا تبصرہ۔ اس تبصرہ میں فاروقی نے کیف صاحب کے نظریات کی سخت تردید کی ہے، یہاں تک کہ ان کی کتاب کے نام کو بھی اپنی تنقیص کا یوں شکار کیا: ''خود صدیقی صاحب کے مجموعے کے عنوان 'گرد کا درد' میں کتنی ندرت ہے''۔ تبصرے کا آخری جملہ تو تیز ابی ہے۔ فاروقی نے فیصلہ دیا تھا کہ ''مجموعے میں شامل نظمیں بھی میرے اس نتیجے کی تائید کرتی ہیں کہ کیف احمد صدیقی روایتی ندرت سے دامن چھڑا کر اگر خود کو استعارے کے حوالے کر دیں تو اچھی شاعری کر سکتے ہیں۔ یہ تبصرہ اگر صحیح بنیادوں پر تھا تب بھی اس طرح ایک مصنف پر ان کی ردو تردید بے حد سخت تھی۔

مشہور شاعر گوپال متل کے مجموعہ کلام 'صحرا میں اذان' پر ان کا تبصرہ بھی اسی سخت نگاری کی مثال ہے۔ تبصرے کی ابتدا وہ کچھ یوں کرتے ہیں: ''ایمان کی بات یہ ہے کہ اس کتاب سے میں نے جو توقعات باندھ رکھی تھیں وہ تمام و کمال پوری نہیں ہوئیں۔' آگے اس تبصرے میں متل کی عمر کے تناظر میں انھوں نے عجیب سا جملہ لکھا کہ' 'عمر رسیدگی کے ساتھ جذباتیت، پلپلا پن، اشک باری اور ترحم کوشی چاہے سب کے مزاج میں پیدا نہ ہو، لیکن بہت سے ان کمزوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔'' تبصرہ نگار نے تصریح نہیں کی کہ اس جملہ کا متل صاحب کی شاعری سے کیا تعلق ہے؟

آگے جا کر وہ افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ''صحرا میں اذان کا بڑا حصہ اسی قسم کی پھولی پچالی رومانی سیاسی شاعری پر مبنی ہے جس کا لب و لہجہ کسی شکست خوردہ کردار کی یاد دلاتا ہے۔'' میرے خیال میں اس قسم کی جراحت بے جا کی مثالیں فاروقی صاحب کے تبصروں، مراسلوں اور تحریروں میں بہت وافر ملتی ہیں۔ ان کی بات سولہ آنے سچ ہونہ ہو، یہ تو ہے ان سے ناراضی کی صورتحال ضرور پیدا کر دیتا تھا۔ ان کی تحریریں مستند بھی تھیں لیکن متنازعہ بھی بن گئی تھیں۔

اُردو میں برسوں سے یہ رواج رہا ہے کہ ناقدین اپنی نظر اور فکری جودت کے اظہار کے لیے مستند اور مقبول ترین ادیبوں پر اپنی مہارت کے جلوے دکھائے ہیں۔ اس ضمن میں بھی فاروقی صاحب ممیز و ممتاز نظر آتے ہیں، میر پر بہت لکھا؛ شعر شور انگیز اس تنقید لہر کا بلند نقطہ ہے،

غالب کی تفہیم وافہام میں اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ اقبال کی داد اور آئینہ گری میں بھی پیش پیش رہے۔ کئی اساتذہ، متقدمین، معاصرین اور نو آمد شاعروں اور ادیبوں سب پر جب دل نے کہا، یا موقع پیش آیا اپنی تحریروں سے دامن اُدب کو مالا مال کیا۔

یوں تو کئی ماہرین نے غالب شناسی کے جادو جگائے ہیں۔ 'تفہیم غالب' میں فاروقی کا انداز نادر اور قیمتی ہے۔ الفاظ وتراکیب کی تحلیل، شعر کے داخلی عناصر تک رسائی کی جستجو، لفظیات میں چھپے معانی کی مختلف زاویوں سے تشریح ان کو عام ناقدین سے بلند درجہ پر پہنچا دیتی ہے۔ ایک مثال اس کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ غالب کے شعر

ہوئی ہے مانع ذوق تماشہ خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگ پنبہ روزن میں

کی تفہیم میں پہلے وزن اور بحر کا تعین کرنے کے بعد گفتگو کچھ اس طرح شروع کرتے ہیں:

''اس شعر میں مسئلہ یہ ہے کہ خانہ ویرانی ذوق تماشا کے کس طرح مانع آسکتی ہے؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا گھر ویران ہونے یا کرنے کے بعد ہم بیاباں کی راہ لیتے اور جی بھر کے ذوق تماشا کو تسکین دیتے۔ اگر کف سیلاب روئی کی طرح روزن کو بند بھی کیے ہوئے ہے، تو کیا ہرج ہے۔ گھر سے باہر نکلنا کیا مشکل ہے؟ لہٰذا اس شعر کا وہ مفہوم جو عام طور سے بیان کیا جاتا ہے ناقص ہے۔''

اس طرح وہ بحث وتمحیص وتجزیہ شروع کر کے تین چار پیراگراف مختلف زاویوں، مختلف ریفرینس اور عکسوں میں شعر کے بہتر معانی کے پہلوؤں کو پرکھتے ہوئے گزرتے ہوئے، آخر میں کچھ اس طرح منتج تاثر تک پہنچتے ہیں:

''میں اپنی ذات میں قید ہوں۔ سوچا تھا ذات میں تباہ کردوں تاکہ باہر نکل سکوں۔ لیکن جس وسیلے کو اختیار کیا، وہ خود سد راہ بن گیا۔ گویا میں نشہ انانیت میں چور تھا، کہ خود کو آزاد کرنے پر قادر ہوں۔ یہی اُنانیت راستے کا پتھر بن گئی، جو علت ہے وہی معلول بھی۔ وجود کو ثابت کرنے کے لیے عدم وجود کا سہارا لیا تھا، عدم وجود نے وجود کو ہی منہدم کردیا، یہ محالیت غالب کا مخصوص انداز ہے۔''

دیکھیے کس خوب صورت تفصیل اور تدقیق کے ساتھ عمیق انداز میں غالب کے کلام کا جادو ہم پر واضح کردیا گیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب بہت محنت، تو ضح، دیدہ ریزی سے موضوعات کا مطالعہ کرتے اور ایسے اَدبی مسائل جن کا حل مدتوں سے ضروری تھا ان کی عقدہ کشائی سہل انداز میں اور دلیل وحجت کے ذریعے کرنے کے سعی کرتے اور بیشتر کامیاب رہتے۔

مشکل موضوعات کو سہل اور مختتم طور پر برتنے میں فاروقی صاحب کو استادانہ مہارت تھی۔ مثال کے طور پر ان کی کتاب 'عروض، آہنگ اور بیان' ان کے تحریر کردہ نوادرات میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب ثابت کرتی ہے کہ مرحوم کو علم العروض پر تبحر حاصل تھا۔ اُردو، فارسی، عربی اور دیگر عالمی زبانوں میں مستعملہ اوزان، بحور، میٹر، زمینوں اور ان میں مستعمل تجربات۔ عیوب اور ردعیوب، رخصت و مہلت، تخفیف اور کئی متعلق موضوعات انھوں نے جس خوبی سے احاطہ کیا، وہ قارئین اور طالبان علم کے لیے قیمتی تحفے کی طرح ہے۔ ان تحریر کی ایک جھلک آپ بھی دیکھیے۔ ان کے مضمون 'عیب غلطی نہیں ہے'، کے آخری پیراگراف سے:

''ہمارے یہاں 'زبان وبیان کے اغلاط' کے اصطلاح عام ہے اور کسی شاعر کو مطعون کرنے کا مستند طریقہ یہ ہے اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس کے یہاں زبان و بیان کے اغلاط یا لغزشیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان کی لغزشیں عیب نہیں بلکہ غلطی کی ضمن میں آتی ہیں۔ اور بیان کی خرابی غلطی نہیں بلکہ عیب ہے۔ دونوں کا درجہ ایک نہیں۔ بیان کی لغزش گویا عجز بیان کا ثبوت ہے اور فن شعر کے سارے عیوب دراصل عجز بیانی کے ہی عیوب ہیں۔''

دیکھیے کس سادہ اور قابل فہم طرز میں ایک معروف غلط فہمی کا ازالہ کردیا گیا ہے۔ اس کتاب کے عنوانات ہیں:

- شعری آہنگ میں نئی فکر اور تنوع کی ضرورت
- شعر اُردو میں آوازوں کی تخفیف اور سقوط کا مسئلہ
- شکست بحر اور شکست ناروا
- نقد معائب
- غلطی عیب نہیں ہے
- تسکین اوسط کے اسرار
- اقبال کا عروضی نظام
- غزل در غزل اور ''اولیپو''
- کچھ عروضی اصطلاحات۔

اس کتاب کی موضوعاتی بساطت ہی اس کی افادیت کا پتہ دیتی ہے۔ یہی فاروقی صاحب کی تحریروں کی خوبی ہے۔

فاروقی صاحب نے فن افسانہ نگاری، ناول نگاری اور داستان سازی میں بھی قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے۔ اس کی کامیاب مثالیں ہیں: سوار اور دوسرے افسانے، کئی چاند تھے سر آسماں اور 'دوسری کہانیاں'۔ ان کا ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' ایک ایسا ناول ہے جو داستان گوئی، قصہ خوانی، خاندانی واقعات کے گوشے اور ماضی کے سماجی ماحول کے مناظر کو آپس میں ضم اور منجمد کر کے الف لیلوئی کیفیت لسانی تہذیب کے پیش اور پس مناظر میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔

اس طرح کی تحریر کو فاروقی جیسا زود مطالعہ اور زبان داں ہی لکھ سکتا تھا۔ بہت سے ہند وپاک کے ادیبوں، شاعروں اور ماہرین نے اس ناول کو بہت پسند کیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار سابق وزیر اعظم من موہن سنگھ نے بھی اپنے انٹرویو میں اسے اپنی پسندیدہ کتابوں میں شمار کیا تھا۔

اور بہت سی باتیں ہیں اور موضوعات ہیں جن کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ امید کہ ان کے سوانح نگاران کی شخصیت کے ہر گوشے کا خاطر خواہ مطالعہ کریں گے۔ ان کے معرکے، ان کی شعری لفظیات، ان کے فنی مفروضات، تراجم، ان کی کتابوں اور مضامین میں مستعملہ Quotations، حوالے، مقولے، اشعار اور تمثیلات کا جائزہ، عدووں کی گروہ بندی کا مقابلہ، ان کے اہم اَدبی عہدوں پر خدمات اور ایسے بہت سے زاویے ہیں جو ابھی تشنہ ہیں۔

فاروقی مرحوم کی کتابیں پڑھ کر ایک اور تاثر یہ ابھرتا ہے کہ انھیں مطالعے اور اکتساب علم کا غیر محدود ذوق تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے مطالعے کے دوران اہم اشعار، قطعات، اقوال، مقولے، کلیے، اور قیمتی اقتباسات کو اپنی کسی نوٹ بک یا ڈائری میں نوٹ کرلیا کرتے تھے، کچھ کو نشان زد یا (underline) بھی کرلیتے ہیں۔ جب کوئی موضوع ان کے پیش نظر ہوتا تو ان میں سے کوئی سب سے مناسب ترین قول/شعر/مقولے کو اپنی تحریر کو منطبق کردیتے جو ذہنی اور فنی سمت سازی میں ان کے نقطہ نظر کو واضح کرنے میں ممد ومعاون ہوجاتا۔ ان کے ان منتخبہ اقتباسات کی بھی ایک خاطر خواہ فہرست بن جائے تو بہت اچھا ہو۔

اَدب میں معیار اور صداقت کی صدا بلند کرنے میں بھی فاروقی پیش پیش رہتے۔ گیان چند جین، گوپی چند نارنگ اور اس قبیل کے استادان اَدب کے غیر مناسب بیانات کی تردید اور قوی انداز روک تھام میں ان کا کردار بھولا نہیں جاسکتا۔

ترقی پسندوں، مصلحت پرستانہ شاعری اور اہمال کے شائقین سے اُنھوں نے جس طرح معرکے اور مباحث کیے ان کی تاریخ بھی ضرور رقم کی جائے۔ آج میں یاد کرنے بیٹھا تو فاروقی صاحب کی بیش قلمونیت اور تبحر کے اتنے پہلو نظر آئے محسوس ہوا کہ میرا یہ مضمون ان کی یاد کی ایک مختصر سی پرچھائیں ہے اور بس۔۔۔!!

ہائے یہ کون اس جہاں سے اٹھا، یہ عظیم ادیب اَب فردوس مکاں ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

■

Aslam Imadi
12-2-823/C/ 47, SBI Colony, Mehdipatnam,
Hyderabad- 500028 [TS]
Mobile.: 9966683014

سرور عالم ندوی

کلامِ اقبال و شوقی کا فکری، فنی اور موضوعاتی تجزیہ

ادب افکار انسانی کا ایسا مرقع ہے جسے تاریخ کا امین اور تہذیب و تمدن کا آئینہ دار قرار دیا جاسکتا ہے، جو قوموں کے احوال و کوائف کا محافظ بھی ہے اور افکار و نظریات، رسم و رواج اور معاشرت و معیشت کا پاسدار بھی، جس میں اثر پذیری و انگیزی دونوں صفتیں پائی جاتی ہیں اور انھیں دونوں صفتوں سے آراستہ ہوکر جو تخلیق وجود میں آتی ہے وہ کاروان علم و ادب کو تفہیم و تحقیق کی اس جولاں گاہ میں پہنچا دیتی ہے جہاں شہسواران ادب کے فکر و خیال، جذبہ و شعور اور معنی و مفہوم کو سمجھنے اور اس میں پائی جانے والی یکسانیت و مماثلت کے اس اسباب و محرکات کو جاننے میں آسانی ہوتی ہے جس کے نتیجے میں یہ ادب وجود میں آیا۔

بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تاریخی اعتبار سے اس طور پر زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس زمانے میں ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور ان میں کا ہر ملک اپنی قومی، ملی، وطنی، معاشرتی اور سماجی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں تھا کیونکہ مغرب کی بالادستی ذہن و فکر کی ہر سطح پر چھائی ہوئی تھی۔

ان حالات میں ایشیا اور افریقہ دونوں بر اعظموں میں نئے سیاسی نظام، اقتصادی فلسفہ، نئے ادبی رجحانات اور شعر و ادب کے جدید موضوعات نے جنم لیا، جس کے ذریعے قوم مسلم کو ان کی عظمت رفتہ کی یاد دلائی گئی اور صالح فکر اور اسلامی تعلیم کی نشر و اشاعت کی کوشش کی گئی جس سے متاثر ہوکر متعدد شہسواران ادب نے فکر و خیال کی مختلف جولاں گاہ میں اپنے اشہب خامہ کو دوڑایا۔

افکار و نظریات کی یکسانیت اور شعور و ادب کی مماثلت کے ساتھ دنیا کے دو مختلف سمندر، بحر ہند اور دریائے نیل کی موجوں سے کھیلنے والی قوموں میں دو ایسی شخصیتیں منصۂ شہود پر نمودار ہوئیں جنھوں نے فکر و خیال کی وسعت اور جذبہ و شعور کی کثرت کے ساتھ قوم مسلم کو یاس و ناامیدی کی دلدل سے نکال کر ان کو اپنی عظمت و رفعت، ذات کی معرفت اور خود اعتمادی کی دولت سے روشناس کرایا جن میں سے ایک خاک ہند سے پیدا ہونے والا مرد کامل شاعر مشرق اقبال (1876-1938) اور دوسرا مصر کی مٹی سے جنم لینے والا امیر الشعرا احمد شوقی (1869-1932) کی ذات گرامی ہے۔

دنیا کے دو مختلف کناروں پر پیدا ہونے کے باوجود دونوں کے مابین فکری یکسانیت اور موضوعات کے انتخاب میں جس قدر مماثلت پائی جاتی ہے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں، موضوع کے انتخاب، فکر کے اشتراک، مقصد کے اتحاد اور یکساں جذبہ و احساس میں یہ دونوں شخصیتیں کس قدر قریب نظر آتی ہیں اس کا اندازہ دونوں کے کلام کو پڑھ کر بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ذیل میں چند مشترک موضوعات ذکر اندلس، قومی و وطنی نظریہ، عشق رسول، اسلامی شخصیات کے تذکرے قائدین ملت کے مرثیے اور قابل قدر افراد کے بیان کا ایک تقابلی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔

اندلس جو مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی یادگار اور ان کی شوکت و سطوت اور علم و حکمت کا پاسدار ہے جہاں کے عظیم الشان محلات اور قابل رشک باغات مسلمانوں کے لیے فرحت و انبساط کا سامان فراہم کرتے رہے ہیں اس بے مثال سلطنت کے زوال نے مسلمانوں کو خون کے آنسو بہانے پر مجبور کردیا، جس کے آثار و باقیات کا تذکرہ دونوں عظیم شاعروں نے کیا ہے۔

شوقی نے ایک سو دس اشعار پر مشتمل نظم کے ذریعے اپنے سوزش قلب کو غمناک آہوں سے ہوا دینے کی کوشش کی ہے جن میں سے چند اشعار یہ ہیں۔

قرية لا تعد في الارض، كانت
تمسك الارض ان تميد و ترسى
وسوار كانها في استواء
ألفات الوزير في عرض طرس
فترة الدهر قد كست سطريها
ما اكتسى الهدب من فتور و نعس

ترجمہ: روئے زمین پر ایک ایسی بستی ہے جس کا شمار نہیں ہوتا ہے لیکن وہ پھیلے ہوئے پہاڑوں والی زمین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے۔

وہ سرزمین بلندی اور برابری میں کنگن کے مانند ہے جو مقام طرس کے طول و عرض میں وزیر کی محبتوں کا ثمرہ ہے۔

زمانے کی گردش نے اس کے دونوں کناروں کو ڈھیلا اور لچیلا بنادیا ہے جیسا کہ کھجور کے درخت پھلوں سے لدے جاتے ہیں۔

شوقی نے یہ نظم قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ کی سیاحت کے بعد 1918 میں کہی اور وہاں کے آثار و باقیات اور باغات و محلات کے لیے آنسوؤں کی سوغات کے ساتھ احساسات و جذبات کا خوبصورت نذرانہ پیش کیا ہے۔

'وداع الاندلس' کے عنوان سے شوقی کے یہ اشعار بھی بڑے دلفگار ہیں۔

وداعا ارض اندلس ،وهذا
ثنائي ان رضيت به ثوابا
وما اثنيت الا بعد علم
وكم من جاهل اثنى فعابا
مغرب آدم من دار عدن
قضاها في حماك لي اغترابا
فانت ارحتني من كل انف
كانف الميت في النزع انتصابا

ترجمہ: سرزمین اندلس کو الوداع کہنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر بھی میری تعریف کرنا تمھارے متعلق ایک بہترین عمل ہوگا اگر تو راضی ہوگی۔ اور میں نے بغیر جانکاری کے تمھاری تعریف نہیں کی ان نادان اور کم عقلوں کی طرح جو تعریف کو بھی معیوب بنا دیتے ہیں۔

جنات عدن سے آدم علیہ السلام کا نکلنا ٹھیک ایسا ہی ہے جیسا کہ میرے لیے سرزمین اندلس کی اجنبیت (یعنی اندلس میرے لیے اجنبی بن گئی ہے)

اے سرزمین اندلس تو نے ہر طرح سے مجھے راحت پہنچائی ہے جیسے حالت نزع میں مرنے والے کی ناک کھڑی رہتی ہے (یعنی میری عزت کا تو نے خیال رکھا)

اقبال نے بھی ان مقامات کو دیدۂ عبرت کے ساتھ دیکھا اور اقوام رفتہ کی عظمتوں کو سلام کرتے ہوئے اپنی دینی حمیت اور ایمانی قوت کا اظہار جس انداز سے کیا وہ ان کی قوت سخنوری کا کمال بھی ہے اور جوش وجذبہ، سرخوشی و سرمستی اور عبرت ونصیحت کا شاہکار بھی، اقبال کہتے ہیں۔

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خون جگر میں
کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا کہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں
غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن
تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

اسی طرح اقبال کی دوسری نظم 'مسجد قرطبہ' جوان کی شاعری کا لاثانی نمونہ ہے جس میں انہوں نے ایمانی اثر آفرینی سے ایک طلسم سا پیدا کر دیا ہے جس میں آرٹ، تاریخ، فلسفہ سب سمٹ کر یکجا ہو گیا ہے یہ بھی اسی جذبہ اندروں کا اظہار ہے جس میں جذبہ ایمان کی بے تابی اور عشق ومحبت کی جولانی اپنی پر پیچ لہروں سے مسلمانوں کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو گرم اور رواں دواں رکھتی ہے، اقبال کہتے ہیں۔

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود
تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل
تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

دنیا کے دو مختلف براعظموں میں بسنے والے ان دو عظیم شاعروں کے ان اشعار کو پڑھیے اور سوچیے کہ یہ فکری اشتراک کس چیز کی غمازی کرتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے نصف اول کے اخیر میں قوم پرستی کا جو نظریہ نمو پذیر ہوا اہل مغرب نے اپنی منفعت میں اس کی تشہیر وتعمیم میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، جس کی لہروں نے ممالک اسلامیہ کے پائے ثبات کو بھی متزلزل کر دیا۔ اقبال اور شوقی حب الوطنی اور وحدت قومی کا صحیح تصور قوموں کے ذہن و دماغ میں راسخ کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے اقبال نے مشہور قومی نغمہ کو وجود بخشا جس میں سے چند یہ ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اسی فکر کی تشہیر شوقی نے بھی اپنی متعدد نظموں میں کیا ہے 'نشید مصر' کے عنوان سے ان کی یہ نظم۔

بنی مصر مکانکمو تهيا
فهيا مهدوا للملك هيا
خذوا شمس النهار له حليا
الم تلك تاج اولكم مليا
لنا وطن بانفسنا نقيه
وبالدنيا العريض نفتديه

ترجمہ: اے مصر کے باشندو! تمھارا مقام بلند و بالا ہے۔ آؤ! اپنے ملک کی تعمیر میں جلدی کرو۔

دنوں کی روشنی کو ایسے حاصل کرو جیسے وہ اس کے لیے زیور ہیں۔ کیا تمھارے پہلے کے لوگوں نے قیمتی تاج نہیں پہنے۔

ہمارے لیے ہمارا وطن ہے جسے ہم بذات خود کشادہ اور عریض دنیا سے محفوظ رکھتے ہیں اور ہم اس پر اپنی جان نثار کرتے ہیں۔

اسی طرح ان کا قومی ترانہ جو زبان زد خاص و عام ہے اس کے چند اشعار

اليوم نسود بوادينا ونعيد محاسن ماضينا
ونشيد العربا يدينا وطن نفديه و يفدينا
ونحسنه و نزينه بمآثرنا و مساعينا
وجنان الخلد وكوثره وكفى الآباء رياحينا

ترجمہ: آج ہم اپنے ملک وقوم کی قیادت و سیادت کر رہے ہیں اور اپنے ماضی کے محاسن کو لوٹا رہے ہیں۔

اور ہم اپنے ہاتھوں سے وطن عزیز کی بنیاد کو مضبوط کر رہے ہیں۔ ہم اپنے وطن عزیز پر فدا ہوتے ہیں اور وطن ہم پر فدا ہوتا ہے۔

اور ہم اس کی تحسین وتزئین کرتے ہیں اپنی قربانیوں اور کوششوں کے ذریعے۔

اور ہماری سرزمین خلد بریں اور اس کے کوثر کی طرح ہے جہاں ہماری خوشبوئیں آبا واجداد کے لیے کافی ہیں۔

ان اشعار کے ذریعے شاعر نے جن جذبات واحساسات اور عزم وحوصلے کا اظہار اور آبا واجداد کے کارناموں اور اعزاز کا اظہار کیا ہے وہ تمام باشندگان مصر کے لیے وطن دوستی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ سرمایۂ افتخار بھی ہے۔

عشق رسول

جوہر مسلمان کی زندگی کا ماحصل ہے، جس پر ایمان کے بقا کا انحصار اور داور محشر کے سامنے اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے، جس کے بیان میں دنیا کی تقریباً ہر زبان میں بے شمار شعرا نے اشعار کہے ہیں، اس میدان میں بھی جس انداز و پر کیف لہجے میں اپنے عشق و وارفتگی اور ندامت کے ساتھ خود سپردگی کا اظہار ان دونوں شعرا نے کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

شوقی نے عشق رسول سے معمور کئی بیش قیمت قصیدے کہے ہیں جنہیں فن نعت گوئی میں شہرت عام حاصل ہے ان کے سب سے مشہور نعتیہ کلام میں سے چند اشعار بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں۔

ولد الهدى، فالكائنات ضياء
وفم الزمان تبسم وثناء
الروح والملأ الملائك حوله
للدين والدنيا به بشراء
والعرش يزهو والحظيرة تزدهي
والمنتهى والسدرة العصماء
نظمت اسامى الرسل فهى صحيفة
فى اللوح،واسم محمد طغراء

فاذا سخوت بلغت بالجود المدی
وفعلت مالا تفعل الانواء

ترجمہ: نبیؐ کی پیدائش سے پوری کائنات روشن ہوگئی اور زمانہ مسکرانے لگا اور لوگوں کی زبان ثناخوانی کرنے لگی۔

جبرئیل امین اور فرشتوں کی جماعت خوشیاں منانے لگیں اس دین کی وجہ سے جسے آپ دنیا میں لے کر آئے۔

اور اللہ رحمان کا عرش آپ کی پیدائش پر فخر کرتا ہے اور جنت آپ کے ہاتھوں پر ایمان لانے والے مومنین کی آمد سے چمک رہی ہے۔

لوح محفوظ میں رسولوں کے نام مرتب ہوئے تو محمدؐ کا نام سب سے پہلا اور خوبصورت قرار پایا۔

آپ جود و سخاوت کے اعلیٰ مراتب پر پہنچ گئے جہاں کسی کی رسائی ممکن نہیں گرچہ آسمانی ستارے ہی کیوں نہ ہوں جن سے نزول بارش کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

ان کے برخلاف اقبال نے باقاعدہ نعتیہ نظمیں نہیں کہی ہیں لیکن انھوں نے حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل زندگی اور آپؐ کی تعلیمات کو اپنے کلام کا محور بنایا ہے۔ محبت رسولؐ سے سرشاری اس حد تک تھی کہ نام آتے ہیں آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں، اس عشق کا اظہار اقبال نے متعدد مقامات پر مختلف انداز میں کیا ہے مثلاً فرماتے ہیں۔

تری عاشقی سے پہلے مجھے کون جانتا تھا
تری ذات نے بنائی مری زندگی فسانہ

اسی طرح۔

ہیں منور نور احمد سے زمین و آسماں
ہے نبیؐ کے عشق وجداں سے حیات جاوداں

صفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کس اچھوتے انداز سے فرماتے ہیں۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تونے طلوع آفتاب
شوکت سنجر و سلیم میں تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرے سجود بھی حجاب

اسی طرح سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں دونوں کا قصیدہ بھی فکری اتحاد کا خوبصورت نمونہ ہے مثلاً شوقی کہتے ہیں۔

فیا اخا الضراء والشدائد
والناس اخوان لدی الفوائد
وقدوۃ الزھاد بعد الھادی
وصاحب الھجرۃ والجھاد
ویا رحیما قلبہ رقیقا
بمالہ کم حرر الرقیقا

ترجمہ: اے مصیبتوں اور تکلیفوں کے وقت کے بھائی جب کہ لوگ فائدے اور نفع کے وقت بھائی چارگی چاہتے ہیں۔

اور آپ (ابوبکرؓ) نبیؐ کی وفات کے بعد زاہدوں کے لیے قدوہ نمونہ ہیں اور ہجرت و جہاد کے ساتھی ہیں۔

اے رحمٰن و رحیم! ان کا دل بہت نرم ہے انھوں نے اپنے اموال کے ذریعے بہت سارے غلاموں کو قید کی زندگی سے آزاد کیا۔

شوقی نے جن صفات اور خوبیوں کا تذکرہ اپنے ان اشعار میں کیا ہے اقبال نے بھی انھیں اوصاف کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر شعری ذخیرہ میں ایک خوبصورت اضافہ فرمادیا ہے، فرماتے ہیں۔

ایک دن رسول پاک نے اصحاب سے کہا
دیں مال راہ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
ارشاد سن کے فرط طرب سے عمر اٹھے
اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیق سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مرد وفا سرشت
ہر چیز، جس سے چشم جہاں میں ہو اعتبار
بولے حضور، چاہیے فکر عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار
اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر!
اے تیری ذات باعث تکوین روزگار!
پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

مسلم قائدین اور عظما علم پر جو مرثیے اور قصیدے کہے گئے ہیں ان میں بھی دونوں شعرا کے یہاں غایت درجہ اشتراک پایا جاتا ہے مثلاً مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ شوقی نے کہا جن میں سے چند اشعار یہ ہیں۔

بیت علی ارض الھدی و سمائہ
الحق حائطہ وأس بنائہ
الفتح من اعلامہ والطھر من
اوصافہ والقدس من اسمائہ
یاقُدس ھیيء من ریاضك ربوۃ
لنزیل تربك واحتفِل بلقائہ

ترجمہ: ہدایت اور بلندی کی سرزمین میں ایک ایسا گھر ہے جس کی دیواریں حق پر مبنی اور عمارتیں مضبوط ہیں۔

فتح اس کا مظہر ہے اور صفائی پاکیزگی اس کے اوصاف حمیدہ ہیں اور قدس اس کا نام ہے۔

اے قدس! تیری پہاڑی والی سرزمین ایسی ہے کہ جو مہمان تیری سرزمین میں آتا ہے اس کے دلوں میں جشن و سرور کا ماحول بن جاتا ہے۔

اقبال نے بھی ان کا مرثیہ فارسی میں کہا۔

یک نفس جان نزار او تپد اندر فرنگ
تا مژہ برہم از ماہ پرویں در گزشت
خاک قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

اسی طرح بوعلی سینا، شیکسپیئر گاندھی پر دونوں کے یہاں قصیدے ملتے ہیں۔

جس طرح اقبال نے بچوں کے لیے نظمیں کہی ہیں مثلاً بچے کی دعا، ماں کا خواب، ہلال عید، طالب علم اسی طرح تقریباً انہیں موضوعات پر شوقی نے بھی نظمیں لکھیں دعا، النوم دعا الصالح شوقی کی مشہور نظم ہے جو انھوں نے بچوں کے لیے کہی ہے۔

اس کے علاوہ اگر اقبال نے حیوانات میں ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، پرندے کی فریاد، ایک پرندہ اور جگنو، جگنو کے عنوان سے نظمیں کہی ہیں تو شوقی نے بھی الاسد والضفدع، الکلب والحمامۃ، الحمار والجمل، الثعلب والارنب کے عنوان سے نظمیں لکھی ہیں۔

یہ دنیا کی دو مختلف زبان عربی اور اردو کے ممتاز شاعروں کے کلام کا مختصر فکری، فنی اور موضوعاتی تجزیہ ہے، اس اعتراف کے ساتھ کہ دونوں کے مابین ماحول و معاشرہ اور ملک و سماج کے اختلاف کے باوجود جو فکری، فنی اور موضوعاتی اشتراک و اتحاد پایا جارہا ہے وہ اسی ایک چشمہ فیاض سے سیرابی کا نتیجہ ہے جس کی روانی نے دنیا کی مختلف فکروں کو ایک سانچے میں ڈھالا ہے جو فکر اور فن دونوں کو ایک ڈور سے باندھ کر ملکوں اور علاقوں کے حدود اور سرحد سے آزاد ہو کر خلقکم من نفس واحدۃ کا ایک دلکش نمونہ پیش کر رہا ہے اس اعتراف کے ساتھ جس کے اظہار میں قطعاً جھجک نہیں کہ اقبال کے شہباز فکر و فن نے جن بلندیوں پر اپنا آشیانہ بنایا ہے شوقی کا طائر تخیل ان کے حدود سے بہت دور نظر آتا ہے۔

■

Dr. Sarwar Alam Nadwi
Head, Dept of Arabic
Patna University
Patna - 800005 (Bihar)

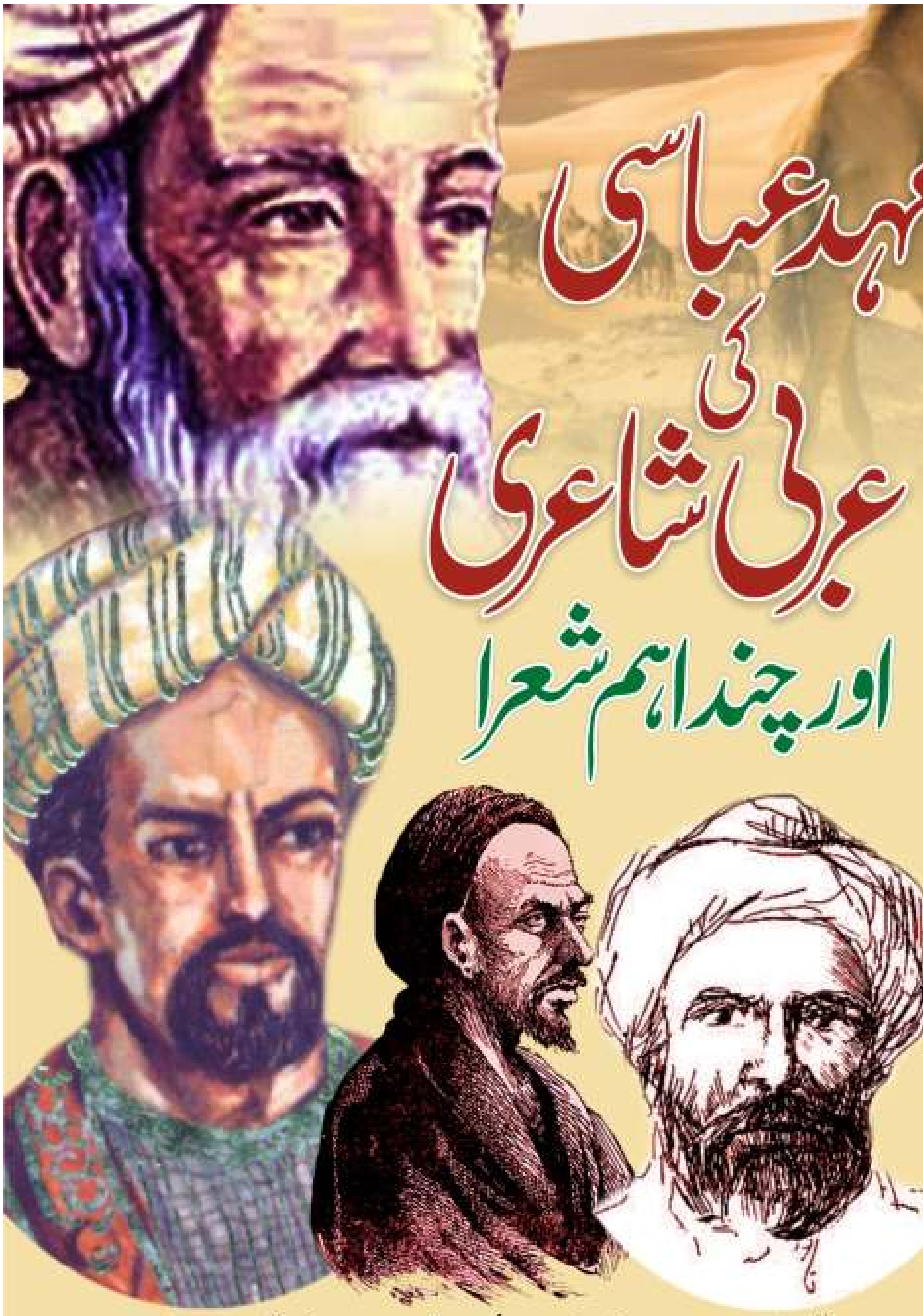

عہدِ عباسی کی عربی شاعری اور چند اہم شعرا

نایاب حسن

عربی تاریخ میں حکومتِ بنو عباس کا دور (750-1258) مختلف نیرنگیوں، ترقی وتنزل، اتھل پتھل، نشیب وفراز اور قیامت خیز تغیرات سے عبارت رہا ہے۔ اس عہد میں جہاں سیاسی وسماجی سطح پر بے شمار انقلابات رونما ہوئے، وہیں علوم وادب وثقافت کے شعبے میں بھی عظیم الشان واقعات ظہور میں آئے۔ عباسی حکمرانوں نے اپنے زمانے کے علوم وفنون کی سرپرستی وپشتیبانی کی اور اس وقت دنیا میں موجود تمام ترقی یافتہ اور زوال آمادہ علوم کے تحفظ پر غیر معمولی توجہ دی، جس کے نتیجے میں پہلے سے موجود بے شمار علمی شعبے عروج آشنا ہوئے اور ان گنت نئے شعبے عالمِ وجود میں آئے۔ اس زمانے میں عربی نثر کی مختلف اصناف کے ساتھ عربی شاعری کو بھی پھلنے پھولنے کا خاصا موقع ملا۔ خاص طور پر اس کے نصف آخر میں عربی شاعری کو زیادہ عروج حاصل ہوا؛ کیوں کہ خلفا اور وزرا بھی شعرا کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور انھیں بے پناہ نوازا کرتے تھے۔ عہدِ بنوامیہ اور عہدِ عباسی کے ابتدائی دور تک کی عربی شاعری روایتی انداز کی تھی یعنی اس میں قبائلی فخر ومباہات اور خاندانی عز وشرف کے بیان واظہار پر زور دیا جاتا تھا۔ ہر شاعر اپنے قبیلے کی بہادری، بے خوفی اور مختلف جنگوں میں انجام دیے گئے کارناموں کا ذکر کرتا تھا۔ غیرت وخودداری جیسے اوصاف عربوں میں قابلِ قدر تھے اور ان کے اظہار میں شعرا زیادہ دلچسپی لیتے تھے، مگر عہدِ عباسی جوں جوں آگے بڑھتا گیا، اس کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا اور اس کے نتیجے میں بہت سی نئی قومیں اور نئے جغرافیائی خطے اسلامی وعربی قلمرو میں شامل ہوتے گئے۔ اس کے نتیجے میں دوسری قوموں کی بہت سی چیزوں، ثقافتوں اور تہذیبی مظاہر ومعالم سے مسلمانوں کو واسطہ پڑا، ان کی زبانوں اور ادب سے آشنا ہوئے، ان کے طرزِ زندگی اور ان کے اخلاق وکردار سے آگاہی ہوئی، ان کے علوم وفنون سے واقفیت ہوئی اور ان کی نثر اور شاعری سے شناسائی حاصل ہوئی۔ اس طرح سماجی اثرات کے علاوہ ادبی سطح پر بھی ان تہذیبوں اور قوموں کے اثرات پڑے اور نثر ونظم دونوں میں ان نئے مظاہر کی جھلکیاں صاف طور پر محسوس ہونے لگیں۔ عربی شاعری دھیرے دھیرے روایت کے ساتھ جدت اور تازہ کاری کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے اسالیب میں تنوع پیدا ہوا اور نئے شعرا نے اس کو موضوعات، تخیل اور افکار وتعبیرات کی سطح پر نئی جہتیں دیں۔ اس کے عنوانات میں وسعت پیدا ہوئی اور مشمولات کا دائرہ بڑھتا چلا گیا۔ پھر دھیرے دھیرے عہدِ عباسی کی شاعری میں کئی نئے رجحانات پیدا ہوگئے، جو ایک دوسرے سے مختلف بھی تھے اور ممتاز ومتنوع بھی۔

شعرا کا ایک طبقہ ایسا تھا جو قدیم اسلوب کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ قدیم شعرا کے طرز پر شاعری کرنا ہی بہتر ہے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں: ایک تو یہ کہ لوگ قدیم زبان والفاظ کو ہی معیاری سمجھتے تھے اور انھیں اپنی تخلیقات میں برتنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ایک وجہ مذہبی بھی تھی، علما کو اندیشہ تھا کہ اگر قدیم عربی سے دستبرداری کا رجحان پیدا ہوا تو قرآن وحدیث اور مذہبی لٹریچر کو سمجھنے والے لوگ بتدریج کم ہوجائیں گے۔ اسی وجہ سے عباسی دور کے خلفا اور ان کے وزرا بھی کلاسیکل عربی زبان وادب میں مہارت حاصل کرنے پر خاص توجہ دیتے تھے؛ بلکہ ان کے والدین اور سرپرستان اس کے لیے خاص طور پر اساتذہ رکھا کرتے تھے، جو انھیں زبان کے رموز واسرار سے آگاہ کریں۔ ابن الدمینہ، ابن میادہ اور ابوحیہ النمیری وغیرہ کا شمار ایسے ہی قدامت پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عام طور پر لفظی اور موضوعاتی؛ ہر دو سطح پر قدیم روایت واسلوب کو برتا اور اسی کی نمائندگی کرنے کی کوشش کی۔

عباسی خلافت جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی، دیگر شعبوں کی طرح شعر و ادب کے شعبے میں بھی بدلاؤ آنے لگے۔ قدیم رجحانات پر اضافے ہونے لگے۔ مثلاً شعرا واہ واہی بٹورنے اور خلیفۂ وقت کو خوش کرکے ہدایا حاصل کرنے کے لیے ان کی تعریفوں کے پل باندھنے لگے اور مبالغہ آرائیوں پر مشتمل مدحیہ اشعار کہنے کا رواج عام ہونے لگا۔

عباسی خلافت جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی، دیگر شعبوں کی طرح شعروادب کے شعبے میں بھی بدلاؤ آنے لگے۔ قدیم رجحانات پر اضافے ہونے لگے۔ مثلاً شعراواہ واہی بٹورنے اور خلیفۂ وقت کو خوش کرکے ہدایا حاصل کرنے کے لیے ان کی تعریفوں کے پل باندھنے لگے اور مبالغہ آرائیوں پر مشتمل مدحیہ اشعار کہنے کا رواج عام ہونے لگا۔ اسی طرح شاعری کا ایک نیا اسلوب پیدا ہوا جسے 'اسلوب مولد' (نومولود اسلوب) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ غرابت وابتذال کے بیچ کا اسلوب تھا، جس میں زبان کی اصل اور اس کی صرفی ونحوی بنیادوں کی رعایت کرتے ہوئے نئے الفاظ اختراع کیے جاتے تھے اور لوگوں کی قوت فہم کی رعایت سے تراکیب وتعبیرات کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اس دور میں ہجو گوئی میں جدت پیدا ہوئی، مگر بہ تدریج یہ جدت انتہا پسندی اور مزاح کے نام پر تحقیر وتضحیک تک پہنچ گئی۔ مرثیہ گوئی میں بھی نئے نئے تجربے کیے گئے۔ اشیا یا اشخاص کی اوصاف بیانی کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوئے۔ زہد اور دین دارانہ رجحانات کی شاعری میں بھی حسب تقاضائے وقت کچھ نئے خصائص واوصاف پیدا ہوئے۔ قصیدہ گوئی میں بھی بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس کے علاوہ صنعت و اسلوب، افکار واظہار، اوزان وقوافی اور مختلف خیالات و تصورات کے بیان کے سلسلے میں شعرا نے مختلف قسم کے اسالیب پیش کیے۔ ذیل میں اس عہد کے چند منتخب شعرا کی تخلیقات کا جائزہ لیا جارہا ہے، جس سے اس دور کی شاعری کے امتیازات واضح طور پر سامنے آجائیں گے۔

اس عہد کا ایک ممتاز شاعر بشار بن برد بن یرجوخ (96-168ھ) ہے، یہ فارسی الاصل تھا۔ اس کی پرورش بنو عقیل میں خالص عربی ماحول میں ہوئی، جس کی وجہ سے اس کی زبان فصیح ہوگئی۔ دس سال کی عمر میں ہی اس کی شاعرانہ خوبیاں ظاہر ہونے لگی تھیں، البتہ اس کا ذہن زیادہ تر ہجو یہ شاعری میں چلتا تھا؛ کیونکہ یہ جس ماحول میں رہتا تھا اس میں اسی کا رواج تھا۔ اس کا شمار مخضرمی شعرا میں ہوتا ہے۔ اس نے بنوامیہ و بنوعباس دونوں کا دور پایا۔ فنی اعتبار سے اس کی شاعری کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے؛ کیونکہ اس نے اپنی شاعری میں زبان وبیان کی بھرپور مہارت کا اظہار کیا۔ اسے لفظوں سے کھیلنے کا ہنر آتا تھا اور ایک خیال یا معنی کے اظہار کے لیے کئی تعبیرات و اسالیب پر قدرت رکھتا تھا۔ اسے شاعری کی ہر صنف میں کمال حاصل تھا اور بے ساختہ شعرگوئی کی صلاحیت سے بہرہ ور تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ فطری شاعر تھا۔ اس کو حیرت ناک حد تک قدرتِ کلام حاصل تھی۔ ایک قصیدے میں اپنے قبیلے کی جرأت و بہادری اور دشمنوں سے مقابلے کی بے مثال صلاحیت کو بڑے دلچسپ اور پرشکوہ انداز میں بیان کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

كَأنَّ مُثارَ النقع فوقَ رؤوسِهم
وأسيافَنا ليلٌ تهاوت كواكبُهْ

بعثنا لهم موتَ الفجاءة إننا
بَنُو المُلْكِ خَفَّاقٌ علَينا سَبائِبُه

فراحُوا: فَرِيقًا في الإسَارِ ومِثلُهُ
قتيلٌ ومِثلٌ لَاذَ بِالبَحْرِ هارِبُهْ

وأرْعَنَ يَغْشَى الشَّمْسَ لَوْنُ حَدِيدِهِ
وَتَخلَسُ أبصارَ الكُماةِ كتائِبُهْ

تغصُّ به الارضُ الفضاءُ إذا غدا
تزاحم أركانَ الجبالِ مَناكِبُهْ

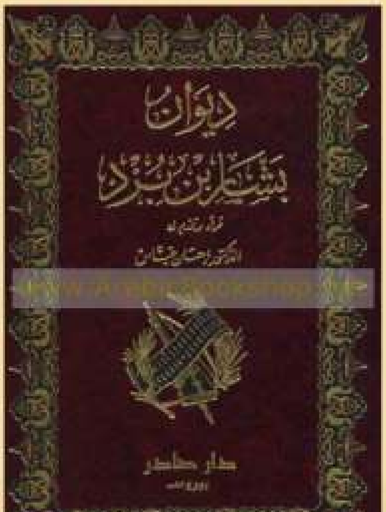

''ترجمہ: ان کے سروں پر اڑنے والے غبار اور ہماری تلواریں ایسی تھیں گویارات کے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوں۔

ہم نے انھیں اچانک جالیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا، ہم ایسے اصحاب سلطنت ہیں جن کے علم لہراتے رہتے ہیں۔

پس ان میں سے کچھ تو قید کیے گئے اور ایسے ہی کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ لوگ بھاگتے ہوئے سمندر کی پناہ میں چلے گئے۔

ہماری فوج ایسی عظیم تھی کہ اس کے ہتھیاروں کی چمک نے سورج کو ڈھانپ لیا تھا اور اس کے جتھوں کو دیکھ کر بڑے بڑے بہادروں کی نگاہیں خیرہ ہوجاتی تھیں۔

جب وہ بڑھی تو اس کی کثرت کی وجہ سے روئے زمین کی کشادگی کم پڑنے لگی اور اس کا دائرہ پہاڑوں کے دامن تک پھیل گیا۔''

قابل غور بات یہ ہے کہ بشار بن برد پیدائشی طور پر اندھا تھا، مگر اس نے اپنے قبیلے کی فوج، اس کی ظاہری عظمت وشوکت اور پھر میدان جنگ کے احوال کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ لگتا ہے وہ سارا کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی شاعرانہ سربرآوردگی اور غیر معمولی قوتِ بیان کی علامت ہے۔ اس نے جس قسم کے معانی اور خیالات کا اظہار کیا ہے، اس میں حیرت انگیز تسلسل اور روانی ہے۔ قومی فخر کے اظہار کے لیے جو الفاظ وتعبیرات استعمال کیے ہیں وہ نہایت خوبصورت ہیں۔ معانی کی وضاحت، منظر کشی کے جمال، الفاظ کی سلاست کے اعتبار سے اس قصیدے کا جواب نہیں اور یہ بلاشبہ عہدِ عباسی کا بہترین شعری نمونہ ہے۔ بشار بن برد کے سوانح نگاروں کا اتفاق ہے کہ اسے خلیفہ مہدی کے حکم سے 168ھ میں قتل کردیا گیا۔ اس پر الحاد وزندقہ کا الزام تھا۔

اسی دور کا ایک اہم اور مشہور شاعر ابوالعتاہیہ (130-211ھ) ہے، اس کا نام اسماعیل بن قاسم ابن سوید ابن کیسان تھا اور کنیت ابواسحاق تھی۔ ابوالعتاہیہ کے نام سے شہرت پائی جس کے معنی گمراہ کن، بے عقل ونادان یا مجنون کے ہیں۔ اس کی پیدائش 130ھ میں عین التمر (عراق) میں ہوئی۔ ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے قبیح تھا اور ابتدائی عمر میں عادات وخصائل بھی اچھے نہ تھے، مگر پھر اس کی زندگی زہد وتصوف کی طرف مائل ہوگئی۔ اس کا اثر اس کی شاعری پر بھی ہوا؛ چنانچہ زیادہ تر زاہدانہ اور مدحیہ اشعار کہا کرتا تھا۔ اس کا اسلوب شعری غرابت اور پیچیدگی سے محفوظ ہے۔ اس کی شاعری میں

مخصوص طرز کی نغمگی پائی جاتی ہے،اس نے عربی شاعری میں کچھ ایسے اوزان بھی متعارف کروائے، جن سے اس وقت تک عربی شاعری نابلد تھی۔ اس نے عربی شاعری کو فنی اعتبار سے ثروت مند بنانے میں اہم رول ادا کیا۔اس کے ایک مشہور قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں، جن میں دنیا کی بے ثباتی اور حیاتِ انسانی کی بے یقینی و ناپائیداری کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے،ساتھ ہی بڑے لطیف پیرایے میں اپنے اعمال و افعال پر نظر رکھنے کی تلقین کی ہے؛ کیوں کہ انسان ہر وقت اللہ کی نظروں میں ہوتا ہے اور ایک دن خلوت وجلوت کے تمام اعمال کا حساب دینا ہے:

إذا ما خلوْتَ الدَّهر يوماً فَلا تَقُل
خَلَوتَ وَلَكِنْ قُلْ عَلَيَّ رَقِيْبُ
وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ يَغْفُلُ سَاعةً
وَلَا أنَّ مَا يخفَى عَلَيْهِ يغيب
لَهَونا، لَعَمرُاللّه، حَتّى تَتَابَعَتْ
ذُنوبٌ عَلى آثَارِهِنَّ ذُنُوبُ
فَيَا لَيتَ أنَّ اللَّهَ يَغفِرُ مَا مَضىٰ
وَيَأذَنُ فِيْ تَوبَاتِنَا فنتُوبُ
اذا ما مَضَى القَرنُ الذي كُنتَ فيهم
وَخُلِّفتَ فِي قَرن فَأنتَ غَرِيبُ

’’ترجمہ: اگر کبھی تم تنہا ہو تو یہ مت سمجھو کہ تم اکیلے ہو، بلکہ یہ ذہن میں رکھو کہ کوئی تمھیں دیکھ رہا ہے۔

یہ مت سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ تھوڑی دیر کے لیے بھی کسی چیز سے غافل ہوتا ہے اور نہ یہ کہ پوشیدہ چیز غائب ہوجاتی ہے۔

بخدا ہم غفلت میں پڑے رہے اور گناہ پر گناہ کرتے رہے۔

کاش کہ اللہ تعالیٰ گزشتہ گناہوں کو معاف کردیتا اور ہمیں توبہ کی توفیق دیتا تو ہم توبہ کرلیتے۔

جب وہ زمانہ گزر جائے جس میں تم تھے اور دوسرے زمانے میں جاؤ تو (ایسا لگے گا کہ) تم اجنبی ہو۔‘‘

اس کی یہ باتیں ہر دور کے انسان کے لیے مفید اور کارگر ہیں۔جن عادتوں کی اس نے تلقین کی ہے وہ آج بھی انسان کی بہتری اور کامیابی کی ضامن ہیں اور ہمیں انفرادی واجتماعی زندگی میں ان کی ضرورت ہے۔موضوع کے اعتبار سے اس نے استعارہ کنایہ یا شاعرانہ منظر کشی کے بجائے براہِ راست خطاب کرنے کی کوشش کی ہے اور قدیم حکیمانہ اسلوب میں اظہار مدعا کیا ہے۔اس قسم کے موضوع کے لیے یہ اسلوب اس دور میں بھی مقبول تھا،آج بھی مقبول ہے اور مؤثر بھی ہے، اسی وجہ سے ابوالعتاہیہ زاہدانہ موضوعات کا سب سے بڑا شاعر کہا جاتا ہے۔

عباسی عہد کا ایک بڑا شاعر ابوتمام (192-231ھ) بھی ہے،اس کا پورا نام حبیب بن اوس طائی ہے۔ پیدائش دمشق کے قریب جاسم نامی گاؤں میں ہوئی۔ دمشق میں پرورش پائی اور بچپن سے تعلیم وتعلم کی سرگرمیوں سے وابستہ ہوگیا، جس کی وجہ سے بہت ابتدائی عمر میں اس کی ادبی وعلمی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آنے لگیں۔ابتدا میں اس نے مدحیہ اشعار کہنا شروع کیا اور پھر زیادہ تر مدحیہ قصائد ہی کہے۔نوجوانی کی عمر میں مصر کا سفر کیا،وہاں کے اہل علم وادب کی صحبت اختیار کی اور ان سے سیکھا، کچھ دنوں بعد دمشق واپسی ہوئی،خلیفہ مامون کے دربار سے وابستہ ہوگیا،روم پر فتح یابی کے بعد اس کی تعریف میں قصیدے کہے۔ پھر مختلف شہروں کے دورے کرتا اور وہاں کے حکمرانوں کے درباروں میں حاضری دیتا رہا۔چوں کہ عباسی حکمران عموماً خود اہل علم ہوتے تھے اور صاحبانِ علم وادب کی قدردانی میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے؛ اس لیے ابوتمام جس حکمران کے یہاں جاتا وہاں سے شادکام ہوکر لوٹتا۔وہ انھیں نوازتے اور اس کے فن کی قدر کرتے۔

عباسی عہد کا ایک بڑا شاعر ابوتمام (192-231ھ) بھی ہے،اس کا پورا نام حبیب بن اوس طائی ہے۔ پیدائش دمشق کے قریب جاسم نامی گاؤں میں ہوئی۔ دمشق میں پرورش پائی اور بچپن سے تعلیم وتعلم کی سرگرمیوں سے وابستہ ہوگیا، جس کی وجہ سے بہت ابتدائی عمر میں اس کی ادبی وعلمی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آنے لگیں۔ ابتدا میں اس نے مدحیہ اشعار کہنا شروع کیا اور پھر زیادہ تر مدحیہ قصائد ہی کہے۔

اس کی شاعری میں جدت کے وہ نمونے ملتے ہیں، جنھیں بعد میں متنبی اور ابوالعلا معری نے آگے بڑھایا۔ ابوتمام کی شاعری کی خصوصیت معانی و افکار کی گہرائی اور محسنات بدیعیہ کا بخوبی استعمال ہے۔گہرے معانی پیدا کرنے کی کوشش کی وجہ سے بعض دفعہ اس کے یہاں پیچیدگی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔دورِ آخر کی شاعری میں اس پر فلسفیانہ رجحان بھی غالب نظر آتا ہے۔اس کا ایک مشہور قصیدہ ہے، جس میں ابوتمام نے معتصم کی بہادری کی تعریف کی ہے اور رومیوں پر اس کی فتح پر مبارکباد پیش کی ہے۔ جب معتصم جنگ پر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو نجومیوں نے اسے بتایا کہ علم نجوم کے اعتبار سے ابھی یہ جنگ مناسب نہیں ہے اور آپ اس وقت رومیوں پر حملہ نہ کریں، مگر معتصم نے اپنے دیگر مشیروں کے کہنے پر جنگ کا فیصلہ کیا اور اس جنگ میں اسے فتح بھی ملی۔ابوتمام نے اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان اشعار میں کہا ہے کہ جنگ لڑنے کے لیے طاقت وقوت اور ہتھیار کی ضرورت ہوتی ہے، جھوٹے علم اور پیش گوئیوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔اگر آپ طاقتور ہیں اور آپ کے پاس ہتھیارِ جنگ موجود ہیں تو بس آپ کو اپنے اوپر اعتماد کرتے ہوئے میدانِ جنگ کی طرف نکل پڑنا چاہیے، وہم وگمان پر مبنی کسی علم پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ چند اشعار دیکھیں:

اَلسَّيفُ أَصدَقُ أَنبَاءً مِنَ الكُتُبِ
فِي حَدِّهِ الحَدُّ بَيْنَ الجِدِّ وَاللَّعِبِ
بِيضُ الصَّفَائِحِ لاسُودُ الصَّحَائِفِ فِي
مُتُونِهِنَّ جَلاءُ الشَّكِّ وَالرِّيَبِ
وَالعِلْمُ فِي شُهُبِ الأَرْمَاحِ لَامِعَةً
بَيْنَ الخَمِيسَيْنِ لَا فِي السَّبعَةِ الشُّهُبِ
لَوْ بَيَّنَتْ قَطُّ أَمراً قَبلَ مَوقِعِهِ
لَمْ تُخْفِ مَا حَلَّ بِالأَوْثَانِ وَالصُّلُبِ
فَتحُ الفُتُوحِ تَعَالَى أَن يُحِيطَ بِهِ
نَظمٌ مِنَ الشِّعرِ أَو نَثرٌ مِنَ الخُطَبِ

’’ترجمہ: تلوار کتاب سے زیادہ سچی خبر دیتی ہے،اس کی دھار حقیقت اور مذاق کو ایک دوسرے سے ممتاز کردیتی ہے۔

کالے نہیں،سفید صفحات کے متون شک وارتیاب کو دور کرتے ہیں۔

صحیح علم تو افواج کے درمیان چمکنے والے نیزوں سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ سات ستاروں سے۔

اگر یہ ستارے ہونے سے پہلے کسی واقعے کی سچی خبر دے سکتے تو وہ صلیب اور بتوں کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بارے میں بھی بتادیتے۔

یہ اتنی عظیم فتح ہے کہ اس کا نظم یا نثر میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔‘‘

ابن الرومی بھی عہد عباسی کا بہترین شاعر ہے۔اس کی پیدائش 221ھ میں ہوئی اور وفات 283ھ میں ہوئی۔اس کا شمار عباسی دور کے تیسرے طبقے کے شعرا میں ہوتا ہے جس میں ابوتمام، بحتری اور ابن المعتز وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔اس طبقے کی خصوصیت شعر کی فنی خوبیوں پر توجہ دینے کے ساتھ معنوی گیرائی اور خیال کی گہرائی کا اہتمام بھی ہے، جو ابن الرومی کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ اسے

ہجوگوئی، طنز، مرثیہ، وصف بیانی وغیرہ میں کمال حاصل تھا۔ اپنے بیٹے کی وفات پر اس نے جو مرثیہ کہا تھا وہ آج بھی بہترین مرثیہ مانا جاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بكاؤكما يشفي وإن كان لا يُجدي
فجُودا فقد أَوْدَى نظير كُما عندي
بُنَيَّ الَّذي أَهْدَتْهُ كَفَّايَ للثَّرى
فَيا عِزَّةَ المُهْدَى ويا حَسْرةَ المُهْدِي
ألا قاتَلَ اللّهُ المَنايا وَرَمْيَها
مِنَ القَومِ حَبَّاتِ القُلوبِ على عَمْدِ
تَوَخَّى حِمَامُ الموتِ أَوْسَطَ صِبْيَتي
فللّهِ كيفَ اختارَ وَاسطَةَ العِقْدِ
على حين شِمْتُ الخيرَ من لَمَحاتِهِ
وآنَسْتُ مِن أفعاله آيةَ الرُّشْدِ

''ترجمہ: تم دونوں (آنکھوں) کا رونا شفا بخش ہے، گرچہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، پس تم دونوں خوب روؤ؛ کیوں کہ میرے پاس سے تم دونوں سے زیادہ قیمتی چیز کھوگئی ہے۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے عزیز بیٹے کو مٹی کے حوالے کیا ہے، کتنا عزیز تھا وہ جسے میں نے مٹی کے سپرد کیا اور کتنا حسرت زدہ ہے انھیں مٹی کے سپرد کرنے والا (یعنی میں)۔

اللہ موت کو اور اس کے نشانے کو تباہ کرے، جو لوگوں سے ان کے دل کے ٹکڑوں کو جان بوجھ کر چھین لیتی ہے۔

موت میرے بیچ والے بیٹے کو لے گئی، حیرت ہے کہ اس نے میرے بیٹوں میں سے سب سے محبوب کا انتخاب کیا۔

وہ بھی ایسے وقت میں جب مجھے اس کی نظروں میں خیر اور اس کے اعمال و افعال میں راستی اور افادیت کی علامتیں نظر آنے لگی تھیں۔''

ابوالطیب متنبی بھی عباسی دور کا مشہور و معروف شاعر ہے اور اس کی شہرت کا سورج آج تک پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہے۔ اس کا پورا نام احمد بن حسین ہے اور متنبی لقب ہے۔ پیدائش 303ھ میں کوفے میں ہوئی وہیں اس نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ بچپن سے طلب علم کا شوق تھا، اہل علم کی مجلسوں میں بیٹھا کرتا اور علما کے حلقوں میں شریک ہوتا، جس سے اسے کافی فائدہ ہوا اور ابتدائی عمر میں ہی اس کی ادبی صلاحیتیں نمایاں ہونے لگیں۔ اس کی طبیعت تجسس پسند تھی اور ایک جگہ ٹھہر کر رہنا نہ جانتا تھا، کبھی دیہات میں رہتا اور کبھی شہر کے سفر پر نکل پڑتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسے شہر سے نئی تہذیبی و ثقافتی قدریں ملیں اور دیہات سے زبان و بیان کی صحت و صلابت حاصل ہوئی۔

متنبی نے شاعری مکتب کی طالب علمی کے دور میں ہی شروع کردی تھی جس کی وجہ سے سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے اس کے کلام میں پختگی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ اپنی شاعری میں وہ کوفے میں موجود اہل علم اور صاحب اثر لوگوں کی تعریفیں کیا کرتا تھا، جو بعد میں اس کی شاعری کی پہچان بن گئی۔ مختلف شہروں میں پھرتے پھراتے وہ سیف الدولہ کے دربار میں پہنچا اور وہاں اسے خاصی پذیرائی اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ بانی امارت حلب سیف الدولہ نے اسے عزت و احترام کے ساتھ مال و منال سے بھی نوازا اور اسے اپنی محفلوں میں خاص اہمیت دینے لگا، جس کی وجہ سے پہلے سے موجود اس کے حاشیہ نشینوں میں متنبی کے تئیں حسد اور جلن بھی پیدا ہوگئی اور اس کے خلاف سازشیں کی جانے لگیں؛ چنانچہ عاجز آکر اس نے حلب کو خیر باد کہا اور مصر کی طرف نکل پڑا۔ وہاں کا والی کافور اخشیدی تھا، متنبی نے اس کی خوب تعریفیں کیں، اسے توقع تھی کہ اخشیدی اسے کوئی بڑا عہدہ دے گا، مگر اخشیدی نے توقع کے مطابق اس کی آؤ بھگت نہ کی، جس کے نتیجے میں متنبی نے اس کے خلاف بڑے سخت ہجویہ اشعار کہے اور وہاں سے چل نکلا۔ 453ھ میں اسے فاتک اسدی نے قتل کردیا۔ وہ فارس سے کوفہ لوٹ رہا تھا۔ اس سفر میں اس کے ساتھ اس کا بیٹا اور کچھ دوسرے لوگ بھی تھے۔

متنبی عربی زبان کے عظیم ترین شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی شاعری کئی صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی اہل ادب و نقد کے یہاں بے پناہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس نے بہت ہی خوب صورت مدحیہ اور فخریہ اشعار کہے ہیں۔ اس کی ہجویہ شاعری میں غیر معمولی سختی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ جس کی ہجو کررہا ہے اس کی جان ہی لے کر چھوڑے گا۔ اس کے وہ اشعار سب سے زیادہ قابل توجہ اور بہترین ہیں، جن میں اس نے اپنی زندگی

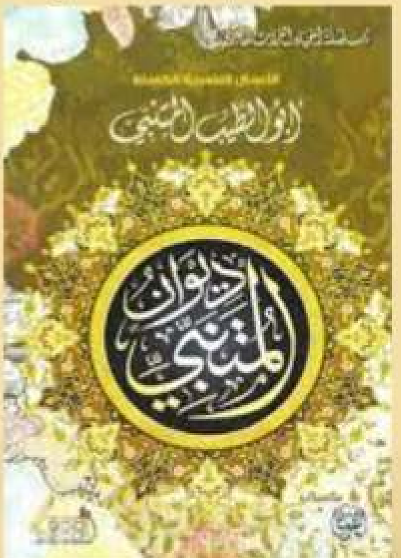

کے تجربات، مشاہدات اور مطالعات کی روشنی میں حکمت و دانش سے بھری باتیں کی ہیں۔ اس کے ایسے اشعار میں غیر معمولی حسن و جمال ہے اور انھیں پڑھ کر قاری بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کو اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ اس کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس میں سیف الدولہ کی تعریفیں کی ہیں، مگر اس قصیدے کے بہت سے اشعار عام انسانی زندگی اور اس کے احوال و کیفیات کی بھی خوب صورت ترجمانی کرتے ہیں، چند اشعار دیکھیے۔

عَلى قَدرِ أَهلِ العَزمِ تَأتي العَزائِمُ
وَتَأتي عَلى قَدرِ الكِرامِ المَكارِمُ
وَتَعظُمُ في عَينِ الصَغيرِ صِغارُها
وَتَصغُرُ في عَينِ العَظيمِ العَظائِمُ
يُكَلِّفُ سَيفُ الدَولَةِ الجَيشَ هَمَّهُ
وَقَد عَجِزَت عَنهُ الجُيوشُ الخَضارِمُ
وَيَطلُبُ عِندَ النَاسِ ما عِندَ نَفسِهِ
وَذَلِكَ ما لا تَدَّعيهِ الضَراغِمُ
يُفَدّي أَتَمُّ الطَيرِ عُمراً سِلاحَهُ
نُسورُ المَلا أَحداثُها وَالقَشاعِمُ

ترجمہ: انسان کا عزم جتنا بڑا ہوتا ہے وہ اسی قدر بڑے اہداف حاصل کرتا ہے اور جو جتنا شریف النفس ہوتا، اس کے اندر اسی قدر اچھائیاں پائی جاتی ہیں۔

چھوٹے اور کم ہمت لوگوں کو معمولی چیزیں بھی بڑی معلوم ہوتی ہیں، جبکہ بڑے اور باہمت لوگوں کو بڑی مہمات بھی حقیر معلوم ہوتی ہیں۔

سیف الدولہ اپنی فوج میں وہ عزم و حوصلہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ خود متصف ہیں اور ایسا عزم و حوصلہ تو بڑی بڑی افواج میں بھی نہیں پایا جاتا۔

وہ چاہتے ہیں کہ جیسی شجاعت و بہادری ان کے اندر پائی جاتی ہے، وہی اور لوگوں میں بھی پائی جائے، مگر یہ تو شیروں میں بھی ناپید ہے۔

عمر دراز اور نوجوان گدھ ان کے ہتھیاروں پر اپنی عمریں نچھاور کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

ان اشعار میں الفاظ کی سلاست، تراکیب کی خوب صورتی اور سادگی اور معانی کی گہرائی و گیرائی یہ سارے اوصاف بہ تمام و کمال پائے جاتے ہیں اور یہی متنبی کا امتیاز ہے۔

■

Md. Nayab Hasan
A-22, Seema Apts.
Gali No.: 7, Batla House
New Delhi - 110025
Mob.:70110797777
Email.: nh912823@gmail.com

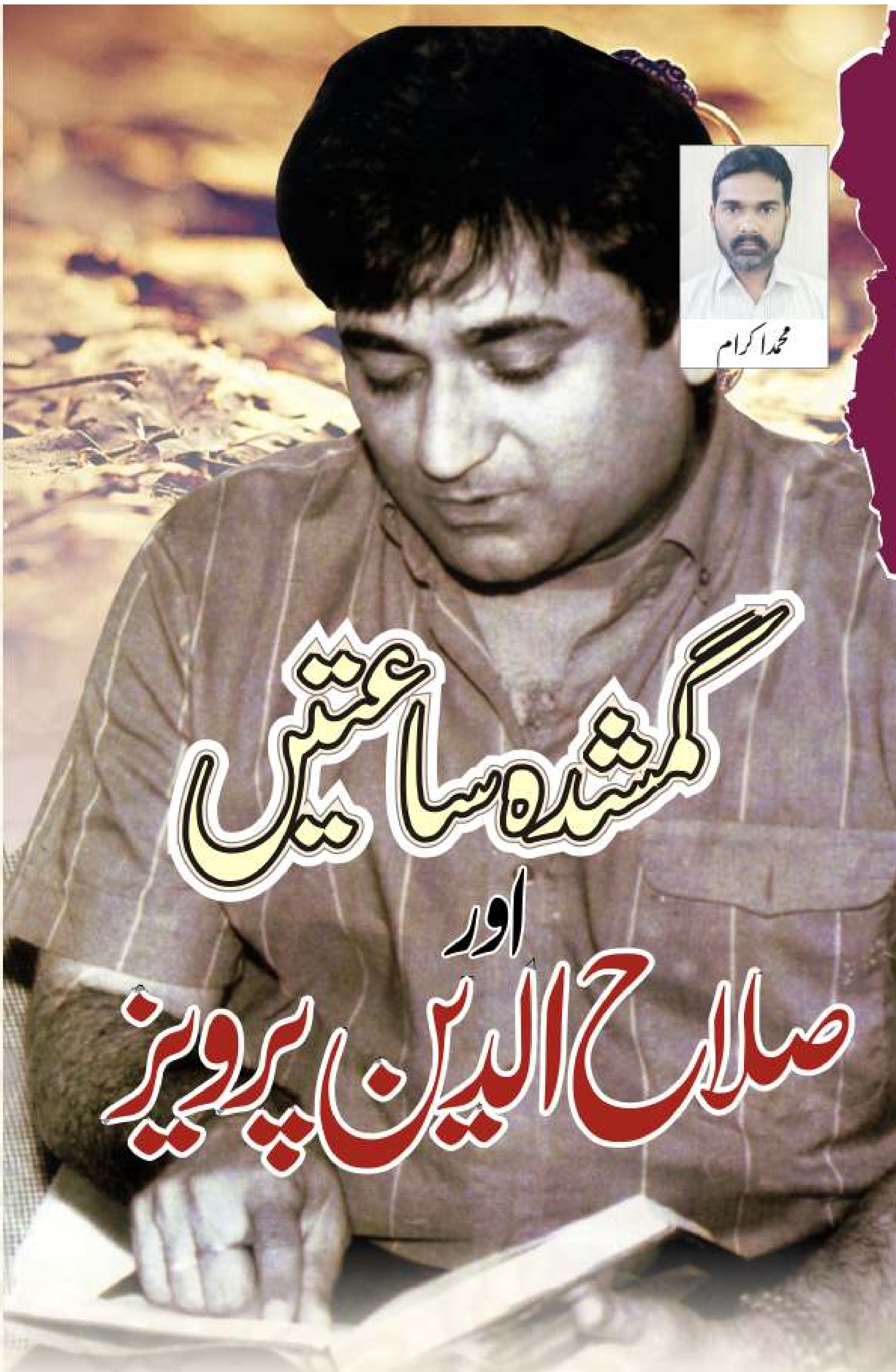

محمد اکرام

گمشدہ ساعتیں اور صلاح الدین پرویز

27 اکتوبر 2011 کو جب صلاح بھائی کے انتقال کی خبر ملی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کے ساتھ ساتھ 20 اکتوبر 1998 کا وہ دن یاد آ گیا جب میں جامعہ سلفیہ بنارس سے فضیلت کر کے دہلی آیا تھا اور ڈی ٹی پی کمپیوٹر کورس میں داخلہ لے لیا تھا۔ 1999 کے وسط میں ریحان عباسی صاحب کے دفتر افراح کمپیوٹر سینٹر (بٹلہ ہاؤس) میں مجھے ملازمت مل گئی۔ کچھ دنوں کے بعد زبیر رضوی جیسے ممتاز شاعر سے ملاقات ہوئی جن کی زبان سے فلم، موسیقی کی باتیں میں نے سنیں۔ ریحان عباسی صاحب مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ انھیں جانتے ہی ہوں گے یہ فلموں میں گانے وغیرہ بھی لکھتے ہیں۔ ریحان عباسی صاحب کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس لیے میں اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ پھر اس طرح کی باتیں روزمرہ کا حصہ بن گئیں۔

سنہ 2000 کا واقعہ ہے جب صلاح الدین پرویز کے ذہن میں سہ ماہی رسالہ 'استعارہ' نکالنے کا خیال آیا۔ یہ خبر ادبی حلقوں میں گشت کرنے لگی۔ ایک دن دفتر میں زبیر رضوی کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے کہ صلاح الدین پرویز کا ذکر آ گیا۔ وہاں پرویز صاحب اور ان کے رسالے کے تعلق سے کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

اتفاق سے ایک دن صلاح الدین پرویز سہ ماہی 'استعارہ' کے پہلے شمارے کے کچھ حصے کی کمپوزنگ کے سلسلے میں اپنے دوستوں حقانی القاسمی، شعیب رضا فاطمی کے ہمراہ عباسی صاحب کے دفتر حاضر ہوئے۔ کام کے سلسلے میں عباسی صاحب سے کچھ باتیں کیں اور واپس چلے گئے۔ لیکن آنے جانے کا سلسلہ میگزین کے مکمل ہونے تک جاری رہا۔ یہ اور بات کہ صلاح الدین پرویز افراح کمپیوٹر سینٹر کے اندر کم ہی آتے تھے۔ کچھ عرصے بعد دوسرے شمارے کے سلسلے میں پھر ان لوگوں کا دفتر میں آنا ہوا۔ اسی درمیان صلاح الدین پرویز کے دوست اور سہ ماہی 'استعارہ' کے شریک مدیر حقانی القاسمی مجھے باہر بلا کر لے گئے جہاں صلاح الدین پرویز بھی موجود تھے، انھوں نے مجھے استعارہ کے دفتر میں ملازمت کی پیشکش کی۔ پہلے تو میں ہچکچایا کیونکہ صلاح الدین پرویز کے بارے میں میں نے بہت سی بے سروپا باتیں سن رکھی تھیں، میں یہ کہہ کر دفتر واپس آ گیا کہ سوچ کر بتائیں گے۔ بالآخر کچھ غور وخوض کے بعد ہم نے انھیں اگلی ملاقات میں اثبات میں جواب دیا اور پھر ہم بھی ان کے دفتر کا ایک حصہ بن گئے۔

استعارہ کے دفتر میں پہلے ہی دن مجھے کافی سکون محسوس ہوا۔ یہاں آفس کا ماحول کم گھریلو ماحول زیادہ تھا، صلاح بھائی نے مالک اور ملازم کے بیچ کا فاصلہ کبھی رکھا ہی نہیں کیونکہ ان کا رویہ ہمیشہ دوستانہ رہا۔ میں نے اکثر انھیں خوش دیکھا، اگر کبھی ان کا دل رنجور بھی ہوا تو یہ فرق کرنا مشکل ہوتا تھا کہ وہ غمزدہ ہیں۔ حالانکہ وہ دوسروں کے چہرے کی اداسی کو فوراً ہی بھانپ لیتے تھے۔ اگر ہم میں سے کسی کو اداس دیکھتے تو کہتے، میری جان! اداس کیوں ہو، کوئی پریشانی ہے کیا، کوئی بھی بات ہو کھل کر بتاؤ، میں تمھارا بڑا بھائی ہوں نہ کہ تمھارا باس! ('میری جان' صلاح الدین پرویز صاحب کا تکیہ کلام تھا)۔

استعارہ کے دفتر میں ادبا اور شعرا کی آمد سے وہاں ہر وقت جشن کا ماحول رہتا تھا، مہمانوں کے لیے چائے اور کھانے کا معقول انتظام رہتا تھا۔ کبھی کبھار لوگ بلا ضرورت بھی استعارہ کے دفتر میں حاضر ہوجاتے اور چائے کی چسکیوں کے ساتھ صلاح الدین پرویز کی دل موہ لینے والی باتوں سے محظوظ ہوتے رہتے، کیونکہ پرویز صاحب کو ان مہمانوں کی آمد سے قلبی سکون ملتا تھا۔ آفس میں آنے کے بعد اگر کبھی آفس کو مہمانوں سے خالی دیکھتے تو ان کا دل اچاٹ سا ہوجاتا اور وہ جلد ہی دفتر سے اپنے گھر ذاکر باغ واپس لوٹ جاتے۔ دفتر سے گھر واپسی پر وہ ہم لوگوں (حقانی القاسمی، احمد صغیر اور راقم الحروف) کو اپنی کار میں بٹھا لیتے، کبھی تکونا پارک تو کبھی غفار منزل کے موڑ پر چھوڑ دیتے، پھر وہاں سے ہم لوگ پیدل اپنی اپنی قیام گاہ کو روانہ ہوجاتے۔

صلاح الدین پرویز نہایت مخلص، ہمدرد، خوش اخلاق، خوش مزاج، خوش اطوار، خوش وضع، خوش طبع تھے، ہم انھیں جتنے بھی القاب سے یاد کریں کم ہے۔ ملازمت

کے دوران صلاح الدین پرویز کو بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ میرے دل میں ان کے بارے میں جو شکوک وشبہات تھے وہ سب ایک ایک کرکے ختم ہوگئے اور فارسی کا یہ شعر ذہن میں گردش کرنے لگا کہ ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' کسی بھی شخصیت کے بارے میں کسی سے سن کر کوئی فیصلہ کرنا بہت بڑی حماقت اور بھول ہے۔ شاید اسی لیے اچھے اور برے اشخاص میں تمیز کے لیے شریعت نے بھی کچھ اصول وضوابط بیان کیے ہیں۔

صلاح الدین پرویز جیسے مخلص انسان سماج اور معاشرے میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ یہ وہ دردمند انسان تھا جس کا دل دوسروں کے درد کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا، کسی غریب، مفلس اور مجبور کو دیکھتے ہی مدد کے لیے وہ ہمہ وقت تیار رہتے۔ غریبوں کی مدد کے سلسلے میں ان کا یہ حال تھا کہ بغیر دیکھے ہوئے جو بھی جیب سے نکلتا اس کے

عادتیں ایک فرشتہ صفت انسان کے اندر ہی ہوسکتی ہیں۔

دہلی ہی نہیں صلاح الدین پرویز ہندوستان میں جہاں جہاں بھی سفر کرتے، وہ اپنے رشتے داروں، دوست واحباب میں اپنی فیاضی اور رحم دلی کے لیے مشہور تھے۔ اسی طرح کے ایک واقعے کو یاد کرتے ہوئے علی گڑھ کے پروفیسر شہریار نے لکھا تھا:

''میرے تئیں ان کا احترام علی گڑھ میں افواہ کے طور پر مشہور ہے، اسی لیے جب بھی وہ علی گڑھ آتے ہیں، لوگوں کا تانتا میرے گھر بندھ جاتا ہے۔ کام صلاح الدین پرویز سے سفارش کرنا ہوتا ہے۔ میں لاکھ لاکھ کہتا ہوں کہ میں بہت سے لوگوں کی سفارش کرچکا ہوں۔ میرے کہنے یا لکھنے کا کوئی اثر نہ ہوگا لیکن میری کوئی نہیں سنتا۔ ہر شخص یہی کہتا ہے کہ وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔ لوگوں کے اس یقین کے ذمے دار خود صلاح الدین

ہوئے آپس میں لوگ چہ میگوئیاں کرتے کہ میگزین نکالنا تو ہر زمانے میں گھاٹے کا سودا رہا ہے پھر صلاح الدین پرویز کے پاس کیا کوئی پیسے والا درخت ہے جہاں سے پرویز کو یہ پیسے حاصل ہوتے ہیں۔ کسی رسالے کے دفتر میں جائیں تو وہاں بیٹھنے کی جگہ نصیب نہیں ہوتی، ضیافت تو دور کی بات ہے لیکن صلاح الدین پرویز کے دفتر میں مہمانوں کی اس قدر آؤ بھگت ہوتی کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اُردو رسالے کا دفتر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی بزنس مین کا آفس ہے۔ تفریحاً صلاح الدین پرویز بھی کبھی کبھی اپنے دوست واحباب سے کہتے کہ یار رسالے کے خریدار تو بناؤ، اور خریدار بھی مجھے لائف ٹائم کا چاہیے۔

ان کے دوست صلاح الدین پرویز کی نیت کو بھانپ جاتے تھے۔ پھر بھی اگر کوئی رسالے کا پیسہ دیتا تو صلاح الدین پرویز یہ کہہ کر واپس کردیتے کہ یار میں تو مذاق

حوالے کردیتے۔ بہت سے مسکین اور محتاج ایسے بھی تھے جو شاید صلاح الدین پرویز کے انتظار میں رہتے تھے۔ ان میں ایک بزرگ مسکین غفار منزل گلی نمبر 1 کے موڑ پر اس امید پر بیٹھا رہتا کہ صلاح الدین پرویز جیسا فیاض اور سخی آدمی ابھی یہاں سے گزرے گا۔ اس بزرگ، فقیر سے صلاح بھائی کو بھی اتنی محبت ہوگئی تھی کہ جب وہ نظر نہ آتا تو بہت اداس لہجے میں پوچھتے کہ ذرا پتہ کرو انھیں کچھ ہو تو نہیں گیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ استعارہ کے ایک شمارے کا انتساب انھوں نے غفار منزل کی سڑک پر بیٹھے اس فقیر کے نام کچھ اس طرح کیا تھا ''غفار منزل کی سڑک کے کنارے بیٹھنے والے اس بوڑھے فقیر کے نام جو بھیک مانگ کر اپنے بچے کو اردو کی تعلیم دلا رہا ہے۔''

بہت سے ادیب وشاعر اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہر مہینے صلاح بھائی کے دفتر پہنچتے اور انھوں نے کبھی کسی کو مایوس واپس نہیں ہونے دیا ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو صلاح الدین پرویز کی فیاضی کا ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ بہت سے رسالے تھے جو صلاح الدین پرویز کی مالی معاونت سے شائع ہوتے تھے۔ اپنی دولت انھوں نے دوسروں پر بے دریغ لٹائی، اس عمل سے شاید صلاح الدین پرویز کو ذہنی اور قلبی سکون ملتا تھا۔ یہ ساری

پرویز ہیں۔ وہ بھی سب سے یہی کہتے ہیں کہ ''میں شہریار صاحب کی بات نہیں ٹالوں گا۔'' ویسے ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھے اس کی بالکل خبر نہیں کہ میرے کہنے یا لکھنے سے کسی کا بھلا ہوا بھی کہ نہیں۔ ہاں یہ بات میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ صلاح الدین عادتاً فیاض اور مزاجاً رحم دل انسان ہیں۔ بمبئی میں چند ماہ رہنے اور دولت مندوں سے ملنے جلنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دولت کو انسانیت سے بیر ہے۔ صلاح الدین کے یہاں صورت برعکس دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا...''

ادبا اور شعرا کی صلاح الدین پرویز بے حد عزت اور خاطر تواضع کرتے تھے۔ سیمیناروں میں تو صلاح الدین پرویز کا کم ہی آنا جانا ہوتا تھا۔ البتہ دہلی میں کوئی سیمینار منعقد ہوتا اور دوسرے شہروں سے جو بھی سیمینار میں شرکت کے لیے آتے، تو صلاح الدین پرویز کے گھر کا دروازہ ان کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا۔ پاکستان کے ادیبوں کی تو صلاح الدین پرویز خاص طور پر ضیافت کرتے۔ ان کے قیام وطعام کا حتی الامکان صلاح الدین پرویز انتظام کرتے۔ کبھی کبھار مہمانوں کی اپنے شہر واپسی پر انھیں تحفے تحائف سے بھی نوازتے۔

صلاح الدین پرویز کی فیاضانہ صفت کو دیکھتے

کررہا تھا۔ تمھارا بھائی اتنا کمزور نہیں ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے پیسے سے رسالے کا سلسلہ جاری رکھے۔ کبھی کبھی تو یہ بھی ہوا کہ 400 روپے سالانہ خریدار بنانے کے لیے وہ 2000 سے زیادہ خرچ کردیتے تھے اور بعد میں خوش ہوکر کہتے کہ دیکھو میں نے اتنے خریدار بنا لیے۔ بارہا صلاح الدین پرویز کو تو یہ بھی کہتے سنا گیا ہے کہ میرا رسالہ نکالنے کا مقصد شہرت نہیں بلکہ وقت گزاری ہے۔ اسی بہانے میں کچھ اپنی سناتا ہوں تو کچھ دوسروں کی سن لیتا ہوں اور اس عمل سے مجھے ذہنی اور قلبی سکون ملتا ہے۔

صلاح الدین پرویز کو تصوف سے بے حد لگاؤ تھا۔ روحانیت ان کی طبیعت میں رچی بسی ہوئی تھی۔ جب وہ کوئی اہم کام کی شروعات کرتے تو حافظ کے دیوان سے فال نکلواتے۔ جلال الدین رومی سے انھیں بے حد عقیدت تھی۔ تصوف اور بھکتی کا جب بھی ان کے یہاں ذکر ہوتا تو یہ نام ان کی زبان پر ضرور آتا۔ ہندوستان میں بھی خواجہ معین الدین چشتی اجمیری اور محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء سے وہ عقیدت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پرویز صاحب اجمیر اور دلی کی اکثر زیارت کرتے رہتے تھے۔ دہلی آپ کی جائے سکونت تھی اس لیے اکثر جمعرات کو نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر آپ کی حاضری ضروری تھی۔

آشفتہ چنگیزی نے اپنے ایک مضمون میں صلاح الدین پرویز کی روحانی عقیدت مندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صلاح الدین کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاء سے اجازت لینے ضرور جاتے ہیں۔ وقت بہت تنگ تھا۔ یونس دہلوی صاحب آخری ملاقات کی غرض سے حسب وعدہ 7 بجے اشوکا ہوٹل پہنچ چکے تھے اور لابی میں بیٹھے ہمارے منتظر تھے۔ جہاز کی روانگی میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ اشوکا ہوٹل سے بستی نظام الدین اور پھر واپس ایئرپورٹ... مشورہ کیا گیا۔ میری اور محمود بھائی کی رائے تھی کہ کیوں نہ درگاہ کی طرف رخ کیا جائے اور یہیں سے بابا کو سلام کرلیا جائے۔ لہٰذا پرویز تو بالکونی میں چلے گئے اور راز و نیاز میں مشغول ہوگئے۔ دریں اثناء رپورٹرس کو بلا لیا گیا اور تین مسافروں آشفتہ، پرویز اور بیگم پرویز اور الوداع کہنے والے محمود ہاشمی، ثریا سعید، فرحت احساس، یونس دہلوی اور اعجاز بھائی کا یہ قافلہ ہوٹل کے ضابطوں سے نمٹتا ہوا ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوگیا۔

میں فرحت احساس اور اعجاز بھائی الگ گاڑی میں تھے اور باقی حضرات یونس دہلوی کی گاڑی میں ہوٹل سے چلے تھے۔ ہم تین لوگوں نے ایئرپورٹ پہنچ کر باقی حضرات کی تلاش شروع کی... ایک گھنٹہ بیت گیا مگر یہ لوگ ندارد۔ میں نے بورڈنگ پاس حاصل کر لیے۔ روانگی کی آخری کال بھی ہوگئی مگر ابھی تک یہ لوگ دکھائی نہیں پڑے۔ میں عجیب کشمکش میں تھا کہ یہ یکا یک پرویز اپنی دیرینہ شان بے نیازی کے ساتھ دکھائی پڑے۔ تاخیر کی وجہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بالکونی والے راز و نیاز سے انہیں تشفی نہیں ہوئی تھی اور وہ بہ نفس نفیس حاضری کی غرض سے درگاہ چلے گئے تھے۔''

صلاح الدین پرویز کی زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ آئے۔ ہندوستان واپسی پر صلاح الدین پرویز کے پاس اپنا کوئی بزنس تو نہیں تھا، ان کے بڑے بھائی عبدالسلام قریشی کے ذریعے جو پیسے انھیں ملتے تھے اسی پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ جب بڑے بھائی کی طرف سے ان کے پاس پیسے کی فراوانی تھی تو اس وقت صلاح الدین پرویز کا ہاتھ بہت کشادہ تھا۔ دھیرے دھیرے جب پیسے کی تنگی ہوتی گئی اور ضروریات بڑھتی گئیں تو صلاح الدین پرویز کے طرز زندگی میں کافی بدلاؤ آیا، اس کے باوجود دوسروں کی مدد کرنا ان کی عادت میں شامل رہا۔ 2003 کے بعد صلاح الدین پرویز کی زندگی کا مشکل دور شروع ہوا تو وہ ذاکر باغ کا اپنا مکان بیچ کر مظفر حنفی کے مکان میں شفٹ ہوگئے تھے۔ 2004 میں اپنی علی گڑھ کی لمبی چوڑی پراپرٹی بھی بیچ ڈالی۔ 2005 میں غفار منزل کا فلیٹ بیچ دیا۔ اب ان کے رہنے کے لیے صرف گریٹر نوئیڈا کا ہی مکان بچا تھا۔ ان کے بڑے بھائی نے بھی ان کے حصے کے پیسے کم کر دیے۔ اس دوران صلاح الدین پرویز کافی پریشان رہنے لگے۔ کبھی کبھار جب پیسے کی ضرورت محسوس ہوتی اور پاکٹ خالی ہوتا تو کہتے: ایک وقت تھا کہ بورے میں پیسے بھرے جاتے تھے اور آج یہ وقت ہے کہ جیب میں دس بیس روپے بھی نہیں ہیں۔ ان کا مشکل بھرا سفر ان کی وفات تک جاری رہا۔ 2008 میں وہ بہت بیمار ہوگئے۔ تقریباً 40 دنوں تک ہولی فیملی، سجان اور میکس میں ایڈمٹ رہے۔ میکس میں تو تین بار ڈاکٹروں نے وینٹی لیٹر پر ڈال دیا۔ اس بیچ ان کی فیملی کے سارے ممبر یہاں تک کہ ان کے بڑے بھائی عبدالسلام قریشی صاحب بھی 25 سالوں کے بعد چھوٹے بھائی کی شفقت اور محبت میں ان سے ملنے ہندوستان آگئے۔ ابھی صلاح الدین پرویز کی زندگی کے کچھ سال باقی تھے۔ وہ رو بہ صحت ہوگئے۔ لیکن ان کے بچوں نے میرے کہنے پر استعارہ آفس کو بند کروا دیا جو صلاح الدین پرویز کے لیے جائے سکون تھا، اس کے کچھ دنوں بعد گریٹر نوئیڈا کا مکان بھی فروخت کردیا۔ یہ صلاح الدین پرویز کے لیے مشکل بھرا وقت تھا جو انھیں برداشت کرنا پڑا۔ بالآخر صلاح الدین پرویز نے 2008 کے آخر میں علی گڑھ میں جائے سکونت اختیار کی، جہاں ان کے پاس ایک چھوٹا سا فلیٹ اور اوسط درجے کی گاڑی تھی۔ علی گڑھ میں مکان ہونے کے باوجود ان کا زیادہ تر وقت بنگلور میں اپنی پہلی بیوی سیدہ بی بی صادقہ کے ساتھ گزرتا تھا۔ انھوں نے صلاح الدین پرویز کی زندگی میں جب بھی مشکلات پیش آئیں، ان کا حوصلہ بڑھایا اور ان کے شانہ بہ شانہ کھڑی رہیں۔ سیدہ بی بی صادقہ نے شاید ایم اے (انگریزی) کی ڈگری بھی صلاح الدین پرویز کے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایک ساتھ حاصل کی تھی۔ ان مشکل بھرے دنوں میں صلاح الدین پرویز کا قلم و کاغذ سے رشتہ بھی تقریباً منقطع ہوچکا تھا، لیکن جب صحت میں تھوڑی بہتری آئی تو صلاح بھائی کی پہلی بیگم نے انھیں قلم اور کاغذ سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کی ترغیب دلائی۔ بقول صلاح الدین پرویز بنگلور میں ان کے ذوق کی کتابیں تو تھیں نہیں۔ ان کی بیوی سیدہ بی بی صادقہ نے انھیں غالب کا انگلش ورژن پڑھنے کو دیا جنھیں پڑھ کر صلاح الدین پرویز کی غالب فہمی میں اضافہ ہوا اور کچھ نئے انکشافات ہوئے جو انھیں اردو ورژن میں نہیں ملے تھے۔ بہرحال صلاح الدین پرویز نے غالب کی غزلوں پر نظمیں لکھنی شروع کیں اور ان کی آخری کتاب 'بنام غالب' 2011 میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے ذریعے ایک نئے صلاح الدین پرویز کا جنم ہوا اگر وہ کچھ دن اور باحیات رہتے تو ہمیں ان کے ذریعے کچھ اور شاہکار دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے۔ لیکن قدرت کے فیصلے کو کون ٹال سکتا ہے۔ آخرکار صلاح الدین پرویز کی زندگی کا سفر علی گڑھ میں آکر ختم ہوگیا اور 27 اکتوبر 2011 کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

صلاح الدین پرویز کا اصل نام صلاح الدین پرویز قریشی ہے۔ آپ کی پیدائش 9 فروری 1952 بمقام الہ آباد ہوئی۔ مگر ان کا اصلی وطن نیپال کی ترائی میں واقع ایک گاؤں سنگھائی ہے جہاں اُن کے آبا و اجداد نے مکے سے آکر اقامت اختیار کرلی تھی۔ ان کے آبا و اجداد مشرق وسطی سے ہندوستان آئے تھے۔ ان بزرگوں نے سعودی عرب کے ریگ زاروں میں بھی وقت گزارا تھا اور عراق کی سرزمین پر قسمت آزمائی بھی کی تھی جس کی بنا پر یہ لوگ اسرائیلی بھی کہلاتے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم دہرہ دون، الہ آباد، بنارس اور بھوپال میں ہوئی جب کہ اعلی تعلیم میں بی اے کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے (1968) میں حاصل کی اور ایم اے (انگریزی) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے (1970) میں پاس کیا۔ بعد میں امریکہ سے 1971 میں بزنس مینجمنٹ اور کمپیوٹر ٹکنالوجی

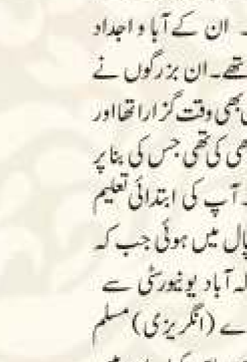

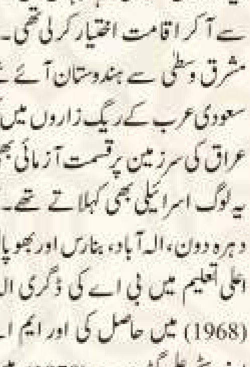

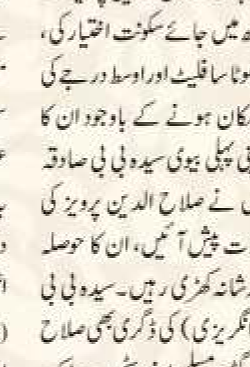

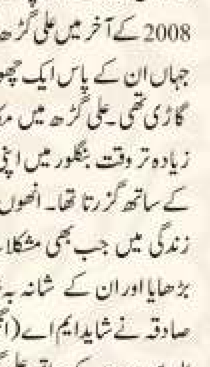

کورس بھی پورا کیا۔

صلاح الدین پرویز کی ملازمت کا آغاز ان کے بڑے بھائی کی کمپنی سائیسوریکس انٹرنیشنل (یہ امریکن کمپنی ہے جو کمپیوٹر کا کام کرتی ہے) سے ہوا۔ آپ نے اس کمپنی میں ریسرچر کی حیثیت سے 78-1976 تک کام کیا۔ ان کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے انھیں کمپنی کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا جہاں انھوں نے 80-1978 تک اپنی ذمے داری بخوبی نبھائی۔ واضح رہے کہ اس کمپنی میں ان کے تحت 1700 ملازمین کام کرتے تھے۔ پھر اس کمپنی کی 1991 میں توسیع ہوئی اور امریکہ کے علاوہ ریاض میں بھی اس کا سینٹر قائم ہوگیا اور آپ ڈائرکٹر سے جنرل منیجر اور وائس پریسیڈنٹ بنا دیے گئے اور ملازمین کی تعداد بھی اضافے کے بعد تقریباً 2000 ہوگئی۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد صلاح الدین پرویز سعودی عرب چھوڑ کر ہندوستان آگئے اور دہلی کے ذاکر باغ میں سکونت اختیار کی۔

صلاح الدین پرویز کی شناخت ادیب، شاعر، تخلیق کار، فلم ساز، اسکرپٹ رائٹر اور گیت کار کی حیثیت سے ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے آپ نے شاعری شروع کردی تھی۔ آپ کی ادبی زندگی کی ابتدا 1964 سے ہوتی ہے۔ ان کی پہلی نظم 'پھول کھلے ہیں' ماہنامہ 'صبا' حیدر آباد دکن میں شائع ہوئی۔

اس کے بعد ان کی ایک طویل نظم 'ژاژ' 1973 میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔

صلاح الدین پرویز کی تصنیفات و تالیفات کی لمبی فہرست ہے۔ ان کی کتابیں ہر خاص و عام میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، خاص کر پاکستان میں صلاح الدین پرویز کو پسند کرنے والے زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صلاح الدین پرویز کی 'کتاب عشق' پاکستان میں بہت پسند کی گئی اور جیلانی کامران جیسے بلند پایہ دانشور نے اس پر بیش قیمت مقدمہ بھی تحریر کیا۔ آپ کی کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے:

ژاژ (1973)، تکیٹو (1974)، جنگل (1978)، دھوپ سمندر سایہ (1980)، لو پوئمز (1982)، دھوپ سرائے (1983)، لوریاں (1986)، خطوط (1987)، کنفیوژن (1990)، بھی رنگ ساون کے (1994)، بھی ساون اپنے (1996)، پرماتما کے نام آتما کے پتر (1998)، دشت تحیرات (1999)، کتاب عشق (2000) اور بنام غالب میں (2011) (یہ ساری کتابیں شاعری پر مشتمل ہیں) ان کے علاوہ آپ نے ناول بھی لکھے ہیں جن میں نمرتا (1983)، سارے دن کا تھکا ہوا پرش (1985)، اک دن بیت گیا (1987)، آئیڈنٹٹی کارڈ

صلاح الدین پرویز نے شروع سے ہی ادیبوں کی بھیڑ سے الگ ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی صلاح الدین پرویز کی کوئی نئی تخلیق وجود میں آئی تو اردو ادب میں بحث کا دور شروع ہوجاتا، کچھ لوگ صلاح الدین پرویز کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے تو کچھ ایسے بھی تھے جو یہ کہہ کر مسترد کردیتے کہ یہ بھی کوئی تخلیق ہے، یہ محض صلاح الدین پرویز کے دل کا غبار ہے جس کا اظہار وہ اپنی تخلیقات کی اشاعت سے کرتے ہیں۔

(1989)، دی وار جرنلس (2003) اور ایک ہزار دو راتیں (2006)۔

صلاح الدین پرویز کی کتابوں میں 'بھی ساون اپنے' ہندی زبان میں بھی شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مشہور ناول 'نمرتا' تینوں زبانوں (اردو، ہندی اور انگلش) میں شائع ہوا ہے۔ 'دی وار جرنلس' کی اشاعت بھی اردو کے علاوہ انگلش میں ہوئی ہے۔

صلاح الدین پرویز کی ان تمام کتابوں کے حوالے سے 'تنقیدی اسملاژ' (مرتب: حقانی القاسمی) ایک جامع اور بہت وقیع کتاب ہے، جس میں ہندوستان اور پاکستان کے موقر ادیبوں کے عمدہ مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے صلاح الدین پرویز کی حیات اور ادبی خدمات کے بہت سے پہلو روشن ہوسکتے ہیں۔

صلاح الدین پرویز کی سب سے پہلی کتاب کا نام ہے 'ژاژ' جو 1973 میں اشاعت پذیر ہوئی۔ دراصل یہ ایک طویل نظم تھی۔ جب صلاح الدین پرویز نے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا تو اس وقت طویل نظمیں کہنے یا لکھنے کا چلن بہت کم تھا، طوالت کے لیے مثنوی، قصیدے اور مرثیے ہی مشہور تھے، لیکن صلاح الدین پرویز نے شروع سے ہی ادیبوں کی بھیڑ سے الگ ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی صلاح الدین پرویز کی کوئی نئی تخلیق وجود میں آئی تو اردو ادب میں بحث کا دور شروع ہوجاتا، کچھ لوگ صلاح الدین پرویز کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے تو کچھ ایسے بھی تھے جو یہ کہہ کر مسترد کردیتے کہ یہ بھی کوئی تخلیق ہے، یہ محض صلاح الدین پرویز کے دل کا غبار ہے جس کا اظہار وہ اپنی تخلیقات کی اشاعت سے کرتے ہیں۔

'کتاب عشق' صلاح الدین پرویز کی شاہکار تخلیق ہے جس کی اشاعت 2000 میں ہوئی ہے۔ کتاب کو دو باب میں تقسیم کیا گیا ہے: الباب الاوّل کے تحت صلاح الدین پرویز کا پیش لفظ اور خدا کے نام چالیس مکتوب شامل ہیں۔ جب کہ دوسرے باب میں، مقدمہ [جیلانی کامران] کے علاوہ قصۃ العشق... [محمد صلاح الدین پرویز]، خموش کردم اے جان جاں...، من خمش کردم...، عنکبوتی راہ حکمت...، بار اشک...، انا من اھوی...، ایں صورت بت چیست...، چمنی کہ تا قیامت...، ہر نفس آواز عشق...، خموش گر بگویم...، تبسم رخ خورشید...، ہر کہ او ہم رنگ...، شمس الحق جہانم...، یا کوکبا تجلّے کوکب الفلکی، بندہ آمد...، از بس کہ... جیسے عناوین شامل ہیں۔

'نمرتا' صلاح الدین پرویز کا مشہور ناول ہے جو عام ناولوں سے بالکل الگ ہے۔ صلاح الدین پرویز بنیادی طور پر شاعر ہیں اس لیے ان کے ہر ناول میں نثر کے ساتھ شاعری موجود ہوتی ہے۔ یہ ناول بھی نثر و نظم کے تخلیقی امتزاج کی انوکھی مثال ہے۔ 'نمرتا' میں نو ادھیائے ہیں۔ بنیادی طور پر اس ناول میں دو کردار ہیں 'نمرتا' اور 'نیل کنٹھ' جو مطالعے کے دوران مختلف رنگ و روپ میں نظر آتے ہیں۔

ناول میں نمرتا کو کئی روپ میں دکھایا گیا ہے جیسے 'ماں نمرتا، بیٹی نمرتا، بہو نمرتا، بہن نمرتا، شکنتلا نمرتا، ساوتری نمرتا، حوا نمرتا، ہاجرہ نمرتا، مریم نمرتا، فاطمہ نمرتا، زینب نمرتا...' وغیرہ وغیرہ۔ محمود ہاشمی نے ان دو کرداروں 'نمرتا' اور 'نیل کنٹھ' کی نہایت عمدہ انداز میں وضاحت کی ہے:

صلاح الدین پرویز کی 'نمرتا' اپنی ابتدا سے انتہا تک انسان کے باطن کے ہفت خواں کی تلاش و جستجو کا استعارہ ہے۔ اس کے دو کردار ایک جہان معنی سمیٹے ہوئے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کردار خود اپنی ارفع ذات کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔"

(تنقیدی اسملاژ، مرتب: حقانی القاسمی، سنہ اشاعت: 2011، ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی 115)

صلاح الدین پرویز کا چوتھا ناول 'آئیڈنٹٹی کارڈ' ہے جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تھا۔ بنیادی طور پر یہ ناول زندگی کے متشددانہ تاثرات کی تخلیقی بازیافت ہے، اس لیے یہ علم کے بجائے انکشاف پر منتج ہے۔ صلاح الدین پرویز نے اپنے اس ناول میں جو ابواب قائم کیے ہیں وہ ان کے خاندان کے بزرگوں کے نام پر ہے جیسے: باب عبدالعزیز، باب عبدالرزاق، باب عبدالجبار، باب عبدالسلام۔ اس ناول میں صلاح الدین پرویز کا آبائی گاؤں سنگھائی پھر سے زندہ ہوگیا ہے۔

صلاح الدین پرویز نے اپنے آباواجداد کے نام جو ابواب قائم کیے ہیں، دراصل یہی چاروں ان کے ناول کے کردار بھی ہیں۔ ان کرداروں کی وضاحت کے لیے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''آئیڈنٹیٹی کارڈ'' کا اسٹرکچر، چار کرداروں پر مشتمل ہے۔ یہ چار کردار (عبدالعزیز، عبدالرزاق، عبدالجبار، عبدالسلام) صرف کردار نہیں ہیں، بلکہ ڈیڑھ ہزار برسوں پر محیط، اسلامی فکر کی اس بنیادی روح کا استعارہ ہیں جس کے باعث، جدید دنیا کو روحانی سرشاری کا وہ پیغام میسر آیا، جس کی تشکیل، پیغمبر اسلام حضور مقبول کی ذات گرامی نے کی تھی۔ یہ چار کردار، جدید بین الاقوامی تہذیب اور تہذیبی انتشار کی تاریخ کو علامتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ نیز ان کا تعلق اس ہند اسلامی تہذیب سے ہے جس کا سلسلہ ساتویں صدی سے شروع ہوا، اور جس کے باعث، برصغیر میں وہ روحانی تحریکیں پروان چڑھیں، جو ہندوستان میں تصوف کے مختلف خانوادوں اور خصوصاً صوفیائے چشت سے منسوب ہیں۔

''آئیڈنٹیٹی کارڈ' حقیقت میں اردو ناول کے اتہاس کا وہ ادھیائے ہے جو اپنی پاکیزگی اور صوفیائے کرام اور بزرگوں کے ملفوظات جیسی صفات کے علاوہ فکشن کے ایک نئے معیار کا ضامن ہے۔'' (آئیڈنٹیٹی کارڈ، ص 11)

صلاح الدین پرویز کا ایک قابل ستائش کارنامہ ادب کے سناٹوں کو چیرتی ہوئی تیسری آواز سہ ماہی 'استعارہ' ہے۔ جس کا پہلا شمارہ جولائی تا ستمبر 2000 میں منظر عام پر آیا۔ رسالے کے اجرا کا منظر قابل دید تھا جس میں ادبی دنیا کی موقر شخصیات موجود تھیں۔ جہاں اس رسالے کو کچھ سینئر اور قابل قدر ادیبوں کی تحریروں کی وجہ سے ایک مستحکم شناخت حاصل ہوئی تو وہیں اس رسالے کی وجہ سے کچھ نئے ادبا و شعرا کو اپنی صلاحیتیں نکھارنے کا سنہرا موقع میسر ہوا اور اپنی تحریروں کو استعارہ کے بہترین صفحات پر دیکھ کر فخر بھی محسوس کیا۔ اس رسالے کے کچھ خاص نمبر جیسے غزل نمبر، تنقید نمبر اور فکشن نمبر بھی شائع ہوئے جن کی بہت تعریف ہوئی۔ یہ ایک ضخیم شمارہ تھا جو 600 سے زائد صفحات پر محیط تھا اور اس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں فکشن کی تقریباً چالیس کتابوں پر تبصرے شامل کیے گئے تھے جن میں بہت سی کتابیں دور دراز علاقے سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کی تھیں جن کا ذکر بھی شاید کہیں ہوتا ہو۔ اس کے علاوہ اس میں مشمولہ تمام افسانوں کے تجزیے بھی پیش کیے گئے تھے۔ رسالے کا آخری شمارہ 23-22 جنوری تا جون 2006 میں منظر عام پر آیا تھا۔ مجلّہ استعارہ کی اشاعت کے ساتھ ساتھ یہیں سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور استعارہ پبلی کیشنز کے زیر اہتمام مختلف موضوعات پر بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں بھی شائع ہوئیں اور ان کتابوں کو ادبی حلقے میں خاطر خواہ پذیرائی بھی ملی۔ زیادہ تر مصنفین اس ادارے سے اپنی کتابیں شائع کروانا چاہتے تھے۔ مذاق مذاق میں ہی اشاعتی میدان کا معتبر ادارہ بن گیا۔ اس پبلی کیشنز سے 50 سے زائد کتابیں شائع ہوئی جن میں کملیشور (کتنے پاکستان)، گلزار (راوی پار)، وریندر پٹواری (اک ادھوری کہانی)، عبدالمنان طرزی (نارنگ زار)، عنبر بہرائچی (سنسکرت بوطیقا)، ڈاکٹر حنیف ترین (ابابیلیں نہیں آئیں)، خلیل مامون (آفاق کی طرف)، ڈاکٹر شیخ عقیل احمد ('مغیث الدین فریدی)، کوثر مظہری (جرأت افکار)، شبنم عشائی (من بانی)، حقانی القاسمی (طواف دشت جنوں)، مشتاق صدف (جذبی شناسی)، احمد صغیر کی (انا کو آنے دو)، شاہد اختر (برف پر ننگے پاؤں)، احمد کفیل (حسن نعیم اور اردو غزل)، خالد بن سہیل (مونولاگ)، اسد ثنائی (شہر جاں کی سرحدیں)، سید منظور احمد (علامہ ابوالسعود اور دیگر مشاہیر)، طاہر فراز (کشکول) وغیرہ۔

صلاح الدین پرویز کے دل میں اپنی مٹی کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور وہ اپنی ہی مٹی سے محبت کرتے ہیں۔ ہندوستان کی سنسکرتی اور تہذیب کو انہوں نے اپنی تخلیق کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ اسی لیے کنہیا لال کندن نے کہا تھا کہ "صلاح الدین پرویز کا دوسرا نام بھارت ہے۔

صلاح الدین پرویز فلم ساز، اسکرپٹ رائٹر اور گیت کار کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ آپ نے تین فلمیں بنائی ہیں جن میں جنبش، یادوں کے موسم اور یادوں کے سفر شامل ہیں۔ آپ کی پہلی فلم 'جنبش' ہے جو 1986 میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں کام کرنے والوں میں کچھ مشہور اور خاص نام ہیں: پدمنی کولھاپوری، شفیع انعامدار، رضا مراد، بھارت بھوشن وغیرہ۔ فلم کی کہانی اور گیت صلاح الدین پرویز نے لکھے تھے۔ اس فلم کے ڈائرکٹر بھی صلاح الدین پرویز تھے۔ باکس آفس پر یہ فلم بہت زیادہ کامیاب نہ ہوسکی۔ آپ کے ڈائریکشن میں بنی دوسری فلم کا نام ہے 'یادوں کے موسم' یہ فلم 1990 میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں جن اداکاروں نے اپنی اداکاری کے عمدہ جوہر دکھائے ان میں کچھ خاص نام بیتا چوہان، کرن کمار، سعید جعفری، سشما سیٹھ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اس فلم کی بھی کہانی اور گیت صلاح الدین پرویز نے ہی لکھے تھے۔ یہ فلم بھی باکس آفس پر کچھ کمال نہ کرسکی البتہ اس کے گانے 'دل میں آج پھر تیری یادوں کا موسم'، 'اک چاند کو ہم بھی دیکھیں گے' اور 'تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں' بہت مشہور ہوئے۔ صلاح الدین پرویز کے ڈائرکشن اور السلام انٹرنیشنل کے بینر تلے بنی آخری فلم کا نام تھا 'محبتوں کا سفر'۔ اس فلم میں امریش پوری، ارونا ایرانی، شانتی پریا، رضا مراد جیسے مشہور اداکاروں نے اداکاری کی تھی۔ مگر یہ فلم کسی بنا پر سنیما ہال میں ریلیز نہ ہوسکی۔

صلاح الدین پرویز کی ادبی خدمات کے پیش نظر اب تک انھیں بہت سارے اعزازات و انعامات بھی مل چکے ہیں۔ ان اعزازات میں ساہتیہ اکادمی کا اعزاز قابل ذکر ہے۔ یہ ایوارڈ انھیں ان کے ناول 'آئیڈنٹیٹی کارڈ' پر 1991 میں دیا گیا تھا۔ اس وقت صلاح الدین پرویز کی عمر ماضی کے ایوارڈ یافتگان کے مقابلے کم تھی، جس کی بنا پر بہت سارے لوگوں نے ایوارڈ کمیٹی پر سوالات بھی قائم کیے تھے کہ ابھی بہت سے سینئر اور بزرگ تخلیق کار موجود ہیں، ان کو نظر انداز کر کے صلاح الدین پرویز کو یہ ایوارڈ کیوں دیا گیا۔ دوسرا اعزاز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کی لائف ممبر شپ تھی، جو انھیں 1983 میں حاصل ہوئی۔ یہ اعزاز بھی صلاح الدین پرویز کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ 2003 میں آپ کو مجلس فروغ ادب دوحہ قطر کی جانب سے ایک بڑا عالمی ایوارڈ 'دوحہ قطر' دیا گیا ہے۔ ان سے پہلے یہ ایوارڈ پاکستان سے انتظار حسین، بانو قدسیہ اور ہندوستان میں قرۃ العین حیدر اور گوپی چند نارنگ جیسی شخصیات کو ملا ہے۔

صلاح الدین پرویز نے کئی ملکوں کا سفر کیا ہے جن میں فرانس، جرمنی، سوئزر لینڈ، لندن، امریکہ اور دیگر یورپی ممالک شامل ہیں۔ ان ملکوں کی سیر و سیاحت نے اُن کی شاعری کو توانائی اور تابنا کی عطا کی ہے۔ ان مشہور ثقافتی، تہذیبی ملکوں کے سیر و سیاحت کے باوجود ان کے دل میں اپنی مٹی کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور وہ اپنی ہی مٹی سے محبت کرتے ہیں۔ ہندوستان کی سنسکرتی اور تہذیب کو انھوں نے اپنی تخلیق کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ اسی لیے کنہیا لال کندن نے کہا تھا کہ ''صلاح الدین پرویز کا دوسرا نام بھارت ہے۔''

■

Mohd Ikram
89/6A, Street No.: 1,
Ghaffar Manzil, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.: 9873818237
Email.: mdikram2011@gmail.com

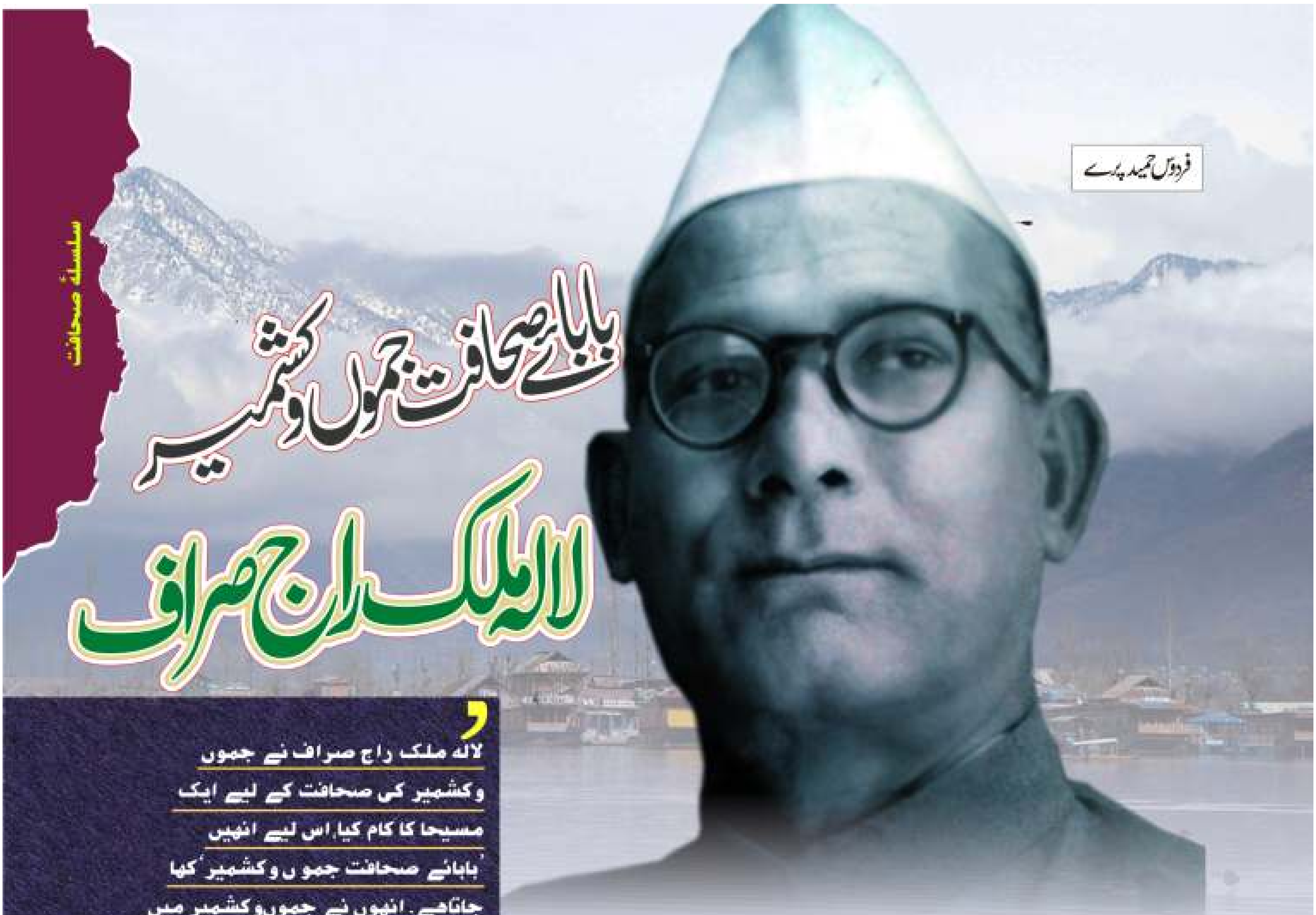

فردوس حمید پرے

بابائے صحافت جموں وکشمیر

لالہ ملک راج صراف

> لالہ ملک راج صراف نے جموں وکشمیر کی صحافت کے لیے ایک مسیحا کا کام کیا، اس لیے انہیں 'بابائے صحافت جمو ں وکشمیر' کہا جاتاہے۔ انہوں نے جموں وکشمیر میں صحافت کی داغ بیل ڈالی اور ایک علمبردار ہونے کا حق ادا کیا۔انہوں نے 1924 میں 'رنبیر' کے نام سے سب سے پہلے اخبار کاآغاز کیا، جس کے لیے انہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑالیکن انہوں نے حوادث زمانہ کا منہ توڑجواب دیا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں جموں وکشمیر بطور شاہی ریاست "Princely State" ڈوگرہ حکومت 1846 تا 1947 کے تحت تھی۔ اس دور میں یہاں صحافت کو کوئی آزادی نہیں تھی، اس وقت کسی اخبار کو منظرِ عام پر لانے کی اجازت کے لیے درخواست دینے کو بھی ریاست کے خلاف ایک بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ جموں وکشمیر بطور شاہی ریاست تین خطوں جموں، کشمیر اور لداخ پر مشتمل ہے۔اس کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ ثقافتی اختلافات کے باوجود اس نے ہمیشہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھا۔ اگرچہ یہاں مختلف نسلوں کے حکمراں آئے اور کشمیر کو طویل عرصے تک محکوم رکھا لیکن یہاں کے تمام خطوں میں عوام الناس نے انسانی اخلاقیات کو مستقل طور پر برقرار رکھا۔ باوجود اس کے مقامی سیاسی حالات کی وجہ سے یہاں ہمیشہ ایک غیر یقینی صورت حال رہی ہے۔ ریاست جموں وکشمیر کے لیے یہ خوش قسمتی کی بات رہی ہے کہ غیر یقینی صورتِ حال میں ایک بہادر اور ذہین شخص کا ظہور ہوا۔ وہ تھے لالہ ملک راج صراف۔ جنھوں نے صحافت کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا۔ انھوں نے اپنی لگن، محنت اور قلم سے ان حالات کا مقابلہ کیا۔ جن حالات سے یہاں کی مظلوم عوام روز بروز دوچار ہورہی تھی۔ لالہ ملک راج صراف (1895 تا 1989) نے جموں وکشمیر کی صحافت کے لیے ایک مسیحا کا کام کیا، اس لیے انھیں 'بابائے صحافت جموں وکشمیر' کہا جاتا ہے۔ انھوں نے جموں وکشمیر میں صحافت کی داغ بیل ڈالی اور ایک علمبردار ہونے کا حق ادا کیا۔ انھوں نے 1924 میں 'رنبیر' کے نام سے سب سے پہلے اخبار کا آغاز کیا، جس کے لیے انھیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے حوادثِ زمانہ کا منہ توڑ جواب دیا۔ لالہ ملک راج صراف کی جرأت مندانہ حق گوئی کے متعلق رامانند ساگر لکھتے ہیں:

''لالہ ملک راج صراف کے قلم کو سچائی بیان کرنے میں نہ ہی لرزہ طاری ہوا اور نہ ہی حق گوئی کی راہ سے انھوں نے انحراف کیا۔''

(لالہ ملک راج صراف (Fifty Years As a journalist) راج محل پبلی کیشن، جموں 1967، ص 222)

صراف اپنے زمانے کی ایک لیجنڈ شخصیت تھے، انھوں نے صحافت کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ وہ انسان دوست، دور اندیش اور ہمدرد صحافی تھے۔ صحافت کے آغاز کے لیے اور ریاست میں پہلا اخبار شائع کرنے کے لیے انھوں نے موجودہ حکومت کے راجہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے پاس دو بار خط بھیجے اور ان سے اجازت طلب کی۔ لیکن ان کی حکومت نے ان کے خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر بھی انھوں نے اپنے ارادے مضبوط رکھے اور حکومت کو تیسری بار خط لکھا اور بالآخر حکومت نے ان کے تیسرے خط کو 1924 میں قبول کر لیا، اور انھیں پہلا اخبار شائع کرنے کی اجازت دی۔

اگر ہم ملک راج صراف کی زندگی کے بارے میں بات کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں کافی اتار چڑھاؤ آئے، لیکن انھوں نے مضبوطی سے ان حالات کا

سامنا کیا اور پختہ عزم کے ساتھ اپنے مقاصد کی طرف بڑھتے رہے۔ وہ اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کیے بغیر اپنے راستے پر گامزن رہے، جس کا نتیجہ آخرکار ان کو مل ہی گیا۔ وہ کشمیر میں مقامی صحافت کا آغاز کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ریاستی حکومت کے مسلسل انکار کے بعد آخرکار ان کے سچے عزائم نے 24 جون 1924 میں صحافت کی تاریخ کو رقم کرتے ہوئے رنگین کر دیا۔ جب ریاستی حکومت نے جموں و کشمیر میں ان کو پہلا آزاد اخبار 'رنبیر' شروع کرنے کی اجازت دی، تو اس اخبار کے ذریعے انھوں نے سماجی کاموں کے لیے لوگوں کے شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت کشمیر کے سیاسی اور تعلیمی حالات بے حد خراب تھے۔ ایسی فضا میں کسی اخبار کی بنیاد رکھنا ان کے لیے ایک چیلنج تھا لیکن ریاست کے امن و امان کے لیے انھوں نے اپنا حوصلہ نہیں کھویا اور اخبار کا سنگ بنیاد رکھ ڈالا۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ صراف ایک عظیم قوم پرست انسان تھے۔

صراف بیسویں صدی کے ایک مشہور صحافی تھے، تعلیم یافتہ خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ 18 اپریل 1894 میں ان کی پیدائش 'سامبا' ضلع جموں میں ہوئی، 1919 میں پنجاب یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے بجائے خود کو آزادی کی جد و جہد میں لگا دیا اور مشہور رہنما لالہ لاجپت رائے کے روزنامہ 'بندے ماترم' کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے شامل ہوئے۔

لالہ ملک راج صراف کی مختصر امتیازی معلومات کی وضاحت سابق پولیس ڈائریکٹر جنرل ایم۔ ایم کھجوریہ کے لکھے ایک مضمون سے ملتی ہے وہ لکھتے ہیں:

''صراف، ان کا قریبی ہمسایہ تھا، جسے عام طور پر 'اخبار والا' کے نام سے جانا جاتا تھا، اور بچے انھیں 'چاچاجی' کہتے تھے۔ وہ ایک نرم مزاج شخص تھے، ہمیشہ مسکراہٹ کے ساتھ سوالوں کا جواب دیتے تھے، ان کی آنکھوں میں ہمیشہ ایک چمک ہوتی تھی، جس سے پیار و محبت جھلکتا نظر آتا تھا، لالہ جی ہمیشہ کھادی (khadi) Clothes کا لباس پہنتے تھے، اس کی عظمت، حسن خوبی، اچھے سلوک اور ایثار و محبت کی وجہ سے بہت سارے لوگ ان سے ملنے کے لیے بے چین و بے قرار رہتے تھے، وہ ایک خاص قسم کے باوقار، فکرمند، انسانیت کا ایک نایاب سرچشمہ تھے۔ 'لالہ جی'' سے ان کی تندرستی کے بارے میں پوچھا کہ اس کا کیا راز ہے؟ وہ اس وقت 85 کے قریب تھے۔ ان کا جواب تھا، مثبت سوچ، لمبی سیر، بہت پانی پینا، اور سب سے بڑھ کر زندگی کا پیغام پھیلانا، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی سوچ کتنی وسیع تھی۔''

(ڈاکٹر کرن سنگھ Yet an other firts in Name of Father of Journalism (Excelsior) جموں، 23 اکتوبر 2017، ص 7)

ملک راج صراف ساٹھ سال سے زیادہ عرصے تک صحافت کی بقا کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ 'آل انڈیا ورکنگ جرنلسٹ فیڈریشن' کے اسٹیٹ یونٹ کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ کئی دہائیوں تک صحافت سے وابستہ رہنے کے بعد وہ ایک کہنہ مشق صحافی بن گئے تھے جن کے دلائل مضبوط ہوتے تھے اور تحریریں جاندار۔

ان کی تعمیری وابستگی اسٹیٹ مین، دی ہندو، ہندوستان ٹائمس، ٹریبون، اور بمبئی کرانیکل جیسے اخبارات کے ساتھ رہی ہے۔ قوم پرست اخبارات کے ساتھ ان کے روابط نے صحافت کے دائرے کو بہت وسیع، نتیجہ خیز اور جامع بنا دیا۔ یہ دلیل اس بات سے مستند ہو سکتی ہے کہ ہیلسنکی (Helsinki)، فن لینڈ (Finland) کے دار الحکومت میں منعقد عالمی صحافتی کانفرنس میں لالہ ملک راج صراف ہندوستانی وفد کے ممبر تھے جو کہ ایک بڑے اعزاز کا مقام تھا۔ خاص کر تاریخ کشمیر صحافت کے لیے ایک بہت بڑی مسرت کی بات تھی۔ کانفرنس کے اختتام کے بعد صراف نے فرانس، سوویت یونین، چین، کوریا، ہانگ کانگ وغیرہ مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ غور طلب ہے کہ اس سفر کے دوران انھوں نے وہاں کے صحافتی میدان کا جائزہ بھی لیا۔

بطور صحافی صراف کا صحافت سے وابستہ ہونا پیشہ یا کاروبار نہیں تھا بلکہ ایک انقلابی مشن اور انسانیت کی فلاح کے لیے ایک جذبہ تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت ساری مشکلات کا سامنا کیا لیکن بڑی جسارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنی اخلاقی ذمے داری کو روشن خیالی کے ساتھ نبھایا۔ اپنے اخبار 'رنبیر' کے ذریعے عام لوگوں کی معاشرتی اور معاشی ضروریات کے مسائل کو پیش کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بدعنوانی کے خاتمے اور دیہاتی لوگوں کے قرضوں کے خاتمے اور جبری مشقت کے خاتمے کی وکالت کی حالانکہ وہ ان سارے حقائق سے آگاہ تھے جو ان مسائل کے ذمے دار تھے۔ لیکن انھوں نے انھی حالات کو اپنے اخبار میں موضوع بحث بنایا جو کہ ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔

لالہ ملک راج صراف کی خودنوشت Fifty years as a Journalist سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جموں و کشمیر میں صحافت کی آزادی کے لیے مسلسل جد و جہد کی۔ انھوں نے نوجوان نسلوں کو مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا کرنے کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے کی ترغیب دی۔ قوم کو اپنا حق پانے کے لیے طویل جد و جہد کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی۔ یہی موضوعات ان کے صحافتی میدان میں زیر بحث رہے ہیں۔ ان کی خودنوشت "Fifty Years As A Journalist" کے گہرے

> ''
>
> بطور صحافی صراف کا صحافت سے وابستہ ہونا پیشہ یا کاروبار نہیں تہا بلکہ ایک انقلابی مشن اور انسانیت کی فلاح کے لیے ایک جذبہ تہا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت ساری مشکلات کا سامنا کیا لیکن بڑی جسارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی اخلاقی ذمے داری کو روشن خیالی کے ساتھ نبھایا۔ اپنے اخبار 'رنبیر' کے ذریعے عام لوگوں کی معاشرتی اور معاشی ضروریات کے مسائل کو پیش کیا۔
>
> ''

مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے ہفتہ وار 'رنبیر' کے ذریعے تاریخ کشمیر کے ایک بہت بڑے حصے کی خدمت کی۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک جموں و کشمیر میں کوئی مقامی اخبار شائع نہیں ہو رہا تھا۔ حکومت صحافتی تنقید سے خوف زدہ تھی۔ تاہم ملک راج صراف نے مہاراجہ پرتاب سنگھ سے ہفتہ وار اخبار ''رنبیر'' شائع کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اس کی اشاعت پہلی بار 24 جون 1924 کو ہوئی ہے۔ ملک راج صراف کو اس شرط پر اخبار 'رنبیر' جاری کرنے کی اجازت ملی تھی کہ اس میں عام طور پر حالت زار کو اجاگر کرنے کے بجائے ڈوگرہ حکمرانوں کی مدح سرائی کی جائے۔ پبلسٹی آفیسر شری ناگر کاتی کے مطابق یہی وجہ تھی کہ ملک راج صراف کو ریاست میں اخبار جاری کرنے کی اجازت مل

گئی۔اس کی اشاعت سے قبل حکام کی طرف سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ریاست کا مستقبل ریاستی صحافت کی ذمے داریوں کو کس طرح نبھا سکتی ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ حکومت کی بادشاہت کے تحت، اس طرح ایک اخبار کو آسانی سے چلانا بہت مشکل کام تھا۔ ملک راج صراف کا ماننا تھا کہ کوئی بھی ملک اپنی عوام میں مکمل اتحاد اور یکجہتی کے بغیر ترقی یافتہ نہیں ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ہر شہری کے حقوق کی پرواہ کیے بغیر چاہے وہ ہندو ہو یا پھر مسلمان، کشمیری یا ڈوگرہ کو یکساں طور پر حکومت کا احترام اور حفاظت کرنی چاہیے۔ یہ واضح ہے کہ اس نے فرقہ واریت، علاحدگی پسندی، علاقائیت یا ذات پات، نسل پرستی کی حمایت نہیں کی تھی۔ ہفتہ وار 'رہبر' کا آغاز خاص طور پر سماجی کاموں کے مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ مندرجہ ذیل امور خاص طور پر اس اخبار کے موضوع رہے ہیں:

1 جبری مشقت (Forced Labour) کے نظام کا خاتمہ ہو جو وحشی دور کی یاد دلاتا تھا۔
2 بدعنوانی کا خاتمہ ہو جو متعدد غریب اور عمدہ خاندانوں کو تباہ کر رہا تھا۔
3 ریاست کے لوگوں بالخصوص پہاڑیوں میں دہشت گردی کے ارتکاب کے خاتمے۔
4 دیہاتی مفروضیت کو ختم کرنا۔
5 لوگوں کی مالی، تجارتی، زرعی اور صنعتی ترقی۔
6 لوگوں کی صحت وفلاح و بہبود کے لیے مناسب اقدامات اٹھائے جائیں۔

اخبار 'رہبر' کی اصل حیثیت، مقاصد اور کارنامے کو دیکھنے کے لیے ہمیں اس میں شائع ہونے والے مضامین کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ اس میں بہت سحر انگیز اور بے تحاشا کہانیاں ومضامین ہوتے تھے۔ نمونے کے طور پر چند مضامین کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ 21 مارچ 1932 کو شائع ہونے والے ہفتہ وار 'رہبر' میں ایک مضمون 'ریاست اور زمیندار حکومت' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مذکورہ مضمون میں مقالہ نگار کی توجہ اس نقطے پر مرکوز تھی کہ برطانوی ہند کے باقی حصوں میں جلد ہی زمیندار حکومت تشکیل دی جائے گی۔ لہٰذا یہاں ریاست جموں و کشمیر کو بھی ایسی حکومت کا ذائقہ لینا چاہیے۔ تاکہ ریاست میں اکثریت رکھنے والے مسلمانوں کے ساتھ سرکاری ملازمت یا کسی بھی دوسرے شعبے میں کام کرنے کے لیے جو ناانصافی کی جارہی ہے، انھیں اس سے نجات مل جائے گی اور اس سلسلے میں انھیں مزید کسی بھی امتیاز کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔اس مضمون میں اس بات پر بھی پوری توجہ مرکوز کی گئی تھی کہ زمیندار حکومت کے سائے میں اکثریت کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کو بھی کسی بھی تکلیف کا مسئلہ نہیں ہوگا۔ایک اور مضمون کے ذریعے اخبار 'رہبر' کی پہچان کی جاسکتی ہے جس میں 'بالغوں کے لیے تعلیم' جیسے عنوان پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔اس موضوع کے سلسلے میں 19 فروری 1940 کو ہفتہ وار 'رہبر' کے ذریعے ایک خاص روشنی پھیل گئی تھی کہ ناخواندگی پر قابو پانے کے لیے ریاستی انتظامیہ نے خواندگی کی شرح کو بڑھانے کے لیے اقدامات اٹھائے ہیں۔ اخبار 'رہبر' نے حکومت کے اس تعمیری اقدام کی تائید کی تھی اور اس معنی خیز کوشش کو حاصل کرنے کے لیے مختلف وسائل اور طریقوں کی فراہمی کی گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اس میدان میں دوسرے ممالک کی برابری کرسکیں۔

اس کے علاوہ انھوں نے جموں وکشمیر انسائیکلوپیڈیا، کشمیر ایئر بک، انسانیت ابھی زندہ ہے: میری پاکستان یاترا اور 'ہنس راج کی سوانح عمری' جیسی متعدد اہم کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر حکومت نے ان کی ناقابل فراموش ادبی خدمات کو سراہا ہے۔ اس لیے 1976 میں ہندوستان کے صدر کے ذریعے ان کو سول ایوارڈ 'پدم شری' سے نوازا گیا تھا۔ حکومتِ ہند کے ساتھ ساتھ سول سوسائٹی ان کے خاندان کے ساتھ آج بھی محبت واحترام سے پیش آتی ہے۔ صراف کی خودنوشت میں انھوں نے صحافت میں اپنے قیمتی تجربات قلم بند کیے ہیں۔ وہ نہ صرف صحافت کے علمبردار تھے، بلکہ ایک ممتاز عوامی آدمی بھی تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے طرزِ عمل کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا۔ ان کی یادیں اتنی خوشگوار ہیں کہ اس سے نہ صرف نوجوان نسل فیض یاب ہوتی رہی ہے بلکہ صحافیوں کو بھی کافی فائدہ پہنچا۔اس کے علاوہ عام لوگ بھی ان کے کارناموں میں دلچسپی لینے لگے ان کی خودنوشت سے متاثر ہوئے جو کہ ریاستِ جموں وکشمیر کی تاریخ کے لیے ایک اہم ادبی خدمت ہے اور یہ کتاب تاریخ کے باشعور طلبا کے لیے بھی معلومات اور حوالے کا ایک قابل قدر وسیلہ قرار پاتی ہے۔اس کتاب کو مکمل کرنے کے لیے ان کو سرکار کی طرف سے کچھ مالی امداد بھی فراہم ہوئی۔ بعدازاں حکومتِ جموں وکشمیر انھیں خصوصی تقریب میں یومِ جمہوریہ 1968 کے موقع پر 3000 ہزار روپے نقد انعام اور Robe of Hunour ایوارڈ سے نوازا گیا۔ دراصل حکومتِ ہند نے بہترین News paper کو ایوارڈ دینے کا عمل شروع کیا تھا۔ ریاست میں صحت مند اور ذمے دار صحافت کی نشوونما کے لیے یہ مشق یہاں متعارف کروائی گئی تھی۔اس کا اصل مقصد یہی تھا کہ اچھی اور ذمے دارانہ رپورٹنگ کرنے والے صحافی سامنے آئیں۔ الغرض یہ بات واضح رہے کہ کشمیر میں بابائے صحافت ایک بہت بڑی مثال اور ریاستِ جموں وکشمیر میں موجودہ صحافیوں کے لیے صحافت کے میدان میں وہ ایک رول ماڈل ہے۔

اخبار 'رہبر' کی اصل حیثیت' مقاصد اور کارنامے کو دیکھنے کے لیے ہمیں اس میں شائع ہونے والے مضامین کا تجزیہ کرنا ہوگا- اس میں بہت سحر انگیز اور بے تحاشا کہانیاں ومضامین ہوتے تھے- نمونے کے طور پر چند مضامین کی مثالیں ملاحظہ ہوں- 21مارچ 1932 کو شائع ہونے والے ہفتہ وار 'رہبر' میں ایک مضمون 'ریاست اور زمیندار حکومت' کے عنوان سے شائع ہوا تھا- مذکورہ مضمون میں مقالہ نگار کی توجہ اس نقطے پر مرکوز تھی کہ برطانوی ہند کے باقی حصوں میں جلد ہی زمیندار حکومت تشکیل دی جائے گی-

دیگر ماخذات

1 روزنامہ 'رہبر' 1932 جموں
2 لالہ ملک راج صراف 'انسانیت ابھی زندہ ہے۔ میری پاکستان یاترا'، ڈیجیٹل پبلی کیشنز، جموں، 2004۔
3 فائل 1966-67 'محکمہ اطلاعات ونشریات'، جموں وکشمیر اسٹیٹ آرکائیوز، سرینگر
4 خالد بشیر احمد (Kashmir Exposing the myth behind the Narrative) سیج پبلی کیشنز نئی دلی 2017
5 پروفیسر شہاب عنایت ملک 'مضامین شہاب' میزان پبلشرز سرینگر 2010
6 کشمیر میں میڈیا، چیلنجز اور مستقبل، ماس کیمونیکیشن پروفیشنز گلڈ پرتاب پارک 2005
7 صوفی محی الدین 'جموں کشمیر میں اردو صحافت' گلشن بکس سرینگر 2013

■

Dr. Firdous Hameed Parey
Faculty Member MANUU
Lucknow Campus
Lucknow - 226020 (UP)
Mob.: 7889850435

موپاساں اور منٹو میں موضوعاتی یکسانیت

محمد ریحان

ہنری رینے البیر گائے دا موپاساں 5 اگست 1850 میں پیدا ہوا اور 6 جولائی 1893 یعنی بیالیس سال کی عمر میں اس نے فرانس کی راجدھانی پیرس میں وفات پائی۔ سعادت حسن منٹو نے 11 مئی 1912 میں اپنی آنکھیں کھولیں اور 18 جنوری 1955 کو پاکستان میں بیالیس سال کی عمر میں اس دار فانی کو الوداع کہا۔ اس طرح ایک انیسویں صدی میں پیدا ہو کر انیسویں صدی میں ہی انتقال کر گیا اور ایک بیسویں صدی میں پیدا ہو کر بیسویں صدی میں ابدی زندگی کی طرف کوچ کر گیا۔ چونکہ موپاساں اور منٹو نے الگ الگ ملک، تہذیب اور صدی میں سانسیں لیں اس لیے یہاں ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اگر دو فنکاروں کی تہذیب، زبان اور زمانہ الگ ہو تو پھر ان دونوں میں مماثلت اور یکسانیت کی بنیاد کہاں اور کیسے تلاش کی جائے؟ جب ہم دو لوگوں کے درمیان یکسانیت کی بات کرتے ہیں تو اس طرح کے سوالوں کا ذہن میں آنا لازمی ہے۔

موپاساں اور منٹو کے درمیان ایک بڑی یکسانیت ہے کہ دونوں کی عمر نے ان کے ساتھ وفا نہیں کی۔ دونوں محض بیالیس سال ہی زندہ رہ سکے۔ لیکن اسی کم مدت میں دونوں نے اپنے اپنے ادب کو لازوال کہانیوں سے مالا مال کر دیا۔ فرانسیسی ادب کے فکشن کا تصور موپاساں کے بغیر ادھورا ہے اور اردو ادب کا فکشن منٹو کے ذکر کے بنا نا مکمل ہے۔ ایک دوسرا اتفاق بھی اپنے آپ میں حیرت انگیز ہے کہ موپاساں اور منٹو دونوں نے دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں اپنے احساسات و تجربات کی ترجمانی کے لیے افسانے کی صنف کو زیادہ اہمیت دی۔ موپاساں نے تقریباً تین سو افسانے لکھے اور منٹو نے کم و بیش دو سو پچاس افسانے تخلیق کیے۔ موپاساں کو فرانسیسی ادب کا سب سے بڑا حقیقت پسند افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے اور منٹو کو اردو ادب کا سب سے بڑا حقیقت پسند افسانہ نگار مانا جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دونوں کی حقیقت نگاری کچھ اس نوعیت کی رہی کہ دونوں پر فحش نگاری کے الزامات لگے۔

موپاساں اور منٹو کے درمیان کی حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے یکسانیت اس بات کا جواز پیدا کرتی ہے کہ ان فنکاروں کے فن پر اس پہلو سے تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ ایک فکشن نگار دراصل ہمارے سماج اور معاشرے کا حساس نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی توضیح و تشریح اپنے افسانے میں پیش کرتا ہے۔ حقیقت پسند تخلیق کار زندگی کی ان حقیقتوں کو پیش کرتا ہے جن کے بارے میں عام طور پر گفتگو نہیں کی جاتی ہے۔ موپاساں اور منٹو اس لیے حقیقت پسند فکشن نگار تسلیم کیے جاتے ہیں کہ انھوں نے زندگی کی حقیقتوں اور معاشرے کی سچائیوں کو زیادہ جرات مندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ موپاساں کی کہانیوں کا مطالعہ گہرائی کے ساتھ کریں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ زندگی کی سچائیوں کو کتنے صاف لفظوں میں پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے سماج کی تلخ حقیقتوں کو ابہام و تمثیل کے حریری پردے میں مستور کر کے پیش نہیں کرتا۔ حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے اس کی کہانی 'Idyll' بے نظیر ہے۔ کیونکہ جتنی حقیقت پسندی کا مظاہرہ اس میں کیا گیا ہے اس کی مثال شاید ہی کہیں اور ملے۔

اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک ٹرین جینیوا سے مارسلی (Marseille) کی طرف روانہ ہے۔ اس کے آخری ڈبے میں ایک جوان اور بھرپور عورت سفر کر رہی ہے۔ اس کی سامنے والی سیٹ پر ایک نوجوان مگر دبلا پتلا شخص بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے سے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ وہ دھوپ میں بہت دیر کام کر کے آیا ہے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد دونوں میں رسمی گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔ عورت یہ انکشاف کرتی ہے کہ وہ اپنے تین بچوں کو گھر پر چھوڑ کر مری ٹولے نوکری جوائن کرنے جا رہی ہے۔ کچھ دیر بعد دونوں کی آنکھ لگ جاتی ہے لیکن جب دوبارہ آنکھ کھلتی ہے تو عورت ایک دم سے بے چین ہو جاتی ہے۔ اس کی بے قراری اس کے چہرے پر صاف طور نمایاں ہے۔ وہ بے چین کیوں ہے اس کا نقشہ موپاساں نے ایسے کھینچا ہے:

''وہ عورت ابھی بھی مشکل سے سانس لے پا رہی تھی۔

اس کے رخسار بھرے بھرے اور کچھ گیلے لگ رہے تھے۔ وہ بہت تھکے لہجے میں بولی۔ 'میں نے کل سے اپنی چھوٹی بچی کو دودھ نہیں پلایا ہے اس لیے مجھے چکر آ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔

اگر کسی عورت کی چھاتی میں دودھ بھرا ہو جیسا کہ مجھ میں ہے تب اسے دن میں کم از کم تین بار دودھ پلانا ضروری ہو جاتا ہے نہیں تو اسے بہت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے سینے پر وزنی پتھر رکھ دیا گیا ہو۔''

جب عورت کی بے چینی سامنے بیٹھے ہوئے شخص

سے دیکھی نہیں جاتی تو وہ ہچکچاتے ہوئے کہتا ہے:

''میڈم شاید میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔''

اور جب وہ شخص اس کی مدد کر چکا ہوتا ہے تو وہ عورت اطمنان محسوس کرتے ہوئے نہایت ہی احساس مندانہ لہجے میں کہتی ہے:

''آپ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی ہے۔ میں آپ کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔''

اس پر نوجوان شخص جواب دیتا ہے:

''وہ تو مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کیونکہ گزشتہ دو دنوں سے میرے پیٹ میں ایک دانہ نہیں گیا۔''

یہ کہانی نہ صرف حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے بلکہ اس سے موپاساں کی بہت سی خوبیاں سامنے آتی ہیں۔ موپاساں چاہتا تو اسی جگہ کہانی ختم کر سکتا تھا جہاں پر عورت شکریہ ادا کرتی ہے لیکن ایسا کرنے سے موپاساں کی انفرادیت قائم نہیں ہو پاتی۔افسانے میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ دراصل آخری دو سطور میں آنے والی بات کے تاثر کو قاری کے ذہن میں دیر تک قائم رکھنے کے لیے ہے۔موپاساں اپنی کہانی کی آخری سطور میں اتنی حیرت انگیزی پیدا کر دیتا ہے کہ قاری چونک جاتا ہے۔ ایک عورت کے ذریعے ٹرین میں ایک مرد کو اپنا دودھ پلانے کا عمل کر یہہ ہے۔ سماج کتنا ہی غیر مہذب ہو اس عمل کو ناپسند کرے گا لیکن تھوڑا توقف کر کے اس عمل کے پیچھے کی حقیقت کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں کہ ایک انسان پچھلے دو دنوں سے بھوکا ہے اور روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس عورت کو اس بات کا احساس ہے یا نہیں یہ پورے طور پر واضح نہیں ہوتا تاہم اس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس سے قاری کو یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ شخص بھوک و پیاس کی شدت سے ادھ مرا ہو گیا ہے۔اس لیے جب وہ شخص اس کی مدد کرنے کی اجازت مانگتا ہے تو یہ بھی اعتراض نہیں کرتی ہے۔بظاہر ایسا لگ رہا ہے کہ عورت غیر اخلاقی عمل کا مظاہرہ کر رہی ہے لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

موپاساں کے اس افسانے کو پڑھتے ہوئے منٹو کے افسانہ موذیل کی یاد آتی ہے۔ حالانکہ دونوں کہانی کا پلاٹ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے۔ موذیل کا پلاٹ فساد کے پس منظر میں تیار کیا گیا ہے۔ جب کہ Idyll کا پلاٹ ایک بے روزگار اور بھوکے شخص کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔لیکن حقیقت پسندی اور مدد کے جذبے کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو دونوں میں یکسانیت موجود ہے۔موذیل افسانے میں موذیل کرپال کور کو بچانے کے لیے جو کچھ کرتی ہے وہ Idyll کے نسوانی کردار سے بہت قریب ہے۔ کرپال کور کا گھر مسلمانوں کے مرکز میں واقع ہے۔ وہاں فساد بھڑک اٹھا ہے۔ کرپال کا عاشق ترلوچن پریشان ہے کہ وہ کس طرح اس کی مدد کرے۔ موذیل جو کبھی ترلوچن کی محبوبہ ہوا کرتی تھی وہ کرپال کو بچانے کی جو حکمت عملی تیار کرتی ہے وہ اس مناسبت سے بہت حقیقی ہوتا ہے۔ وہ دنگائیوں کی توجہ بھٹکانے کی غرض سے خود نیم برہنہ ہو کر کمرے سے نکلتی ہے اور اپنے پیچھے ترلوچن کو آنے کا مشورہ دیتی ہے۔ بھاگتے ہوئے موذیل گر پڑتی ہے۔ اس کا ننگا جسم فرش پر پھیل جاتا ہے۔ فسادی اسے دیکھنے میں محو ہو جاتے ہیں اور طے شدہ پلان کے مطابق کرپال کور کمرے سے نکل کر محفوظ جگہ پر چلی جاتی ہے۔جس طرح Idyll کی عورت ایک بے روزگار اور بھوکے شخص کی مدد دودھ پلا کر کرتی ہے اسی طرح موذیل بھی ایک بے بس لڑکی کی مدد اپنے جسم کو برہنہ کر کے کرتی ہے۔

موپاساں اور منٹو دونوں نے اپنے اپنے افسانوں میں سماج کے اس طبقے کو زیادہ جگہ دی ہے جس کی طرف نام نہاد طبقہ اشرافیہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہماری حقیقی زندگی میں کئی ایسے کردار ہیں جو مجبور اور لاچار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے احساسات کسی سے ساجھا نہیں کر سکتے۔ ایسا ہی ایک کردار طوائف کا ہے۔طوائف دنیا کی سب سے لاچار مخلوق اس لیے ہے کہ اس کی طرف وہ شخص بھی حقارت سے دیکھتا ہے جو رات کی تاریکی میں اس کے کوٹھے پر پہنچ جاتا ہے۔ آپ ذرا تصور کریں کہ کیا گزرتی ہوگی اس عورت پر کہ جس کے جسم کے ساتھ رات ڈھلتے ہی لوگ کھیلتے ہیں اور دن کی روشنی میں اس کی طرف دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ یہ المیہ کوئی معمولی المیہ نہیں ہے۔جس کے ساتھ یہ المیہ پیش آ رہا ہے اگر اس کے درد کو سمجھنا ہے یا اس کے احساسات سے واقف ہونا ہے تو آپ موپاساں اور منٹو کی کہانیاں ضرور پڑھیں۔ یہ دونوں طوائف کے احساسات و جذبات کی ترجمانی حقیقت پسندانہ طریقے سے کرتے ہیں۔ موپاساں یا منٹو جب آپ کو طوائف سے روبرو کراتے ہیں تو وہ آپ سے یہ نہیں کہتے کہ آپ اس سے محبت کریں یا یہ نہیں کہتے کہ آپ ان کے پیشے کو صحیح قرار دیں۔ وہ بس اتنا مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ اس کے احساسات کو سمجھنے کی انسانی کوشش کریں۔طوائف کا ذکر کرتے ہوئے دونوں یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ جو مہذب معاشرہ ہے اس میں رہنے والا انسان واحد ایسا رہائشی ہے جو چہرے کے اندر بھی ایک چہرہ رکھتا ہے اور اس کے باہر بھی۔طوائف کے ضمن میں

> موپاساں اور منٹو اس لیے حقیقت پسند فکشن نگار تسلیم کیے جاتے ہیں کہ انہوں نے زندگی کی حقیقتوں اور معاشرے کی سچائیوں کو زیادہ جرات مندی کے ساتھ بیان کیا ہے-موپاساں کی کہانیوں کا مطالعہ گہرائی کے ساتھ کریں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ زندگی کی سچائیوں کو کتنے صاف لفظوں میں پیش کرتا ہے-وہ ہمارے سماج کی تلخ حقیقتوں کو ابہام و تمثیل کے حریری پردے میں مستور کر کے پیش نہیں کرتا-حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے اس کی کہانی 'Idyll' بے نظیر ہے-کیونکہ جتنی حقیقت پسندی کا مظاہرہ اس میں کیا گیا ہے اس کی مثال شاید ہی کہیں اور ملے-

موپاساں کا افسانہ Boul de Suif بہت اہم ہے۔ بول داسوف کا اصل نام الیزابیتھ ہے۔ یہ ایک مشہور طوائف ہے۔روین پر پروشیا کا قبضہ ہو گیا ہے اس لیے کچھ لوگ روین سے Havre کی طرف ایک گاڑی میں سوار ہو کر جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ اس میں اتفاق سے الیزابیتھ بھی ہوتی ہے۔ یہ گاڑی کچھ دور جاتی ہے لیکن پروشیا کی فوج اس کو روک لیتی ہے۔ دو دنوں تک یہ لوگ فوج کے قبضے میں رہتے ہیں۔ ایک دن الیزابیتھ اپنے ساتھیوں سے کہتی ہے کہ ہم لوگوں کو اس وقت تک بندی بنا کر رکھا جائے گا جب تک وہ فوج کے ساتھ رات نہ گزار لے۔الیزابیتھ افسر کے ساتھ رات گزارنے سے انکار کر دیتی ہے لیکن اس کے ملک کے ساتھی آزادی حاصل کرنے کی غرض سے الیزابیتھ کو افسروں کے ساتھ رات گزارنے کے لیے طرح طرح سے راضی کرنے لگتے ہیں۔ اس کے اپنے ملک کے ساتھی اس کے رات گزارنے کے عمل کو ملک کی عزت کے لیے عین اخلاقی اور منطقی بتاتے ہیں۔ جب الیزابیتھ رات گزار کر دوسری صبح اپنے ساتھیوں کے ساتھ Havre کی طرف روانہ ہوتی ہے تو ان میں سے کوئی بھی شخص اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا جو اس کی اس قربانی کو عین اخلاقی بتا رہے تھے۔ وہ کس نفسیاتی کیفیت میں ہیں اس تعلق سے کوئی بھی اس سے ہمدردی کے دو بول نہیں بولتا۔الیزابیتھ اپنے ہی ملک کے

لوگوں کے اس رویے سے دل شکستہ ہو جاتی ہے اور رونے لگتی ہے۔ رونے کی آواز سن کر ایک عورت اپنے شوہر سے یہ شرم ناک جملہ کہتی ہے "یہ شرم کی وجہ سے رو رہی ہے۔" سب اپنی اپنی آزادی کی خوشی میں مگن نغمہ سن رہے ہیں اور الیزا بیتھ کی کیفیت کیا ہے اس کو موپاساں کے الفاظ میں:

''اور بول داسوف روتی رہی، نغموں کے درمیانی وقفے میں کبھی کبھی اس کی سسکیاں جن کو وہ روک نہیں پا رہی تھی اندھیرے میں دور تک پھیل جاتیں۔''

بول داسوف کی حالت اور کیفیت کو دیکھتے ہوئے منٹو کے ہتک کی سوگندھی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ سوگندھی بھی ایک طوائف ہے۔ وہ اپنے دلال رام لال کے کہنے پر بن سنور کر سیٹھ کے پاس جاتی ہے جو کوٹھے کے نیچے اس کا منتظر ہے۔ سوگندھی کے بارے میں رام لال سیٹھ سے کہتا ہے:

''بڑی اچھی چھوکری ہے، تھوڑے ہی دن ہوئے اسے دھندا شروع کیے''

اب آگے کا منظر منٹو کی زبانی دیکھیں:

''ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے ''اونہہ'' نکلا پھر ایک دم سے موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار یہ جا وہ جا...''

سیٹھ کے اس رویے کو سوگندھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ رام لال بول پڑا۔

''پسند نہیں کیا تجھے۔ اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی برباد گئے۔''

اس کے بعد سوگندھی اپنے کمرے میں جاتی ہے اور خارش زدہ کتے کے ساتھ سو جاتی ہے۔ آپ Boul de suif کے ساتھیوں کا رویہ دیکھیں اور ساتھ میں اس جملہ کو یاد کریں کہ ''شرم کی وجہ سے رو رہی ہے'' پھر سیٹھ کے ''اونہہ'' اور رام لال کے جملے کو سامنے رکھیں، ان میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ دونوں جملوں میں ایک کردار کے تئیں حقارت کا پہلو پوشیدہ ہے۔ Boul de suif اور سوگندھی دونوں ایک ہی طرح کے احساس سے دوچار ہوتی ہے۔ ایک کو اس کے ساتھی حقارت سے دیکھتے ہیں اور گفتگو کرنے میں ذلت و عار محسوس کرتے ہیں۔ دوسری طرف سوگندھی ہے جس کے وجود کو صرف ایک لفظ 'اونہہ' کے ذریعے جھٹلا دیا جاتا ہے۔ رام لال جس کی روٹی روزی سوگندھی اور اس جیسی دوسری طوائف کی مرہون منت ہے وہ بھی ''دو گھنٹے مفت میں برباد گئے'' کہہ کر اس کے زخم پر نمک چھڑک دیتا ہے۔ دراصل بول داسوف اور سوگندھی ایک ہی تجربے سے گزرتی ہیں۔ دونوں کی ذہنی کیفیت میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

یہاں میں ایک چیز اور واضح کرتا چلوں کہ موپاساں اور منٹو نے اپنے اپنے افسانوں کے بین السطور میں نام نہاد انسانیت پر جتنی تیخ چوٹ کی ہے اس کی مثال بے نظیر ہے۔ بول داسوف ایک طوائف ہے۔ افسر کے ساتھ ایک رات گزار لینے سے اس کی ذات پر کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ساتھیوں کے رویے پر اس قدر حیران ہے کہ وہ زار و قطار رونے لگتی ہے۔ اس کا رونا صرف اس کے ساتھیوں پر رونا نہیں ہے بلکہ وہ اس پورے سماج پر آنسو بہا رہی ہے جو اس کے ساتھیوں کی طرح دوہرا رویہ رکھتے ہیں۔ موپاساں نے ایک طوائف کے ذریعے نام نہاد مہذب انسان کے دہرے رویے پر آنسو بہا کر اس مہذب انسان کے وجود کو ایک طوائف کے پیشے سے زیادہ رزیل بنا دیا ہے۔ اسی طرح ہتک کی سوگندھی جب ایک خارش زدہ کتے کے ساتھ سوتی ہے تو دراصل وہ ایسا کر کے اس پورے معاشرے کو ایک خارش زدہ کتے سے زیادہ مکروہ اور گھٹیا ثابت کرنا چاہتی ہے جس کی بنیاد منافقت پر ہے۔ یہاں موپاساں اور منٹو کی منشا دراصل ایک ہی ہے اور وہ ہے نام نہاد مہذب معاشرے پر چبھنے والا گہرا طنز۔ اس طرح دیکھا جائے تو دونوں کہانیوں کی مختلف دھارائیں بہتی ہوئی ایک ہی مقام پر پہنچ جاتی ہیں۔

موپاساں اور منٹو میں جو یکسانیت ہے اس کے بارے میں ہمارے بزرگوں نے ایک غلط فہمی یہ عام کر دی کہ منٹو دراصل موپاساں سے بہت متاثر تھے۔ شروع شروع میں انھوں نے فرانسیسی کہانیوں کے ترجمے کیے۔ ہمایوں کا فرانسیسی نمبر جو ستمبر 1935 میں شائع ہوا، اس کو منٹو نے ہی مرتب کیا تھا۔ اس لیے منٹو پر اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ یہ بات سچ ہے کہ منٹو کے ادبی کیریئر کا آغاز ترجمہ نگاری سے ہوا۔ ترجمہ کرتے ہوئے ظاہر ہے بہت سے افسانے اس کی نظر سے گزرے ہوں گے۔ اس لیے ممکن ہے وہ بعض کہانیوں سے متاثر بھی ہوا ہو لیکن کسی سے متاثر ہو کر کوئی لازوال افسانے نہیں لکھ سکتا۔ منٹو کے حوالے سے یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اس نے موپاساں سے جو چیزیں مستعار لی ہیں ان میں تکنیک اور حقیقت پسندی اہم ہیں لیکن صرف اسی پر موقوف نہیں موپاساں اور منٹو میں کہانی، پلاٹ، کردار اور بعض دفعہ موضوع میں بھی بہت تک یکسانیت نظر آتی ہے۔ اس کی اصل وجہ کیا ہے اس کے بارے میں شاید نہیں لکھا گیا۔ بات یہ ہے کہ سماج چاہے وہ فرانس کا ہو یا ہندوستان کا اس میں رہنے والے انسان ہی ہوتے ہیں۔ انسان کسی بھی کلچر کا پروردہ ہو، دکھ اور تکلیف میں اس کی کیفیت ایک سی ہوتی ہے۔ موپاساں اور منٹو نے اپنے اپنے سماج کے اس انسان کا مطالعہ کیا ہے جو ہماری بے توجہی، نفرت اور حقارت کا برسوں سے شکار تھے۔ موپاساں اور منٹو نے سماج کے ستائے ہوئے لوگوں کے دلوں میں جھانک کر اس کے داخلی کرب اور دکھوں کا پتہ لگایا۔ عجیب اتفاق ہے کہ موپاساں نے جب لکھنا شروع کیا تو پروشیا اور فرانس کی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ جنگ کی تباہی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دوسرے مسائل جیسے ہجرت اور اس کے کرب کو موپاساں نے موضوع بنایا۔ ادھر منٹو نے جب لکھنے کا آغاز کیا تو ملک کی آزادی کی جنگ اور پھر تقسیم ملک کے وقت رونما ہونے والے فسادات نے منٹو کو تقریباً وہی سب موضوعات دیے جو موپاساں کو ملے۔ اس لیے میرا یہ ماننا ہے کہ موپاساں اور منٹو میں یکسانیت کی اصل وجہ دونوں جگہوں کے ایک سے حالات کا ہونا ہے۔

■

موپاساں نے ایک طوائف کے ذریعے نام نہاد مہذب انسان کے دہرے رویے پر آنسو بہا کر اس مہذب انسان کے وجود کو ایک طوائف کے پیشے سے زیادہ رزیل بنا دیا ہے۔ اسی طرح ہتک کی سوگندھی جب ایک خارش زدہ کتے کے ساتھ سوتی ہے تو دراصل وہ ایسا کر کے اس پورے معاشرے کو ایک خارش زدہ کتے سے زیادہ مکروہ اور گھٹیا ثابت کرنا چاہتی ہے جس کی بنیاد منافقت پر ہے۔ یہاں موپاساں اور منٹو کی منشا دراصل ایک ہی ہے اور وہ ہے نام نہاد مہذب معاشرے پر چبھنے والا گہرا طنز۔ اس طرح دیکھا جائے تو دونوں کہانیوں کی مختلف دھارائیں بہتی ہوئی ایک ہی مقام پر پہنچ جاتی ہیں۔

Md. Raihan
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.: 7366083119

خورشید الاسلام کی فکشن تنقید

شاہنواز حیدر شمسی

(امراؤ جان ادا کے حوالے سے)

خورشید الاسلام بیسویں صدی کے اہم ناقد ہیں۔ یہ دور اس اعتبار سے بھی اردو تنقید کے لیے عہد زریں کہے جانے کے لائق ہے کہ اس دور کو کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، احتشام حسین اور محمد حسن عسکری جیسے ناقدین میسر آئے اور ابتدا میں ہی حالی و شبلی کے بعد اردو تنقید کی ایک مستحکم روایت قائم ہوگئی جسے خورشید الاسلام نے بھی مضبوطی عطا کی۔

خورشید الاسلام اردو ادب میں اپنے منفرد اسلوب کی بنا پر معروف ہیں۔ وہ بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں۔ انھوں نے شاعری سے اپنی تخلیقی ہنر مندی کا آغاز کیا بعد میں تنقید کی جانب پیش قدمی کی اور خصوصی توجہ کی بنا پر تنقید ان کی شناخت کا اولین وسیلہ بن گئی۔ خورشید الاسلام کے تخلیقی مزاج نے نثری تحریروں کو بھی متاثر کیا، لہٰذا ان کی تنقید اردو ادب میں تخلیقی تنقید کا معیار قائم کرتی ہے۔ انشاپردازانہ نثر اور تخلیقی جلوہ افروزی کے باعث مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالودود اور اعجاز حسین جیسے ممتاز ادیب ان کے گرویدہ تھے اور انھیں محمد حسین آزاد، نیاز فتح پوری و عبدالرحمٰن بجنوری کی صف میں جگہ دی جانے لگی۔

ناول اور غزل تنقید میں خورشید الاسلام کا خاص میدان ہے۔ انھوں نے ناول میں مرزا ہادی رسوا اور غزل میں غالب کو اپنی تنقید کا مرکز بنایا۔ ان دونوں موضوع پر ان کی الگ الگ کتابیں ہیں۔ رسوا کے تین ناولوں کو انھوں نے اپنی تنقیدی کسوٹی کا موضوع بنایا۔ یہ ناول امراؤ جان ادا، ذات شریف اور شریف زادہ ہیں۔ یہاں امراؤ جان کے تجزیے پر توجہ مرکوز ہے۔

خورشید الاسلام نے معروف زمانہ ناول 'امراؤ جان ادا' کو خصوصی طور پر اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ اس پر خاطر خواہ، دلچسپ اور بامعنی گفتگو کی۔ انھوں نے موضوع، کردار، مکالمہ، اسلوب، کہانی اور ماحول و مناظر کی روشنی میں اس ناول کا تجزیہ کیا۔ اس ناول کو تنقیدی نقطۂ نظر یا تجزیاتی عمل سے گزارنے کے پس پردہ خورشید الاسلام کا اصل مقصد موضوع کی بازیافت ہے، جسے عموماً ایک طوائف کی کہانی بتا کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی اور اس باعث یہ ناول بے توجہی کا شکار بھی ہوا۔ بقول خورشید الاسلام:

''ہماری زبان میں ایک ناول ایسا بھی ہے جسے خاصے کی چیز سمجھا جاتا ہے لیکن جس کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اسے محض ایک طوائف کی دلچسپ کہانی سمجھ کر پڑھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے بنیادی اور قابل قدر پہلو نظر سے اوجھل ہوگئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ 'امراؤ جان' ناول میں ایک اہم کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہی اس ناول کا موضوع بھی ہو۔ ناول کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ قطعاً ضروری ہے کہ پہلے اس کے موضوع کو دریافت کیا جائے۔'' (مرزا رسوا کی ناولیں، خورشید الاسلام، ص 49)

اس تعلق سے ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''اس مسئلے پر اس قدر تفصیل کی ضرورت نہ ہوتی اگر بعض ناقدوں نے اس ناول کو امراؤ جان کی کہانی سے تعبیر کیا ہوتا۔ مثال کے طور پر علی عباس حسینی نے اپنی کتاب ناول کی تنقید و تاریخ میں سمجھتے ہیں کہ یہ ایک رنڈی کی کہانی اسی کی زبانی ہے۔'' (ایضاً ص 56)

نیز یہ کہ:

''موضوع سے واقفیت حاصل کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم فن کے مطالبوں کو پا گئے ہیں اور ان کی کسوٹی پر تفصیل، تصادم اور ترجمانی کو پرکھ سکتے ہیں۔'' (ایضاً ص 49)

ان تینوں اقتباسات کے پیش نظر خورشید الاسلام کا ناولوں کے حوالے سے تجزیاتی عمل کا مزاج و معیار سامنے آتا ہے اور یہ کہ موصوف اس معاملے میں موضوع کی دریافت اور اس کے متعلقات کی شناخت کو اولین درجہ عطا کرتے ہیں۔ اس کے بعد دیگر اجزائے ترکیبی کو قابل توجہ سمجھتے ہیں۔ 90 صفحات پر مشتمل امراؤ جان ادا کے اس تجزیے میں خورشید الاسلام نے بیش تر اوقات یا اوراق موضوع پر مکالمے میں صرف کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تجزیاتی طریقۂ کار کے درمیان بعض دفعہ موضوع ان

کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ متن کی گہرائیوں میں خاک چھانتے رہتے ہیں۔ یہاں اس تجزیہ و تنقید کے پس پشت دو نکتوں کی نشاندہی ملتی ہے۔ اول ناول پر بے تو جہی کی فضا کو کمزور کرنا اور دوم یہ کہ اس کے زوال کے فنی رموز کا اندازہ لگانا۔

خورشید الاسلام 'امراؤ جان ادا' کو محض ایک طوائف کی کہانی کے بطور دیکھنے کے مخالف ہیں۔ جیسا کہ عمومی طور پر اردو ناقدین نے کیا اور یہ اس ناول کے تعلق سے مشہور بھی ہوا۔ اس شہرت نے 'امراؤ جان ادا' کو محدود کر دیا۔ خورشید الاسلام نے اس ناول کو ایک تہذیب کے زوال کے طور پر پیش کیا۔ انھوں نے امراؤ جان ادا کو اس ناول کا مرکزی کردار قرار دیا۔ خورشید الاسلام کے نظریے نے امراؤ جان ادا کو ایک منفرد زاویے سے شہرت بخشی۔ انھوں نے فکری و فنی نقطۂ نظر سے اس کی انفرادیت کا بھی احساس دلایا پھر ناول امراؤ جان ادا پر سنجیدگی کی ایک فضا قائم ہو گئی۔

ناول 'امراؤ جان ادا' کو محدود کیے جانے پر معترض خورشید الاسلام رقم طراز ہیں:

''یہ کہنا غلط نہیں کہ طوائفوں کی زندگی اس ناول کا موضوع نہیں ہے۔'' (ایضاً ص56)

خورشید الاسلام 'امراؤ جان ادا' پر مباحثے میں اس ناول کے موضوع و کردار کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ماحول سازی و منظر کشی، کہانی پن، پلاٹ، اسلوب اور مکالمے کو اخیر میں اس کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ ناول لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کی نقش و نگارش ہے۔ لکھنؤ کے اس زوال پذیر معاشرے کے پس منظر میں طوائفوں کی اندرون بیرون خانہ زندگی، نوابوں، ڈاکوؤں، لکھنوی شہر کے میلے، فیض آباد کے حجرے، غدر 1857 کے بعد کا ہندوستان اور اس کی تباہ کاریاں یہ پورا منظر ناول 'امراؤ جان ادا' میں یکجا ہو گئے ہیں۔

غدر 1857 اور آزادیِ ہند کے درمیان کی تاریخ ہندوستانی معاشرت اور تہذیب و ثقافت کے نشیب و فراز اور کشمکش و انہدام کی تاریخ ہے۔ اس عہد میں ملک کے بہت سارے تاریخی، روایتی اور تہذیبی رویے رو بہ زوال ہوئے۔ لکھنؤ کا تہذیب و تمدن اسی وسیع تناظر کا حصہ ہے۔ ایک روشن تہذیب اور یادگار تاریخ کی روایت ہے۔ لکھنوی تہذیب کی زندہ جاوید روایت کو تاریخ اور زبان و ادب میں مختلف طریقے سے پیش کیا گیا ہے، بلکہ اردو ادب میں شعری و نثری اصناف میں اس کا ایک سرمایہ ہے۔ ناول کی دنیا میں فسانۂ عجائب، فسانۂ آزاد اور آگ کا دریا اس کی مثال ہے۔ اس زمرے میں امراؤ جان ادا اس اعتبار سے شہرۂ آفاق ولافانی ہے کہ اس ناول میں فکر و فلسفے کی ممتاز شخصیت مرزا ہادی رسوا نے اپنی ہمہ جہتی، علمی بصیرت اور ہنر مندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ انھوں نے لکھنوی تہذیب کو طوائفوں کی ایک زندہ روایت کے ساتھ پیش کر کے اپنی فن کاری کا جلوہ بکھیرا ہے۔ موضوع کا عمدہ انتخاب اور اس کا خوبصورت فکری و فنی برتاؤ اس ناول کا امتیاز ہے۔ موضوع، کردار، اسلوب، مکالمہ اور منظر نگاری کے تاریخی و تہذیبی سیاق و سباق اس ناول کے مثالی اجزا ہیں۔ خورشید الاسلام ناول امراؤ جان ادا کے خالق مرزا ہادی رسوا کے تبحر علمی اور فکری ریاضت کے قائل ہیں۔ ان کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''ہر اچھے ناول نگار کی طرح رسوا (اپنی آستین میں روشنی کا ایک سیلاب رکھتے ہیں۔) مگر وہ اسے بہت سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ہر شخص کی قدر اور ہر شے کی قیمت جانتے ہیں اور ان کے نمود پر محض اتنا وقت اور اتنی شعاعیں صرف کرتے ہیں جو ان کے مقصد کے لیے ضروری ہیں۔

وہ جزئیات پر بہت کم روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے انتخاب میں بڑے اختصار سے کام لیتے ہیں۔ عام طور پر وہ اشیا کی تفصیل اس وقت پیش کرتے ہیں جب انھیں کردار یا زمانے کی داخلی زندگی کے ایسے گوشوں کو بے نقاب کرنا ہوتا ہے جنھیں کامیابی کے ساتھ اور سہولت سے دوسری صورت میں سامنے لانا ممکن یا مناسب نہ ہو۔''

(ایضاً ص 73-72)

اب اس فکر کی تعبیر خورشید الاسلام کے زاویۂ نظر کے زیر اثر دیکھتے ہیں۔ خورشید الاسلام اس ناول کے موضوع پر اپنا تاثر کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''آخر اس ناول کا موضوع کیا ہے؟ امراؤ جان۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ممکن ہے اس کا موضوع طوائفوں کی زندگی ہو۔'' (ایضاً ص56)

موضوع کی بازیافت خورشید الاسلام کی تنقید کا مقصد ہے جو فن پارے کی بازیافت کے تناظر میں آتا ہے جسے انھوں نے اپنا تنقیدی موقف بتایا ہے اور اس کا اطلاق 'امراؤ جان ادا' پر کیا ہے۔ اس ضمن میں درج بالا مختلف اقتباس ان کے اختلافی، اتفاقی اور انحرافی رویے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے موضوع کی بازیافت کی فنی باریکیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ خورشید الاسلام نے امراؤ جان کو ناول کے موضوع سے خارج کرتے ہوئے اسے ناول کا مرکزی کردار تصور کیا ہے۔ اس کے بعد طوائف کی زندگی کو بھی موضوع سے درکنار کیا ہے اور کلی طور پر شہر لکھنؤ کی تہذیب کو علامتی زوال کے طور پر ناول کا موضوع قرار دیا ہے۔ اس کا جواز فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امراؤ جان کا نفس اس کا حال ہے جو گھائل ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ جس میں سرشاریاں بھی ہیں اور نہیں بھی ہیں۔ جس میں جیت بھی ہوتی ہے اور ہار بھی ہوتی ہے۔ جس میں عمل کا میدان بہت وسیع ہے مگر سانس میں گناہ کا احساس ہوتا ہے۔ اس تپائن یا تصادم میں امراؤ اپنے نفس کی بھینٹ چڑھ جانے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ اس کے گلے پر چھری رکھ دی جاتی ہے اور وہ اس کی گرمی سے پگھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ کیفیت وقتی ہے۔ عارضی ہے۔ اس میں قلب ماہیت کی قوت نہیں۔ امراؤ جان کی زندگی پھر ایک نرم سیر دریا کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔ اس میں نہ کوئی انقلاب آتا ہے نہ اسے کوئی نئی منزل دکھائی دیتی ہے۔ نہ وہ اپنے سے فرار کرتی ہے، نہ اس کے دماغ کا آہن پگھل کر آئینہ بنتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ

> ہماری زبان میں ایک ناول ایسا بھی ہے جسے خاصے کی چیز سمجھا جاتا ہے لیکن جس کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اسے محض ایک طوائف کی دلچسپ کہانی سمجھ کر پڑھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے بنیادی اور قابل قدر پہلو نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ 'امراؤ جان' ناول میں ایک اہم کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہی اس ناول کا موضوع بھی ہو۔ ناول کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ قطعاً ضروری ہے کہ پہلے اس کے موضوع کو دریافت کیا جائے۔

یہ واقعہ نہ کسی راز کا انکشاف کرتا ہے نہ ان واقعات کو ان حدوں تک پہنچاتا ہے جہاں وہ خود بخود حل ہوتے ہوئے نظر آئیں۔ نہ وہ کہانی میں یا امراؤ جان ادا کی زندگی میں کوئی زبردست یا معمولی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ نہ اس کے بعد کہانی ختم ہو جاتی ہے نہ اس کا ختم ہونا یا ختم کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ واقعہ کہانی کا یا امراؤ جان ادا کی زندگی کا نقطۂ عروج ہوتا تو یہ کہانی امراؤ جان کی کہانی ہوتی اور اگر یہ امراؤ جان کی محدود واقعاتی زندگی کا نقطۂ عروج ہوتا تو اس کی زندگی کچھ اور ہو جاتی۔''

(ایضاً ص 55-56)

طوائف کو اس ناول کے موضوع سے خارج کرتے ہوئے خورشید الاسلام اس کی وجہ بتاتے ہیں:

''بیش تر کردار ایک وسیلہ ہیں جن کی مدد سے ہم چند طبقوں کو دیکھتے ہیں، مگر ان طبقوں کی زندگی تو در کنار ان کے کرداروں کی زندگی بھی طوائف پر موقوف نہیں اور بڑی حد تک ان کی معاون ہے۔ ان میں سے ہر ایک طوائف کی کہانی چند جملوں میں سنائی جا سکتی ہے اور یہ کہانی دوسری طوائف کی کہانی سے بالکل آزاد ہوگی۔ ان سب کی مجموعی داستان بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ سب طوائفیں تھیں۔ ناول نگار کی تمام صلاحیتیں بھی ان کی مصوری پر صرف نہیں ہوئیں اور ناول کا سارا مواد بھی ان کی نواؤں اور فضاؤں میں حل نہیں ہوتا۔ میلے، مشاعرے اور مجرے ہم یقیناً ایک طوائف کی آنکھ سے دیکھتے ہیں لیکن یہ آنکھ ہمیں دور تک لے جاتی ہے۔ ان جلسوں میں ہم منچلے عاشق اور پیشہ ور عیاش ہی نہیں ان کے علاوہ کچھ اور بھی دکھائی دیتا ہے اور اس کی تہہ میں کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جس سے مختلف آوازوں میں زیر و بم اور مختلف اجزا میں معنوی ربط و تسلسل اور آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ طوائف کی زندگی اس ناول کا موضوع نہیں ہے۔ اب ہم منطقی نتیجے پر پہنچ گئے ہیں لیکن آپ کی اجازت سے خلط مبحث ہی کی خاطر کسی میں ایک اور گریز کرنا چاہتا ہوں۔ کہیں اس ناول کا موضوع یہ تو نہیں کہ چند آدمی اپنی زندگی کس طرح بسر کرتے ہیں۔'' (ایضاً ص 61)

خورشید الاسلام نے غیر امتیازی رویے، استحکام و ثابت قدمی کی کمی، غیر متحرک، تغیر و تبدل سے خالی، انقلابی و احتجاجی جذبات کے برخلاف اور غیر نتیجہ خیزی کے باعث امراؤ جان ادا کو موضوعی کردار سے خارج کیا ہے۔ امراؤ جان کا کردار کہانی پر مرکزیت کے ساتھ اثر انداز نہیں ہے۔ اس میں فعالیت و زندہ روی کی کیفیت کمزور ہے۔ نہ کہانی میں اس کردار نے کشمکش پیدا کی اور نہ کہانی اس کے ارد گرد گردش کرتی ہے کہ اسے کہانی کی موضوعیت حاصل ہو جائے۔ ہاں اس کی صورت مرکزی کردار کی ضرور ہے۔ نقطۂ عروج کے لوازمات کی خامی نے بھی اسے کہانی کی مرکزیت سے قاصر رکھا ہے۔

خورشید الاسلام نے طوائف کو موضوع سے بعید بتاتے ہوئے اسے ایک طبقاتی زندگی کو موثر اور متحرک بنانے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ امراؤ جان میں طوائفوں کی زندگی کو وہ معاون اور غیر مستحکم کردار تصور کرتے ہیں۔

خورشید الاسلام نے غیر امتیازی رویے، استحکام و ثابت قدمی کی کمی، غیر متحرک، تغیر و تبدل سے خالی، انقلابی و احتجاجی جذبات کے برخلاف اور غیر نتیجہ خیزی کے باعث امراؤ جان ادا کو موضوعی کردار سے خارج کیا ہے۔ امراؤ جان کا کردار کہانی پر مرکزیت کے ساتھ اثر انداز نہیں ہے۔ اس میں فعالیت و زندہ روی کی کیفیت کمزور ہے۔ نہ کہانی میں اس کردار نے کشمکش پیدا کی اور نہ کہانی اس کے ارد گرد گردش کرتی ہے کہ اسے کہانی کی موضوعیت حاصل ہو جائے۔ ہاں اس کی صورت مرکزی کردار کی ضرور ہے۔ نقطۂ عروج کے لوازمات کی خامی نے بھی اسے کہانی کی مرکزیت سے قاصر رکھا ہے۔

انھوں نے اس کردار کی مرکزی حیثیت کو کمزور بتاتے ہوئے اس کے لیے کہانی کے تخلیق کار کو مورد الزام ٹھہرایا ہے اور مصوری کی خامی اور عدم پیوستگی کو کہانی اور مصنف کا عیب بتایا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے مزید ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ خورشید الاسلام فرماتے ہیں:

''رجب کی نوچندی اور درگاہ کی زیارت غرض یہ نواب، مولوی، ڈاکو اور کٹنیاں، مختار اور بیگمیں، مشاعرے اور میلیں، مکھیاں بھنکتے ہوئے۔ گھر اور مرغیوں سے آباد تکیے، دوکانیں، سرائے اور محلات، شاعر اور ان کے شاگرد، فقیر فقرا اور ضعیف الاعتقادی کے کرشمے یہ سب چند طوائفوں کی سیرت بنانے اور بگاڑنے، ابھارنے اور مٹانے کے لیے وجود میں نہیں آئے۔ ان کا اپنا مقصد، اپنا مصرف اور اپنی میزان ہے۔ انھیں ہم طوائفوں کی قدر و قیمت کے پیمانے سے نہیں جانچتے۔ وہ خود اپنی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ امراؤ جان ادا یا کوئی اور طوائف ان کرداروں اور ان نظاروں پر غالب نہیں آتی۔ البتہ ان سب کو ہم ایک تجربہ کار طوائف کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور کبھی کبھی خود وہ طوائف پس منظر میں غائب ہو جاتی ہے اور ہمارے سامنے ایک ڈرامائی ٹکڑا آتا ہے جہاں کسی کردار کا ذہن بے نقاب ہوتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ ذہن متصادم ہوتے ہیں یا پلاٹ میں کسی غیر متوقع واقعہ سے سنسنی پیدا کی جاتی ہے۔ ناول ایک بار پڑھنے کے بعد ہمیں خورشید، بسم اللہ جان، خانم اور بوا حسینی یاد رہتی ہیں۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ رسوا نے ان خاکوں میں زندگی کا رنگ بھر دیا ہے۔ ان کا دائرۂ عمل بہت محدود ہے۔ یہ ایک حد تک اپنے لیے مگر بڑی حد تک دوسروں کے لیے زندہ ہیں۔ ان کی افادیت اور زندگی اس پر موقوف ہے کہ یہ ایک وسیع منظر کا تعارف ہیں اور اسے ہمارے سامنے لا کر یا اس کے نقش و نگار دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک وقت پر اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے مگر ان کے شعور کی لہریں سعی و عمل میں اپنا بھرپور اظہار نہیں کرتیں۔''

(ایضاً ص 58-59)

یہاں خورشید الاسلام نے خورشید، بسم اللہ جان، خانم اور بوا حسینی کو ایک زندہ کردار کے طور پر تسلیم کیا ہے مگر کہانی کے ایک وسیع پس منظر کا تعارف بتا کر اس کی حیثیت کو محدود بھی کیا ہے۔ ''یہ ایک حد تک اپنے لیے مگر بڑی حد تک دوسروں کے لیے زندہ ہیں۔'' اس جملے سے کہانی میں ان کرداروں یا طوائفوں کی مرکزی حیثیت کے بجائے ذیلی حیثیت کا احساس ہوتا ہے۔ مشاعرے، مجرے، درگاہ، نواب، مولوی، کٹنیاں، مختار، بیگمیں، دوکانیں، سرائے اور محلات وغیرہ یہ سب اس کہانی کے اصل ہیں۔ ان سب کا اپنا وجود ہے۔ یہ پُر معیار اور با مقصد ہیں۔ خورشید الاسلام اپنے مضمون میں متعدد مرتبہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ طبقے ہی اس کہانی کی بنیاد یا مرکز ہیں یا انھیں متفرقات سے ناول امراؤ جان ادا کے پلاٹ کی تشکیل ہوتی ہے اور ایک وسیع پس منظر کے ساتھ یہ طوائف کی زندگی یا اعمال پر غالب آ جاتے ہیں۔ انھوں نے اس ضمن میں طوائفوں کی مختلف خامیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کیا۔ بالخصوص ذہنی کشمکش و جذباتی ہیجان کی کمی، موثر و متحرک کردار و کیفیت کا فقدان اور منظم و مربوط

طریقۂ کار کا عدم اطلاق اس کے اہم وجوہات ہیں۔

خورشید الاسلام موضوع پر نتیجہ خیزی کے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''امراؤ جان ادا کا موضوع زوال ہے۔ یہ زوال ایک خاص معاشرت کا ہے جو اودھ کے چند شہروں میں محدود تھی۔ رسوا اس معاشرت کی تصویر دکھانا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن میں اس کا ایک تصور بھی تھا۔ ان کے چاروں طرف اس کا مواد بکھرا ہوا تھا اور یہ مواد آسانی سے گرفت میں لانا محال تھا۔ ان میں اتنی قوت بھی نہ تھی کہ اسے براہ راست استعمال کرسکیں اور جہاں سے چاہیں بنتے چلے جائیں۔ منزل تک پہنچنے میں کئی دشواریاں تھیں۔ تصویر مختصر پلاس بنائی جائے ادھوری نہ ہو۔ فن کار کی شخصیت نظروں سے اوجھل رہے۔ ہر پہلو اپنی قدرو قیمت کے اعتبار سے جگہ پائے کوئی ایسا منظر ہو جہاں سے زندگی کا ہر گوشہ نظر آئے اور اس منظر کی بدولت ان سب کا مفہوم واضح ہوجائے۔ ان شرائط کے ساتھ زوال پذیر معاشرت کا مطالعہ کرنے کے لیے خانم کے نگار خانے سے بہتر کوئی منظر نہ تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔'' (ایضاً،ص 62-63)

اودھ کی زوال پذیر معاشرت کو خورشید الاسلام نے اس ناول کا موضوع قرار دیا ہے۔ 'طوائف' اور 'امراؤ جان ادا' کو موضوع کے درجے سے خارج کرنے اور اس کی اس انتہا کی جمالیات سے انکار و انحراف کس حد تک درست ہے یہ تو اردو کے ناقدین فیصلہ کریں گے۔ مگر خورشید الاسلام کے اس موضوع پر انحراف کے رویے اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ بہرحال انھوں نے لکھنوی تہذیب و معاشرت کے زوال کا جو موضوع منتخب کیا ہے اسی باعث مختلف طبقوں کو اہمیت دی اور طوائف کو جزوی کردار کے بطور دیکھا۔ نہایت غور وفکر اور گہری بصیرت کے بعد ناول امراؤ جان ادا کے تعلق سے انھوں نے ایک منفرد نقطۂ نظر پیش کیا۔ ایک مختلف زاویے سے اس ناول کی تجدید و بازیافت کی۔ 90 صفحات پر مشتمل اس بسیط مضمون میں خورشید الاسلام نے بنیادی طور پر موضوع سے بحث و تمحیص کی۔ سامنے کے موضوع کو بے دخل کیا۔ زوال آمادہ معاشرے کے تناظرات تلاشے۔ اس کے جواز پیش کیے۔ اس ضمن میں مرزا ہادی رسوا کی فکری وفنی ہنرمندی وان کے محاسن کی نشاندہی کی اور ان کی چند خامیوں کا بھی برملا اظہار کیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے کردار نگاری، اسلوب، مکالمہ اور منظرکشی کے حوالے سے اس ناول کا معقول جائزہ پیش کیا۔

خورشید الاسلام کی فکشن تنقید یا نثری تحریروں کے تعلق سے عموماً یہ رائے قائم کی گئی یا دنیائے ادب میں یہ تصور دیا گیا کہ وہ ایک تاثراتی، جمالیاتی اور تخلیقی ناقد ہیں۔ یہ ایک سنجیدہ پہلو ہے۔ تاثراتی تنقید کا مطلب متن پر تاثر کا اکہرا نظریہ محض خوبصورت اور تحسین آفریں کلمات کی یکجائیت ہے یعنی دلیل وتوازن، جواز، مقصدیت اور معقولیت سے خالی تحریر ہے مگر خورشید الاسلام کی تحریر ان خوبیوں سے متصف ہے۔ ان کی تنقید سنجیدگی کا مطالبہ کرتی ہے۔ غور وفکر کا مظاہرہ کرتی ہے۔ نتیجہ لیے ہوئے ہے۔ اس میں کچھ جذباتی پن، بے جا اور سرسری باتیں بعض دفعہ ضرور گھر کر جاتی ہیں مگر ان کی تحریر کا غالب رجحان قطعی ایسا نہیں ہے۔ ان کے یہاں توازن وتناسب کی فضا قائم رہتی ہے۔ بے جا طوالت کے باوجود بے مقصدیت نہیں ہے۔ ان کی تنقید متن سیاق ہے جس میں سائنٹفک تنقید کا احساس بھی ملتا ہے اور تاثراتی تنقید کے نقوش بھی۔ قدیم فکر کے مطابق تخلیق کے لیے تنقید وتحقیق کو معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے روکھے پن اور سپاٹ رویے کی بھی لعن طعن ہوتی رہی ہے۔ تنقید میں تخلیقی ہم آہنگی کی افادیت پر راشد انور راشد خورشید الاسلام کی تنقیدی روش کے متعلق رقم طراز ہیں:

خورشید الاسلام کا سب سے معرکۃ الارا مضمون امراؤ جان ادا کے تجزیے پر مشتمل ہے جو کتاب کے ایک سو پندرہ صفحات کو محیط ہے۔ اس مقالے میں اردو کے نظر انداز کیے ہوئے کلاسیکی ناول امراؤ جان ادا کا جو بے مثل علمی تجزیہ اور محاکمہ سامنے آتا ہے وہ مارکسی تنقید کے اعلیٰ کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔ ناقد نے اردو کی تہذیب اور نوابی دور کے زوال کے پورے تناظر میں اس ناول کے موضوع، فنی ساخت اور لازوال کرداروں کی تفہیم و تعبیر کا حق ادا کیا ہے۔

''اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ تنقید کی خشک، کھردری اور بے رس زبان ادب کے سنجیدہ قارئین کی بھی توجہ پوری طرح مبذول کرنے میں کامیاب نہیں ہوپاتی۔ تنقیدی مضامین کی سنجیدہ قرأت کے بجائے وہ مطالعے کے نام پر بے دلی کے ساتھ سرسری ورق گردانی کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ خورشید الاسلام بھی ایک بالغ نظر فن کار اور ادب کے سنجیدہ قاری ہونے کی بنا پر ابتدا میں ہی اس راز سے اچھی طرح واقف ہوگئے تھے کہ تنقید کے نام پر زبان کی خشکی روا رکھی جائے تو اچھی خاصی کام کی باتیں بھی بے اثر ثابت ہوں گی۔ لہٰذا اس بات کی انھوں نے شعوری کوشش کی کہ ادبی محاسبے کے حوالے سے تنقید اور تخلیق کی جداگانہ سرحدوں کی تفریق مٹ جائے اور ایسی تحریر سامنے آئے جو قارئین کی زبان کو انوکھی لذت سے آشنا کرا سکے۔'' (آثار لفظ، راشد انور راشد،ص 39)

خورشید الاسلام اپنے اسلوب نگارش، تنقیدی بصیرت، تخلیقی جلوہ آمیزی اور گہرے تجزیاتی و معنویاتی رویے کے باعث اردو ادب میں ایک سنجیدہ فن کار کے طور پر اپنا اعتبار رکھتے ہیں۔ قدیم و جدید نقادوں وادیبوں نے ان کی تنقیدی دانشوری کا اعتراف کیا ہے اور اس میدان میں ان کی انفرادیت کے قائل ہیں۔ ممتاز ترقی پسند ناقد قمر رئیس بھی خورشید الاسلام سے متاثر ہیں اور ان کی گہری بصیرت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''خورشید الاسلام کا سب سے معرکۃ الارا مضمون امراؤ جان ادا کے تجزیے پر مشتمل ہے جو کتاب کے ایک سو پندرہ صفحات کو محیط ہے۔ اس مقالے میں اردو کے نظر انداز کیے ہوئے کلاسیکی ناول امراؤ جان ادا کا جو بے مثل علمی تجزیہ اور محاکمہ سامنے آتا ہے وہ مارکسی تنقید کے اعلیٰ کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔ ناقد نے اردو کے تہذیب اور نوابی دور کے زوال کے پورے تناظر میں اس ناول کے موضوع، فنی ساخت اور لازوال کرداروں کی تفہیم وتعبیر کا حق ادا کیا ہے۔

(ترقی پسند ادب کے معمار، ترتیب ومقدمہ: پروفیسر قمر رئیس،ص 225)

مجموعی طور پر خورشید الاسلام کی فکشن تنقید متن کو بنیاد بناتی ہے۔ متن کے جامع تناظرات اور ان کے متعلقات کو حدود میں لاتی ہے۔ غور وفکر کا تقاضا کرتی ہے۔ فن پارے کے تعین قدر اور معیار شناسی کے لیے فن کار اور اس کے عہد سے سروکار رکھتی ہے۔ خورشید الاسلام کا فن جذباتیت سے سنجیدہ روی کا سفر ہے۔ قدامت میں جدت پسندی کا عمل ہے۔ وہ دو مرزائیوں مرزا ہادی رسوا اور مرزا غالب سے زیادہ متاثر ہیں اور کلاسیکی ادب سے مخصوص انسیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان کے اثرات قبول کیے ہیں اور اسی طرز کو اختیار کیا ہے اور نئے ابعاد میں ان کے فکر وعمل کی مداخلت کو تسلیم کیا ہے۔ خورشید الاسلام کے افکار ونظریات اور ان کے مشاہدات کو 'امراؤ جان ادا' کے تجزیے میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ نظریاتی اور اطلاقی دونوں سطح پر ان کی تنقید ایک مثال قائم کرتی ہے۔

■

Shahnawaz Haider
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.:8800905056

اردو شاعری میں تلمیحات کا لفظی اور معنوی آہنگ

محمد عارف

شاعری، مرصع سازی، لفظوں کی متناسب ہم آہنگی، محسنات لفظیہ ومعنویہ یعنی صنائع وبدائع کا صحیح ودرست اور بروقت استعمال ہے۔ شاعری جذباتی کیفیات کی عکاس اور اظہار خیال کا وسیع میدان ہے۔ شاعری میں چند الفاظ یا اشاروں کا استعمال ہوتا ہے جو کسی پس منظر کی شرح کرتے ہیں۔ انھیں الفاظ کو تلمیحات کہا جاتا ہے۔ یہ تلمیحات چند حرفوں یا لفظوں کا مجموعہ ہیں جو کلام میں لفظ ومعنی کا ایک آہنگ پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ سے کلام میں غنائیت اور موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان تلمیحات میں ہر دور کے نقوش پیوست ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہر دور میں تلمیحات کو خاصی اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ کسی بھی شاعری میں جس طرح الفاظ کا باہم متناسب ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اس میں پیش کیے گئے قصے یا مضمون کا باہم مناسب ہونا بھی لازمی ہے۔ تاکہ کلام کی ترسیل بلیغ انداز سے ہو سکے۔ نظم ہو یا نثر دونوں کا آلۂ کار لفظ ہی ہوتا ہے لیکن یہی لفظ جب شاعری میں استعمال ہوتا ہے تو اس کی اہمیت اور تاثیر بہت بڑھ جاتی ہے۔ کلام میں بلاغت، شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔ کیوں کہ جو کلام مقتضائے حال کے مطابق ہوتا ہے وہی کلام فصاحت و بلاغت کی معراج ہوتا ہے اور اردو شاعری میں تلمیح کا وجود بھی ایک ایسے ہی عنصر کی طرح ہے۔ تلمیح کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی۔ کیوں کہ ہر عہد میں لوگوں کا لمبے لمبے قصے سننے اور سنانے میں تضییع اوقات ہوتا تھا۔ اس سے چھٹکارہ پانے کے لیے چند الفاظ یا اشاروں کا مجموعہ وجود میں آیا تاکہ لوگ ان اشارات سے مکمل بات سمجھ سکیں اور اس طرح ان اشارات کو تلمیح کا نام دے دیا گیا۔ یہ مختلف مختصر اشارات ہیں جو اپنے اندر قومی، تہذیبی اور تمدنی بازگشت لیے ہوئے ہیں۔ تلمیح نثری قصوں میں بھی ہوتی ہے مگر ان تلمیحات کا اثر شاعری میں جس قدر معانی و مفاہیم پیدا کرتا ہے۔ نثر میں اس کے مقابلے بہت کم ہے۔ کیوں کہ یہ تلمیحی الفاظ ایک ہی شعر میں مختلف حیثیتوں سے لفظی، معنوی اور صوتی آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ تلمیحات کی بنیاد ان چیزوں پر ہوتی ہے جو پہلے سے مشہور ہوں۔ کیونکہ یہ خود ساختہ نہیں ہوتیں بلکہ یہ مشہور و معروف واقعات، قصوں اور کہانیوں پر مبنی ہوتی ہیں اور شاعر بس ان سے استفادہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''افادات سلیم'' میں وحیدالدین سلیم نے تلمیح کے بارے میں آسبورن کی یہ بات نقل کی ہے:

''تلمیحات کیا ہیں؟ ہماری قوم کے قدموں کے نشانات ہیں جن پر پیچھے ہٹ کر ہم اپنے باپ دادا کے خیالات، مزعومات، اوہام رسم ورواج اور واقعات و حالات کے سراغ لگا سکتے ہیں۔''

(وحیدالدین سلیم، افادات سلیم، سید اشرف حیدرآبادی، ص 115)

شمس قیس رازی نے اپنی کتاب 'المعجم فی معائیر اشعار العجم' کے چھٹے باب 'در محاسن شعر وطرفی از صناعات مستحسن کی در نظم ونثر بہ کار دارند' میں تلمیح کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ تلمیح یہ ہے کہ چند الفاظ بہت سارے معانی پر دلالت کریں جس کے ایک نظر میں کچھ معنی نظر آئیں اور دوسری نظر میں کچھ اور جب شاعر تھوڑے الفاظ جو بہت سے معانی و مفاہیم بیان کرتے ہوں ان کا استعمال کرے، تو اس کو تلمیح کہتے ہیں اور یہ صنعت بلغا کے نزدیک اطناب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ قیس رازی کے اس خلاصے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ تلمیح بلاغت کا اعلیٰ درجہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی کلام میں بلاغت تین قسم کی چیزوں سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ 'ایجاز'، 'مسوات' اور 'بسط'۔ جب کلام کے تھوڑے الفاظ بہت سے معانی پر دلالت کریں، تو اس وقت کلام میں ایجاز ہوگا۔ جب کلام کے لفظ ومعنی میں ایک تناسب اور برابری ہو تو اس وقت کلام میں مسوات ہوگی اور جب کلام میں کسی معنی کی بہت سے الفاظ کے ذریعے وضاحت کی جائے، تو کلام میں 'بسط' ہوگا۔ یہ بلاغت کی قسمیں ہیں اور صنائع معنوی میں تلمیح ان سب کا نچوڑ ہے۔

تلمیحات کا غائر مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ان تلمیحات کی اپنی ایک نوعیت ہوتی ہے۔ جیسے نشاطیہ، حزنیہ، قنوطیہ اور جنونیہ وغیرہ جو شاعر اور اس کے کلام کی نفسیاتی کیفیت کی غمازی کرتی ہیں۔ شاعر ہر طرح کی تلمیحات سے شعر میں ایک لطف یا دکھ درد والی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ جیسے لیلیٰ ومجنوں کی کہانی سے شاعر اپنے دکھ کا بیان کرتا ہے۔ میر کا یہ شعر دیکھیں جس میں اس نے لیلیٰ اور مجنوں کی تلمیحات سے کس طرح اپنے غم کا اظہار کیا ہے۔

عاشق ومعشوق یاں آخر فسانے ہو گئے
جائے گریہ ہے جہاں، لیلیٰ کہاں، مجنوں کہاں

علم بدیع کی صنائع معنویہ کی ساری صنعتوں میں تلمیح وہ صنعت ہے جو سب سے زیادہ فصیح اور بلیغ ہے۔ اس لیے اگر غزل میں تلمیح برتی جائے تو یہ غزل، فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ محمود نیازی لکھتے ہیں:

''تلمیحی الفاظ کے رواج سے ادیب اور شعراء کو آسانیاں فراہم ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے خیالات وافکار سے مناسب سانچوں میں ڈھالنے پر قادر ہو جاتے ہیں اور کم وقت میں زیادہ کام کر سکتے ہیں۔''

(محمود نیازی، دیباچہ، تلمیحات غالب، غالب اکیڈمی، نظام الدین، نئی دہلی، 1972، ص 9)

کہا جاتا ہے کہ جس زبان میں تلمیحات کم ہیں یا بالکل ہی نہیں ہیں تو اس زبان کی اُن زبانوں کے بالمقابل وہ معنویت نہیں رہ جاتی کہ جن زبانوں میں تلمیحی الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے لیکن اردو شاعری میں تلمیحی الفاظ کی بہت کمی پائی جاتی ہے۔ لے دے کر چند تلمیحاتی الفاظ ملتے ہیں جن میں کثیر تعداد میں الفاظ غیر ملکی زبانوں کے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس خطے میں جتنے واقعات اور قصص و کہانیاں ملتی ہیں ان کے حساب سے ان کو ادا کرنے کے لیے مختصر اشارات بھی نہیں ملتے جب کہ دوسری زبانوں میں ان کی کثرت پائی جاتی ہے۔ محمود نیازی نے اپنی کتاب 'تلمیحات غالب' میں لکھا ہے:

''ادبی حیثیت سے ان زبانوں کو مالدار سمجھا جاتا ہے جن میں تلمیحات کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کی مثال موجود ہے۔ اس میں ہر قوم، ہر مذہب اور ہر لٹریچر کی تلمیحات شامل ہیں اور ان میں برابر

اضافہ ہو رہا ہے۔ شاہنامہ فردوسی، گلستاں و بوستاں، الف لیلہ و لیلہ، لیلیٰ مجنوں، شیریں و فرہاد اور اسی قسم کی سیکڑوں مشرقی علوم کی کتابوں سے تلمیحات اخذ کر کے ادبیات یورپ میں داخل کی جا چکی ہیں۔ برخلاف اس کے ہماری ہندوستانی زبانیں اور خصوصاً اردو کا دامن تلمیحات سے خالی ہے۔ اس کی بظاہر وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وقت کی بہتات اور مشاغل کی کمی سے ہم لوگ تفصیلی گفتگو کے عادی ہو چکے ہیں۔" (ایضاً،ص9)

اردو شاعری میں بہت سی تلمیحات عربی سے اور بہت سی ایران سے اور کچھ خالص ہندوستانی تلمیحات اردو زبان و ادب میں شامل ہوئی ہیں۔ اردو شاعری میں عربی تلمیحات کی بھرمار نظر آتی ہے اس لیے کہ اردو زبان و ادب پر عربی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور عربی الفاظ کا چلن بھی اردو زبان میں زور و شور سے ہونے لگا تھا اسی وجہ سے اردو شاعری میں تلمیحات کے بیشتر الفاظ عربی زبان سے مستعار ہیں۔ عربی زبان میں انبیا کی تلمیحات بہ کثرت پائی جاتی ہیں جن کو اسلامی تلمیحات بھی کہا جاتا ہے اور پھر انھیں تلمیحات کو اردو شعرا نے اپنے کلام کا حصہ بنایا۔ کچھ اسلامی یا قرآنی تلمیحی الفاظ ملاحظہ ہوں:

آدم، یعقوب، یونس، سلیمان، بلقیس، یوسف، ابراہیم، اسماعیل، [illegible] و مریم، لیلیٰ و مجنوں اور قرآن کی آیات و الفاظ وغیرہ جو کسی واقعے کو بیان کرتے ہیں۔ 'آدم' کی تلمیح سے جنت کے لوازمات اور انسان کی پیدائش وغیرہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ 'یعقوب' کی تلمیح سے کلام میں گریہ وزاری اور آہ و بکا کی کیفیت پیش کی جاتی ہے اور 'یوسف' سے کمال حسن کی عکاسی اور پیرہن یوسفی میں شفایابی سے تسلی بھی دی جاتی ہے۔ 'یونس' کی تلمیح سے دوسروں کے حق میں جلد بازی سے فیصلہ نہ لینے کی تلقین اور 'ابراہیم و اسماعیل' کی تلمیح سے صبر و عشق کے باہمی اختلاط سے عقل کی بے چارگی کو پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ 'سلیمان' کی تلمیح سے ایک لامحدود اور لازوال طاقت و قوت کی طرف اشارہ کرنا شاعر کا مقصد ہوتا ہے۔ وہیں 'بلقیس' سے عجز کا پیغام دیا جاتا ہے۔ 'نوح' کی تلمیح سے لوگوں کو بدی و بدکاری کے کاموں سے روکنے اور کسی چیز کی کثرت بتانا اور 'موسیٰ' کی تلمیح سے خدا کے نور کو بے پردہ دیکھنے کی تمنا اور اس سے ہم کلامی کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ 'عیسیٰ و مریم' کی تلمیحات سے پاک دامنی و پاک بازی کے ساتھ نطق فصیح اور لاعلاج بیماری سے شفایابی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ تلمیحات کلام میں ایک ہی وقت میں بہت سے معانی و مفاہیم پیدا کر سکتی ہیں اور انھیں تلمیحات کے ذریعے شاعر کے کلام کی تاثیر بھی بڑھ جاتی ہے اور ساتھ ہی کلام کے معنوی پہلوؤں پر روشنی بھی پڑ جاتی ہے۔ مثال میں یہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
(غالب)

حسن یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشت زناں
سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردان عرب
(احمد رضا خاں)

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے
(اقبال)

ایران سے جو تلمیحات اردو زبان میں آئیں ان تلمیحی الفاظ کی ایک طویل فہرست بن سکتی ہے۔ چند یہ ہیں، جیسے 'جمشید' کی تلمیح سے عیش و عشرت 'ضحاک' کی تلمیح سے کسی حکومت یا شخص کے ظلم و جبر کے عدم تحمل سے اس ظلم کی بیخ کنی اور 'فریدوں' کی تلمیح میں محنت کشی، امن پسندی اور مظلوم کی فریاد سنائی دیتی ہے۔ 'کیخسرو' کی تلمیح سے مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کی معلومات کا حصول اور 'رستم' کی تلمیح سے بہادری، 'افراسیاب' کی تلمیح سے توران [illegible] 'نوشیروان' سے عدل و سخا، 'جوئے شیر' کی تلمیح سے شیریں کی یاد میں پہاڑ کاٹ کر بنائی گئی وہ نہر ہے جو محنت و مشقت اور پیار کی نشانی ہے اور 'فرہاد و شیریں' کی تلمیح سے سچے عشق کی داستان کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے
(غالب)

لیلیٰ ہے نہ مجنوں ہے نہ شیریں ہے نہ فرہاد
اب رہ گئے ہیں عاشق و معشوق میں ہم آپ
(نوح ناروی)

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
(غالب)

خالص ہندوستانی رنگ میں ملبوس تلمیحات بھی اردو شاعری میں دیکھی جا سکتی ہیں جن کو شعرا نے اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔ جیسے 'رام'، 'سیتا' اور 'راون' کی تلمیحات اگرچہ ایک ہی پس منظر کو پیش کرتی ہیں مگر ان کے ذریعے شاعر الگ الگ احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ کبھی 'رام' اور 'سیتا' کے سچے پریم کی کہانی سنا کر 'راون' کو اس پیار کا دشمن بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور کبھی تلمیحاً انھیں الفاظ سے انسانوں کی نفسیاتی کیفیت کی عکاسی بھی کی جاتی ہے۔ یعنی انسان کی ذات میں ایسی خوبی و خامی بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ 'گوتم بدھ' کی تلمیح سے پران و گیان کی تلاش و جستجو اور 'گنگا' 'جمنا' کی تلمیح سے ہندوستانی تہذیب و تمدن اور گہرے معنوی رشتوں کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی ہندوستانی تلمیحات اردو شاعری کا حصہ ہیں۔

> اردو شاعری میں بہت سی تلمیحات عربی سے اور بہت سی ایران سے اور کچھ خالص ہندوستانی تلمیحات اردو زبان و ادب میں شامل ہوتی ہیں۔ اردو شاعری میں عربی تلمیحات کی بھرمار نظر آتی ہے اس لیے کہ اردو زبان و ادب پر عربی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور عربی الفاظ کا چلن بھی اردو زبان میں زور و شور سے ہونے لگا تھا اسی وجہ سے اردو شاعری میں تلمیحات کے بیشتر الفاظ عربی زبان سے مستعار ہیں۔

رام و گوتم کی زمیں حرمتِ انساں کی امیں
بانجھ ہو جائے گی کیا خون کی برسات کے بعد
(علی سردار جعفری)

اے آب رود گنگا اف ری تری صفائی
یہ تیرا حسن دل کش یہ طرزِ دلربائی
(سرور جہاں آبادی)

ڈاکٹر مصاحب علی صدیقی نے تلمیحات کے موضوع پر اپنی پی ایچ ڈی کے مقالے 'اردو ادب میں تلمیحات' میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تلمیحات کی افادیت و مقصدیت پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے تلمیح کو کلام کا ایسا جزو بتایا ہے جس کی وجہ سے کلام کا حسن اپنی مکمل رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہ تلمیحات کلام کو حسن بخشتی ہیں، کلام میں ایجاز پیدا کرتی ہیں اور کلام کو بلاغت کا مرقع بنا دیتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ تلمیحات ہمیں اپنے ماضی سے بھی ہمکنار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"تلمیح دراصل ایک فطری تقاضا ہے، وہ سماج کی ضرورت کا ایک سرچشمہ ہے۔ وہ تمدن کا سنگ میل ہے، وہ ایجاز و اختصار کی ایک اہم کڑی ہے، وہ حسن کلام کا مرقع ہے، عروج کمال کی کسوٹی ہے جو نہ صرف ایک قدیم صنعت ہے بلکہ دیگر صنائع کے مقابل میں یہ صنعت نہایت دلچسپ، لطیف اور جامع ہے۔"

(مصاحب علی صدیقی، اردو ادب میں تلمیحات فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، یوپی، 1990، ص10)

تلمیحات میں شاعر کی جدت طرازی کا سراغ تلمیح

کو استعارہ بنا کر پیش کرنے میں ملتا ہے۔ اس لیے کلام میں ظاہری اور معنوی حسن کے لیے استعارہ سازی نہایت ضروری ہے۔ تلمیح بھی چند حرفوں کا ایک استعارہ ہی ہوتی ہے جس میں زمانے اور تاریخ کے گہرے نقوش پیوست ہوتے ہیں۔ علم بدیع محسنات لفظیہ و معنویہ سے بحث کرتا ہے اور صنائع معنویہ کی اعلیٰ مثال میں تلمیح کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ تلمیح کو اشعار میں کس طرح برتا جائے تو اس کا کوئی باضابطہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ پھر بھی اس کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔

پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ تلمیحی الفاظ جس پس منظر میں لائے گئے ہیں وہ واضح ہونا ضروری ہے ورنہ قاری پر اس کا اثر نہیں ہوگا اور اس کا ذہن اس واقعے تک بہ آسانی نہ پہنچنے کی وجہ سے کلام کی معنویت ختم ہو جائے گی جس کے لیے کلام کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کی مثال میں غالب کا وہ شعر ہے جس میں انھوں نے ایرانی تہذیب کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اگر اس شعر کی وضاحت خود غالب نہ کرتے تو اس شعر میں پیش کی گئی تلمیح بے سود رہ جاتی۔ اس سے بس اتنا سمجھ آتا کہ یہ دنیا اور اس کے اسباب و علل کو حقیقی ثبات نہیں ہے بلکہ سب فانی ہے۔ جب کہ اس شعر کو اس طرح سمجھنا بھی تلمیحی کسر پوری کر دیتا ہے مگر پھر اس کی معنویت کیا رہ جاتی۔ اس طرح کا خیال تو میر تقی میر کے یہاں بھی ہے اور بہت واضح انداز میں ہے۔ اس لیے کلام کی معنویت ان تلمیحی الفاظ سے بہتر ہوتی ہے جن کا پس منظر بہت واضح ہوتا ہے۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر ایک ہی شعر میں متعدد تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے تو اب پہلے مصرعے میں تلمیحی لفظ ہو یا دوسرے مصرعے میں یا پھر دونوں مصرعوں میں۔ اس وقت رعایت الفاظ بہت ضروری ہوتی ہے ورنہ اس صورت میں بھی کلام کی معنویت باقی نہیں رہے گی۔ مثال کے طور پر ولی کا یہ شعر ملاحظہ ہو

اے سکندر نہ ڈھونڈ آبِ حیات
چشمۂ خضر خوش بیانی ہے

اس شعر میں سکندر، آبِ حیات، چشمۂ خضر تلمیحی الفاظ ہیں مگر ان میں ایک طرح کی رعایت برتی گئی ہے۔ شاعر نے ذوالقرنین 'سکندر' کی تلمیح سے لوگوں کو یہ تلقین کی ہے کہ آبِ حیات کی تلاش بے سود ہے۔ کیونکہ خضر بھی اپنی طویل عمر سے عاجز آ چکا ہے۔ اس لیے کم عمر میں نیک کام کر کے مر جانا ہی بہتر ہے۔ اس طرح کے اشعار اس انسان کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں جو بے جا حرص و طمع کی خواہش رکھتا ہے۔ کیوں کہ آخر میں تو موت ہی مقدر بنتی ہے۔ اس طرح شاعر نے تلمیح میں مراعات النظیر کی صنعت سے ایک معنوی اور لفظی ربط پیدا کیا ہے۔

> تلمیحات ادب کی جان ہیں اور اس ادب کی پہچان بھی ہیں جو بیک وقت قوم کے احوال و آثار، ان کی تہذیب و ثقافت، سماجی ضروریات، معاشی ہم آہنگی اور معاشرتی رہن سہن کو پیش کرتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کی عکاس ہیں کہ جب انسان کا رہن سہن اور آپسی ملن ہوا تو یہی تلمیحات ان کو آپس میں کلام کرنے اور ایک دوسرے کی بات کا مفہوم سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی رہیں۔

تیسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی شعر میں مختلف تلمیحی الفاظ کا استعمال کیا جائے جو الگ الگ قصوں یا واقعات سے تعلق رکھتے ہوں اور ساتھ ہی ان کا پس منظر بھی الگ الگ ہو۔ لیکن ان کے درمیان ایک مشترکہ خصوصیت ہو۔ اس طرح کے اشعار بھی اردو شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جیسے مومن کا یہ شعر اس کی واضح مثال بن سکتا ہے۔

وہی مذہب ہے اپنا بھی جو قیس و کوہ کن کا تھا
نئی راہ افترا ہے کب بھلا مومن نے بدعت کی

'قیس'، 'کوہ کن' یہ الفاظ اپنے اندر عشق و عاشقی کی پوری تہذیب لیے ہوئے ہیں۔ مومن نے اس شعر میں 'قیس' اور 'کوہ کن' کا ذکر کیا ہے۔ جب کہ یہ تلمیحی کردار الگ الگ قصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان میں قدر مشترک 'عشق' ہے۔ کیونکہ 'قیس'، 'کوہ کن' دونوں اپنے عشق میں ثابت قدم رہے اور اس طرح دونوں سچے عشق کا مظہر بن گئے۔ مومن نے بھی ان الفاظ کو شعر میں جمع کر کے اپنے روایتی عشقی رویے کی داستان بیان کر دی ہے۔ یہی تو شاعر کا کمال ہوتا ہے کہ وہ کن الفاظ سے مضمون کی ادائیگی میں بہتر معانی پیدا کر سکتا ہے۔ شرف الدین مضمون کا یہ شعر بھی کچھ اسی طرز پر ہے۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبرِ ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا

اس شعر میں 'صبرِ ایوب' سے ایک الگ کہانی مراد ہے اور 'گریۂ یعقوب' سے فراق یوسف مراد ہے۔ مگر ان میں قدر مشترک 'عشق' ہے جس میں عاشق کا مقدر، قوت برداشت اور صبر و تحمل کی تلقین کی جاتی ہے کہ عشق میں جو صبر ہے۔ اس میں تو مرتبہ ایوب تک پہنچ جا اور اس کے فراق میں مرتبہ یعقوب حاصل کر لے۔ کیوں کہ ایک سچا عاشق اپنے محبوب کے سچے عشق میں سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ شاعر اپنے کلام کے ایک ہی شعر میں مختلف تلمیحات سے مختلف معانی و مفاہیم اخذ کر سکتا ہے۔ بقول الطاف حسین حالی: کہیں آہوئے مادہ سے آفتاب مراد لی ہے اور کہیں اشک زلیخا سے کواکب اور کہیں آب خنک سے پیالہ، کہیں پنج دریا سے پانچ انگلیاں۔ تلمیحی الفاظ بھی کچھ اسی نہج پر مبنی ہوتے ہیں کہ شاعر ایک ہی تلمیحی لفظ سے کبھی گل و گلشن مراد لیتا ہے تو کبھی اسی لفظ سے محبوب کے رخسار مراد لیتا ہے۔

تلمیح کا اصل کمال غزلیات میں رمزیاتی کیفیت، لفظی حسن اور کلام میں پہلو در پہلو معنویت پیدا کرنا ہوتا ہے اور شاعر ان تلمیحات کے ذریعے اپنے سامع یا قاری کو تخیل کی ایسی پر اثر وادی میں لے جاتا ہے کہ جس میں اس کی عقل حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔ شاعر ہزاروں نت نئے اسالیب اختیار کر کے قاری کو مسحور کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ شاعری ہی وہ میدان ہے جس میں صنائع و بدائع کا استعمال کر کے ایک لفظ کے متعدد متناسب اور متضاد معانی پیدا کیے جا سکتے ہیں اور یہ شاعر کا کمال ہوتا ہے کہ وہ ایک لفظ کو شاعری میں برتنے کے لیے کتنے جتن کر سکتا ہے۔ شاعری، شاعر کے موضوعات کے محور میں گھومتی ہے اور موضوعات الفاظ سے پیدا کیے جاتے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے شاعر کے لیے جتنا ہو سکتا ہے۔ وہ انوکھے اور عمدہ مضامین تلاش کر کے ان میں اپنی تخلیقی قوت صرف کر کے قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور قاری کا ذوق جمال بھی شعر پڑھتے ہی اس میں پیش کیے گئے مضمون کی معنویت، انوکھا پن، حسن کی کرشمہ سازی اور الفاظ کی مرصع سازی کو جان لیتا ہے۔ اس لیے شاعری کے لیے سنجیدگی اور شاعر کے لیے تخلیقی صلاحیت نہایت ضروری ہے۔

تلمیحات ادب کی جان ہیں اور اس ادب کی پہچان بھی ہیں جو بیک وقت قوم کے احوال و آثار، ان کی تہذیب و ثقافت، سماجی ضروریات، معاشی ہم آہنگی اور معاشرتی رہن سہن کو پیش کرتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کی عکاس ہیں کہ جب انسان کا رہن سہن اور آپسی ملن ہوا تو یہی تلمیحات ان کو آپس میں کلام کرنے اور ایک دوسرے کی بات کا مفہوم سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی تھیں۔

■

Mohammad Arif
Room No.: 258, Tapti Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.:9027564028

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

مثالی طالب علم کیسے بنیں؟

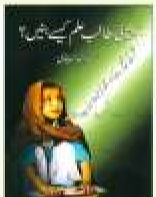

مصنف: سعید احمد سندیلوی

صفحات: 125، قیمت: 85، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: فردوس بانو، M-109، گلمرگ اپارٹمنٹ، فرسٹ فلور ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

بچے قوم کا سرمایہ ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے انھیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنا والدین کا فرض اولین ہے۔ آسمانی کتب وصحائف، مہذب ومتمدن قوم سدا صلح پسند وامن پرست ہوا کرتی ہیں۔ وہ تمام علوم، جو علم نافعہ کی فہرست میں آتے، انسانوں کو حاصل کرنا فرض ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'مثالی طاب علم کیسے بنیں؟' کا مقصد و مدعا ملک میں امن وآشتی کی ترسیل وترویج ہے لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے قوم کے بچوں کو تعلیم یافتہ بنانا لازم ہے کیونکہ قوم کا مستقبل انھیں بچوں پر منحصر ہے۔ یہی بچے ڈاکٹر، انجینئر، سائنسداں اور ملک وقوم کے رہنما بنتے ہیں۔

ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی نے اپنی کتاب میں ملک کی ترقی وخوشحالی کے لیے تین زاویے پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، جس کے تحت تین ابواب قائم کیے ہیں، باب اول برائے طلبا وطالبات، باب دوم برائے والدین، باب سوم برائے اساتذہ: ماں باپ اولاد کے لیے صلبی حیثیت رکھتے ہیں، جب کہ اساتذہ کی حیثیت روحانی ماں باپ کی ہوتی ہے۔ اس لیے سماج ومعاشرے کے یہ دونوں طبقے اپنی اولاد کی ترقی کے خواہاں ہوتے ہیں نیز ان کی سربلندی پر فخر کرتے ہیں، تاہم اسی لیے اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں حتی المقدور سعی وجہد سے کام لیتے ہیں۔

ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی نے باب اول میں طلبا و طالبات سے خطاب کرتے ہوئے مشرقی ومغربی علوم واصول پر مشتمل ساٹھ صفحات میں ایک طویل گفتگو کی ہے۔ تمام گوشہ ہائے حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے رات اور دن نیز وقت کے صحیح استعمال کے زریں اصول وہدایات رقم کی ہیں۔ حکما، اطبا اور فلسفیوں کے اقوال وفرمودات اور مصلحین قوم کے ارشادات نقل کیے ہیں۔ غیر منظم وبے اصولی زندگی کے نقصانات کی نشاندہی کی ہے، ذہنی وجسمانی صحت کے گُر بیان کیے ہیں۔ چند ضروری تغذیاتی اجناس کی تشخیص کی ہے جو حافظے اور دماغی قوت میں مفید ومعاون ہوتی ہیں۔

نصابی کتب ومضامین کی تیاری کے لیے کتب ورسائل اور اخبارات سے انگریزی اردو کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ باب دوم: برائے والدین صفحہ 61 سے 115 تک محیط ہے۔ گویا یہ بھی طویل باب ہے۔ اس موضوع کے تحت سندیلوی صاحب نے والدین کے فرائض و ذمے داری کی وضاحت کرتے ہوئے انبیا ورسل، محدثین ومفسرین، اکابرین وصالحین نیز علما وشعرا کی امہات کی مثالیں دی ہیں جنھوں نے اپنے لختِ جگر کی تربیت، نشو ونما اور پرورش کے لیے اپنے شب وروز قربان کیے اور ملک وقوم کو لعل بے بہا مرحمت فرمایا جن کی تقلید وتتبع پر زمانہ ناز کرتا ہے، اپنے حال ومستقبل کو سنوارتا ہے۔

ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی نے درج بالا مشاہیر، شخصیات کی زندگی سے ماخوذ بہت سارے رہنما نکات بیان کیے ہیں جن کی روشنی میں بچوں کے ساتھ والدین کے رویے، طریق تربیت کی وضاحت ہوتی ہے، آخر میں بچوں کے طرز تعلیم کے طریقے، والدین کی معاونت اور ہوم ورک کی تکمیل میں والدین کے کردار کو واضح کرتے ہوئے مثبت مشورے دیے ہیں جن سے بچوں کی تعلیم پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ حسب ضرورت اقوال واقتباسات اور اشعار سے اپنی باتوں کو مدلل ومستحکم بنایا ہے تاکہ مثالوں سے باتیں ذہن نشیں ہوجائیں۔ اس مضمون کے تحت میں ایک نہایت اہم اور بلیغ اقتباس نقل کرتی ہوں:

''ہمارے نبیؐ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ حضرت سلیمانؑ کی ماں نے ان کو نصیحت کی کہ بیٹا رات بھر نہ سویا کرو۔ رات کا زیادہ حصہ نیند میں گزار دینا قیامت کے دن انسان کو اچھے کاموں سے محتاج بنا دیتا ہے۔

علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی (ص 96)

مذکورہ بالا اقتباس وشعر کی روشنی میں دیکھا جائے تو رات پچھلے پہر جگنا نہایت سودمند وفرحت جاں ہے۔ اس وقت کا پڑھنا دماغ ودل پر ثبت ہوجاتا ہے۔ وقت کی فروانی وجسمانی صحت پر بہتر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

تیسرا اور آخری باب برائے اساتذہ ہے۔ یہ باب قدرے مختصر ہے یعنی صرف نو صفحات کو محیط ہے اور مکمل تحریر دس نکات پر مشتمل ہے۔ جس میں مثالی استاذ کی خوبیاں و اصول سمجھائے گئے ہیں۔ اچھے استاذ کو بچوں کے لیے اسوہ ونمونہ بننے کی تلقین کی گئی ہے، مکروہات وممنوعات سے پرہیز کرنے کی ہدایت دی گئی تاکہ بچوں میں غلط عادتیں نہ داخل ہوجائیں۔ بچوں کو خیالی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا سے متعارف کرانے کی سفارش کی گئی ہے۔ پرکشش طریقۂ تدریس اختیار کرنے، بچوں کو خود سوچنے اور غور وفکر کے

مواقع دینے کی بات کی گئی ہے تاکہ بچوں میں خوداعتمادی پیدا ہو۔ نظم وضبط سکھانے اور کردار سازی کے لیے بچوں کی تعریف وتحسین کا مشورہ دیا گیا ہے۔

تینوں ابواب میں مصنف نے ڈھیر ساری کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور حسب ضرورت اقتباسات نقل کرتے ہوئے حوالے بھی دیے ہیں جس سے کتاب کی معتبریت اور اہمیت مسلم ہوجاتی ہے۔ کتاب ہٰذا طلبہ ونوجوانوں اور ممالک واقوام کے حق میں نہایت مفید ہے۔

مبادیات صحافت وادارت

مصنف: احمد جاوید

صفحات: 128، قیمت: 45 روپے، اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر یوسف رامپوری، محلہ ٹنڈولہ ٹانڈہ رامپور، یوپی

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ اردو میں صحافت پر پے در پے مضامین ومقالات لکھے جارہے ہیں، کتابوں کی اشاعت بھی عمل میں آرہی ہے اور سمیناروں وکانفرنسوں کا انعقاد بھی ہورہا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو میں صحافت کو ایک زندہ موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو میں صحافت کے موضوع پر جو سرمایہ موجود ہے، اس پر نگاہ دوڑانے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل نہیں کہ بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو صحافت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہیں یا جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ بہت سی کتابیں تو ان کتابوں کا چربہ معلوم ہوتی ہیں جو کئی دہائیوں قبل اس وقت لکھی گئی تھیں جب اخبارات ورسائل کو منظر عام پر لانے کے اتنے وسائل وذرائع نہ تھے۔ لیکن آج جب اخبارات ورسائل جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہوگئے ہیں تو اخبارات ورسائل نکالنے کے طریقوں میں بھی تبدیلی آئی ہے اور کچھ اصول وضابطے بھی بدلے ہیں۔ گویا کہ صحافت کے جدید منظرنامہ کو سامنے رکھ کر صحافت پر نئی کتابوں کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت محسوس ہورہی ہے۔ حال ہی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتاب 'مبادیات صحافت وادارت' اس تقاضے کو پوری کرتی نظر آتی ہے جسے اردو کے معروف صحافی اور کالم نگار احمد جاوید نے تصنیف کیا ہے۔

صاحب کتاب نے اس کتاب میں صحافت کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے صحافت کا پس منظر بیان کیا ہے، صحافت کے فن پر بھی روشنی ڈالی ہے، موجودہ عہد میں جو تبدیلیاں صحافت کے شعبہ میں رونما ہوئی ہیں، انھیں بھی پیش نظر رکھا ہے اور کس طرح اخبارات ورسائل بنیادی اصولوں سے ہٹ رہے ہیں، ان پر بھی گفتگو کی ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں نئی جانکاریاں فراہم کی گئی ہیں۔

پیش نظر کتاب میں شامل اشاعت مباحث کی اہمیت کا اندازہ ان عنوانات پر نظر ڈالنے سے ہی ہوجاتا ہے جنھیں فہرست میں مذکور کیا گیا ہے۔ مثلاً مبتدا وخبر، صحافت کا ایک عبوری دور، بند گلی سے آگے، رجحانات اور تقاضے، اداریہ نویسی کا فن وغیرہ۔ کتاب کو تین فصلوں میں بانٹا گیا ہے اور ہر فصل کے تحت مختلف ابواب قائم کیے گئے ہیں جن کے عنوانات اس طرح ہیں: اداریہ کے معنی اور خصوصیات، رائے عامہ اور اداریے، اداریہ اور دیگر اصناف صحافت، اداریہ کا مواد، مخاطب اور تکنیک، مجلس ادارت، اداریہ نویسی کی تکنیک، معیار، موضوعات اور اخلاقیات، اداریہ کے موضوعات اور اس کے عوامل، اداریہ کی درجہ بندی، اداریہ کی ساخت اور خامیاں، صحافت وادارت کی اخلاقیات، کاروبار صحافت، شعبے اور ساخت وغیرہ۔ مذکورہ ابواب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پیش نظر کتاب میں صحافت کے متعدد پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے، البتہ زیادہ زور اداریہ نویسی پر دیا گیا ہے۔

اداریہ نویسی پر قائم کیے گئے ابواب کے تحت بھی مختلف ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں تاکہ ہر پہلو واضح ہوجائے۔ مثلاً پہلے باب کے تحت جو ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں، وہ اس طرح ہیں: اداریہ کی تعریف، اداریہ کی تاریخ، اداریہ کی خصوصیات، اداریہ کی نوعیت، اداریہ کی خوبیاں۔ دوسرے باب 'رائے عامہ اور اداریئے' کے مشمولات اس طرح ہیں: رائے عامہ کی تعریف، رائے عامہ کی اہمیت، رائے عامہ کی تعمیر وتشکیل، اداریے کی رائے عامہ سازی۔ تیسرے باب میں اداریہ سے متعلق چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان کی الگ الگ ذیلی سرخیاں قائم کی ہیں، مثلاً اداریہ اور خبر، اداریہ اور فیچر، اداریہ اور کالم، اداریہ کی قسمیں، اختلاف ذرائع اور اصناف صحافت۔ دوسری فصل کے پہلے باب میں اداریہ نویسی اور تحقیق، اداریہ کے مواد کے سرچشمے، مواد کی جانچ پڑتال پر بات کی گئی ہے۔ جب کہ اسی فصل کے دوسرے باب میں اداریہ کیسے لکھیں، اداریہ کے قارئین رمخاطب، اداریہ نگاری کی تعریف اور اداریہ نگار کی صلاحیتیں وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ اس طرح ہر باب اپنے جلو میں نئے گوشے رکھتا ہے اور معلومات کا خزینہ ہے۔ کتاب کے مصنف احمد جاوید نے صحافت وادارت کی اخلاقیات پر بھی جامع بحث کی ہے اور یہ پوری بحث جن نکات پر قائم ہے، وہ اس طرح ہیں: اخلاقیات کی تعریف اور تاریخ، اخلاقیات اور قانون، اداریہ نگاری کی اخلاقیات، صحافتی اخلاق کے اہم نکات، صحافتی اخلاق وکردار کی نگرانی اور صحافتی اخلاقیات کا عالمی معیار۔ اخلاقیات کے حوالے سے یہ گفتگو اس لیے بہت ضروری ہے کہ آج کے صارفی دور میں جہاں ہر شعبے میں اخلاقیات کی سطح پر زوال آیا ہے، وہیں صحافت کا شعبہ بھی محفوظ نہیں رہ سکا ہے، حالانکہ صحافت اپنے مزاج اور تقاضے کے لحاظ سے اخلاقیات سے مزین اور اخلاقیات کا داعی ہونا چاہیے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے کتاب کا یہ باب بہت اہمیت کا حامل ہے۔

مبادیات صحافت وادارت' میں اداریہ پر زیادہ توجہ غالباً اس لیے دی گئی ہے کہ دراصل اداریہ اخبار میں روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اداریہ کے بغیر اخبار ادھورا نظر آتا ہے، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اداریہ جس قدر اہم ہے، اسی قدر اس سے لاپرواہی برتی جارہی ہے۔ زیادہ تر اخبارات کے اداریے بہت سطحی ہوتے ہیں۔ بہت سے مدیر حضرات تو اداریے کا مناسب موضوع تک متعین نہیں کرپاتے اور بہت سے ایڈیٹر حضرات اداریہ میں وہ تمام نکات نہیں اٹھا پاتے جن پر بات کرنا اہم ہوتا ہے، بس اداریہ کو ایک بھرتی کی چیز سمجھ لیا جاتا ہے۔ غالباً اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اداریہ لکھنے والے زیادہ تر حضرات اداریہ نویسی کے فن سے کماحقہ واقفیت نہیں رکھتے اور اداریہ کے لیے جس قدر گہرائی، وسعت نظر اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس پر توجہ نہیں دیتے۔ پیش نظر کتاب میں اداریہ کے حوالے سے جن مباحث پر بات کی گئی ہے، وہ تمام صحافیوں کے لیے بہت اہم ہیں، خاص طور سے اداریہ لکھنے والوں کے لیے ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ صاحب کتاب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے صحافت پر اتنی معلوماتی کتاب تصنیف کی اور صحافت سے وابستہ افراد کے لیے ایک تربیتی دستاویز رقم کی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کتاب کو اچھے انداز میں شائع کیا ہے، ٹائیٹل بھی دیدہ زیب ہے، کاغذ اور طباعت بھی معیاری ہے۔ اس کے باوجود کتاب کی قیمت بہت کم ہے۔ کم قیمت رکھنے کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ قارئین اس کتاب کو آسانی سے خرید سکیں۔ صحافت کے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہ ادارہ صحافت پر اس سے پہلے بھی کئی کتابیں شائع کرچکا ہے جو اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔

تحقیق و تنقید

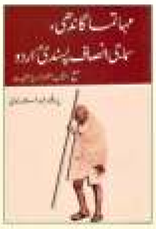

کتاب مہاتما گاندھی

سماجی انصاف پسندی اور اردو مع انتخاب منظوم خراج عقیدت
مؤلف/ ناشر: پروفیسر عبدالستار دلوی
صفحات: 208، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2020
مبصر: عبدالمالک بلند شہری، A-126/5، شاہین باغ، نئی دہلی

گاندھی جی اپنے عہد کے ایک مہان انسان، ماہر تعلیم، انصاف پسند لیڈر، سیاسی رہنما اور بے ضرر انسان تھے۔ انھوں نے ساری دنیا کو اہنسا اور پریم و پیار کا پاٹھ پڑھایا۔ ان کا جیون تیاگ و قربانی، ریاض و جفاکشی، محبت و ایثار سے عبارت ہے۔ انھوں نے جہاں دیگر قوموں اور ملتوں کی ترقی و کامیابی کی فکر کی وہیں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق کے لیے بھی آواز اٹھائی اور ان کے حقوق کی بازیابی کے لیے تادم آخر متحرک رہے۔ ان کا فلسفہ جیو اور جینے دو والا تھا۔ وہ بھارت کی خوشحالی، ترقی اور کامیابی کے لیے اس میں بسنے والی تمام قوموں اور زبانوں کی ترقی کو ضروری سمجھتے تھے۔

آزادی ہند کے بعد سے اردو زبان کے تار و پود کو بکھیرنے کی بڑی کوشش ہوئی۔

اس دور میں اردو کے جن مخلص رہنماؤں نے آوازیں اٹھائیں اور اردو کا دفاع کیا ان میں گاندھی جی بعض وجوہات کی بنا پر بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔

پیش نظر کتاب میں گاندھی جی کی انصاف پسندی اور اردو کے تئیں محبت و پریم کی دلآویز داستان بڑے منطقی انداز میں بیان کی گئی ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے بڑی جانفشانی اور سلیقہ سے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ پروفیسر عبدالستار عہد رواں کے ممتاز محقق و دانشور اور ماہر لسانیات ہیں، وہ برسوں سے قلم و قرطاس کے ذریعے اور دیگر طریقوں سے فروغ اردو کے سلسلے میں کوشاں ہیں۔

کتاب کا آغاز مؤلف کتاب کے مقدمہ سے ہوتا ہے اس میں انھوں نے بڑی تفصیل سے گاندھی جی کے لسانی نظریہ اور اردو نوازی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''گاندھی جی اردو اور ہندی دونوں کے چاہنے والے تھے لیکن انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی ماحول میں اک معتبر اور عظیم زبان اردو کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔''

اس کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پہلے حصہ کے تحت نو مضامین ہیں۔

'گاندھی جی کی تعلیمات اور ان کی عصری معنویت' اس مضمون کے تحت گاندھی جی کے لسانی تصورات اور ان کی تعلیمات بیان کی گئی ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ موجودہ دور میں ان کی کیا اہمیت و افادیت ہے۔

'مہاتما گاندھی قومی زبان اور ہندوستانی' اردو کا ہندوستانی رجحان ان دونوں مضمونوں کے تحت گاندھی جی کا لسانی فلسفہ پیش کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندی و اردو کے اشتراک سے ہندوستانی زبان کے فروغ کے لیے کوشاں تھے۔ وہ سنسکرت آمیز ہندی اور فارسی آمیز اردو کے بجائے مقامی بولی کو فروغ دینا چاہتے تھے اور ان کا یہ منصوبہ نیک نیتی پر مبنی تھا کیونکہ وہ اردو و ہندی سے یکساں طور پر پریم کرتے تھے۔

'مہاتما گاندھی اور اقبال' اس مضمون میں گاندھی جی کی اقبال شناسی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی باقاعدہ اردو داں تھے، انھوں نے اردو رسم الخط بھی اپنے اسفار کے دوران سیکھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ہندی داں دوستوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ وہ اپنے عہد کے اردو کے پرعظمت شاعر علامہ اقبال سے بڑے متاثر تھے اور ان کے اشعار کے بہت مداح تھے۔ انھوں نے اپنے مجلہ ہریجن میں متعدد بار اقبال کی شاعری کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ میں اقبال کی طرح اس بات پر کامل یقین رکھتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان جو ہمالہ جیسے پرعظمت پہاڑ کے زیر سایہ بستے ہیں اور گنگا اور جمنا کا پانی پیتے ہیں، دنیا کے لیے اپنے اندر ایک عظیم پیغام رکھتے ہیں۔

'مہاتما گاندھی، سماجی و لسانی انصاف پسندی اور احمد شوقی' اس عنوان کے تحت مصر کے امیر الشعرا احمد شوقی کی گاندھی جی کے استقبال میں کہی گئی نظم کا ترجمہ ہے۔

'مہاتما گاندھی، ہندوستانی اور پیرین بہن کیپٹن' اس مضمون کے تحت گاندھیائی تعلیمات و نظریات کی مبلغ اور ناشر پیرین بہن کیپٹن کی خدمات بیان کی گئی ہیں۔ پیرین بہن مشہور قومی رہنما دادا بھائی نوروجی کی پوتی تھیں۔ گاندھی جی نے جب ہندوستان کی اشاعت کے لیے ہندوستانی پرچار سبھائیں قائم کیں تو ممبئی کی ہندوستانی پرچار سبھا کی ذمے داری پیرین بہن کو دی، انھوں نے بڑے خلوص اور ثبات کے ساتھ اس کی حفاظت و ترقی کا کارنامہ انجام دیا۔

'گاندھی جی کا ایک یادگار خط' کے تحت گاندھی جی کے اس خط کے مشمولات ذکر کیے گئے ہیں جو انھوں نے اپنی وفات سے صرف انیس روز قبل لکھا تھا یہ خط لندن کے ایک نیلامی ادارے میں آیا تھا جہاں سے حکومت ہند نے اسے حاصل کر کے نہرو میموریل نئی دہلی میں محفوظ کیا۔

کتاب کا دوسرا حصہ منظومات سے متعلق ہے۔ اس میں مؤلف کتاب نے گاندھی جی کے اوصاف و مناقب پر کہی گئی اردو والوں کی نظمیں جمع کر دی ہیں اس حصہ میں اسرار الحق مجاز، جگر مرادآبادی، آنند نرائن ملا، جوش ملیح آبادی، اقبال احمد سہیل سمیت اردو کے متعدد ممتاز شعرا کے کلام شامل ہیں آخر میں ضمیمہ کتاب کے طور پر کتابیات کی فہرست ہے اور گاندھی جی کی ایک یادگار تصویر بھی ہے۔

کتاب ظاہری و باطنی خوبیوں سے مرصع ہے، ٹائٹل بھی بڑا خوشنما ہے، کاغذ بھی سفید اور اعلی کوالیٹی کا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کتاب عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے، مؤلف کے اسلوب میں سلاست و روانی بھی خوب ہے، قاری کو دوران قرأت اکتاہٹ کا بالکل احساس نہیں ہوتا، گاندھی جی کی اردو نوازی اور اردو والوں کے تئیں ان کے پریم سے آگاہی کے لیے یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔

کلام شبلی کے اعلام و اشخاص

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
صفحات: 184، قیمت: 250، سنہ اشاعت: نومبر 2020
ناشر: ادبی دائرہ، اعظم گڑھ
مبصر: ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'کلام شبلی کے اعلام واشخاص' ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ شبلی پر مصنف کی اب تک تقریباً پندرہ کتابیں اور پچاس سے زائد تحقیقی و تنقیدی مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں، جو ان کی شبلی شناسی پر دال ہیں۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے مطالعات شبلی کے ضمن میں قارئین کو ان گوشوں سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے جن کی طرف عام تو در کنار خاص کی توجہ بھی اب تک مبذول نہ ہو سکی تھی۔ مذکورہ کتاب کے پیش گفتار میں ڈاکٹر عطا خورشید نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''ان کی ہر کتاب اور ہر مقالے کی اشاعت کے بعد ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ علامہ پر اس اچھوتے موضوع کے بعد اب کیا بچا رہ گیا ہوگا جس پر خامہ

فرسائی کی جاسکے، لیکن چند مہینوں کے بعد ہی ایک نئے اور اچھوتے موضوع پر ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی کی ایک نئی کتاب منظر عام پر آجاتی ہے۔' (ص 11) یہی وجہ ہے کہ آج کا مصنف یا محقق اگر شبلی پر کچھ لکھنا چاہے تو اس کے لیے الیاس اعظمی کی کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔

مذکورہ کتاب میں مصنف نے ان شخصیات کو شامل کیا ہے جن کا ذکر شبلی کی شاعری میں موجود ہے۔ یہاں اس جانب اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ مصنف نے شبلی کے نہ صرف اردو کلام بلکہ فارسی کلام میں مذکور افراد کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مزید یہ کہ ایسے کلام جو شامل کلیات نہیں ہیں ان میں موجود اشخاص کی تفصیل بھی اس کتاب میں یکجا کر دی ہے۔ اس طرح مصنف نے کتاب میں کل 122 افراد کا تعارف و تجزیہ، تاریخی و تہذیبی حیثیت، کلام شبلی میں ان کے ذکر کے اسباب وغیرہ مختصراً بیان کر دیے ہیں۔ اس موضوع کی طرف ان کا ذہن کیوں کر منتقل ہوا اس جانب اشارہ کرتے ہوئے حرف آغاز میں لکھتے ہیں:

''...کتب و مقالات میں کلام شبلی کے اعلام و اشخاص کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ضمناً بھی اس موضوع پر اظہار خیال نہیں کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں کلام شبلی کے اس نظر انداز شدہ پہلو کی تکمیل کے لیے اردو فارسی کلام میں وارد تمام اعلام و اشخاص...کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔'' (ص 18-17)

اشخاص کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے الیاس اعظمی نے تمام شخصیتوں کے ذیل میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ عنوان یا بین السطور میں اشخاص کے ناموں کے ساتھ تاریخ ولادت اور وفات بھی لکھ دی جائے، گرچہ چند افراد ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ یہ التزام روا نہیں رکھا جاسکا لیکن اس کے باوجود مصنف کی اس کاوش سے مذکورہ کتاب حوالے کی کتاب بن جاتی ہے۔

شبلی نے اپنی شاعری میں جن اشخاص کا ذکر کیا ہے ان میں انبیا، رسول، صحابہ، خلفائے راشدین، علما، فضلا، دانشوران ملک و ملت، غیر مسلم اہل نظر، صاحب تخت و تاج، حکما اور فلسفی وغیرہ شامل ہیں اور ان ہی ساری شخصیتوں کے مختصراً تعارف سے مصنف کی یہ کتاب مزین ہے۔ کتاب میں جن اشخاص کے اسما شامل ہیں ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ، مولوی محمد حسین آزاد، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت ابوسفیانؓ، ہربرٹ اسپنسر، اسفندیار، افلاطون، راجہ اندر، بوعلی سینا، بونصر فارابی، رستم، عطیہ فیضی، حضرت علیؓ، قیصر، کسریٰ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، سلطان محمود غزنوی، سر جیمس مسٹن، نیوٹن، یزید، ہند، گلیڈ اسٹون، گنجسر و، عذرا اور سیزر وغیرہ ہیں۔ مصنف نے کتاب میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ ہر تذکرے کے آخر میں کلیات شبلی اردو اور فارسی کے ان صفحات کی نشاندہی کر دی ہے جہاں ان اشخاص کا ذکر آیا ہے۔ علاوہ ازیں ضرورت کے مطابق بعض جگہوں پر متن نقل کرتے ہوئے پس منظر بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کی تشریح و تفہیم سے حتیٰ الوسع پرہیز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں کتابیات اور اشاریہ بھی شامل ہیں۔ کتاب کا سرورق جاذب نظر اور دلکش ہے۔ پیش گفتار ڈاکٹر عطا خورشید (مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ) نے لکھا ہے جب کہ کتاب کی پشت پر ڈاکٹر خالد ندیم (صدر شعبۂ اردو اور مشرقی زبانیں، یونیورسٹی آف سرگودھا، پاکستان) نے مصنف اور کتاب کے متعلق اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مصنف کی اس کاوش کو سراہا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ مصنف کی یہ کتاب ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

ہری چند اختر: ایک متاع گم گشتہ

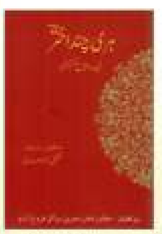

تحقیق و ترتیب: شکیل احمد صبرحدی

صفحات: 397، قیمت: 600 روپے، سنہ اشاعت: اکتوبر 2020

زیر اہتمام: مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو، بحرین

مبصر: عمران عاکف خان

5/4، گلشن نما، نور نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

'ہری چند اختر ایک متاع گم گشتہ' مختلف ماہرین ادب و اساتذۂ اردو کے گراں قدر مقالات و مضامین پر مشتمل وہ دستاویز ہے جو پنڈت ہری چند اختر کی ادب شناسی، ادبی خدمات، شاعری، صحافت اور ان کی مکمل زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس غرض سے اسے تین اہم حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول: خراج عقیدت (حیات و نظریات) جس کے تحت پنڈت ہری چند اختر کے ہم عصر ادیبوں اور احباب کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ دوم: خراج تحسین (تنقیدی مضامین) اس میں وہ مضامین ہیں جن میں ہری چند اختر کے فن و فکر اور نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ سوم: سلام شوق (انتخاب) اس میں ہری چند اختر کے کلام، ان کی نثریات اور لطائف کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان تینوں اجزا میں جیسے مکمل پنڈت ہری چند اختر کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔

بالیقین پنڈت ہری چند اختر بیک وقت صحافی، شاعر، ادیب، مفکر، گنگا جمنی تہذیب کے علم بردار، صالح فکر اور بلند نگاہ جیسی خصوصیات کے حامل ہیں اور ان میدانوں میں مہارت بھی رکھتے ہیں۔ وہ ہماری زبان و ادب کی ایک متاع گم گشتہ ہیں، جنھیں ایک زمانے تک دفینہ بنا کر رکھا گیا مگر اب نئی نسلوں اور عہد کو ان کی ضرورت آن پڑی ہے، لہٰذا فکر مند افراد نے ان کا تعارف، ان کے کلام و فکر کا تجزیہ، نقطۂ نظر کی تفسیر اور اسلوب نگارش کی تشریح کرنا شروع کر دیا ہے۔ گو ابھی وہ جامعات اور دیگر تحقیقی اداروں کا موضوع نہیں بنے، تاہم انفرادی طور پر ان کے تئیں حیرت انگیز امور انجام دیے جا رہے ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس کے محقق و مرتب شکیل احمد صبرحدی ہیں۔

سرورق سے نگاہیں ہٹنے کے بعد جب ہم اندرونی صفحات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں فہرست مضامین و شعریات میں ہر ایج گروپ کے قلم کار اور ادیب نظر آتے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: عبدالمجید سالک، گوپال متل، عرش ملسیانی، آل احمد سرور، وارث کرمانی، شافع قدوائی، فاروق بخشی، سہیل انجم، احمد سہیل، اکرم نقاش، سردار سلیم وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ دستاویزی مضامین و تحاریر بھی شامل کتاب ہیں جو پنڈت جی کے قلم سے نکلیں یا ان کے عہد اور مابعد عہد میں شائع ہوئیں پھر انھیں وقت کی گرد نے ڈھانپ لیا۔ اس طرح یہ کتاب اسم بامسمّیٰ ثابت ہوتی ہے اور ہماری زبان و ادب کی متاع گم گشتہ کی یافت و بازیافت بن جاتی ہے۔

مضامین کے علاوہ کتاب میں شامل مقدمہ خاصے کی چیز ہے۔ جس کی ابتدائی سطور ملاحظہ کیجیے:

رولاں بارتھ کے نزدیک (کتاب / تحریر) کا ایک متن تو عام قسم کا فقط پڑھا جانے والا (Readerly) ہوتا ہے اور دوسرا تخلیق کیا جانے والا (writerly) مثالی متن ہوتا ہے۔ اسی مثالی متن کی وضاحت کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک عہد یا زمانے سے وابستہ تخلیق کار کو زندگی کے متنوع رنگوں میں منعکس کر کے دیکھا جائے اور کائنات کے وسیع آفاق کو اور نقطے (محض ایک نقطے) پر مرتکز کر کے اس جوہر (اصلی) کو دریافت کیا جائے جس کی کرشمہ سازی ایک نہیں بلکہ فکر کے ان گنت زاویوں کو وجود میں لانے کا باعث ہوا اور بعد کے زمانوں میں ان کی قدر و قیمت کو کچھ اس انداز سے بازیافت کا پیراہن عطا کیا

جائے کہ پرانے سفر کی گرد بھی نظروں سے اوجھل ہو جائے........ (مقدمہ الکتاب ص:9)

ہاں! بالیقین ایسے ہی مثالی متون، تخلیقات اور تحاریر کو منظر عام پر لانے اور ان کی تفہیم و تسہیل کی ضرورت ہے جو، جو ہر اصلی ہیں اور ان کی بازیافت، فکر کے ان گنت زاویوں کو وجود بخشنے کی ضامن ہیں... اور بہت ایمان داری و محنت سے ان کی بازیافت کرکے ایسا صاف ستھرا اور نگاہ کش پیراہن بھی عطا کرنا چاہیے جو ان کے پرانے سفر کی گرد کو ڈھانپ لے...

یوں یہ مقدمہ، اس متاعِ گم گشتہ کی بازیافت کا سبب اور حاصل بن جاتا ہے۔

اپنے تمام مشمولات، عنوانات، فنی اور تکنیکی تلازمات کے ساتھ یہ کتاب، ایسی کتاب بن جاتی ہے جسے ہر بک شیلف میں جگہ ملنی چاہیے اور اردو زبان و ادب کی نئی و آنے والی نسلوں کو بطور سوغات پیش کرنی چاہیے، نیز اسے بیش قیمت اثاثے کی حیثیت بھی حاصل ہو۔

انوکھا شخص و شاعر

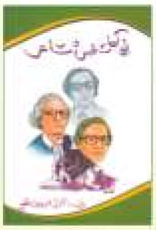

مرتب: انجینئر فیروز مظفر

صفحات: 528، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: شمع افروز زیدی

1/47، رحمان اسٹریٹ، مرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی 25

عالمی شہرت یافتہ ادیب و شاعر پروفیسر مظفر حنفی کے صاحب زادے انجینئر فیروز مظفر کی اب تک 12 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ مکتوبات ساغر نظامی، مظفر حنفی سوالوں کے حصار میں، تیزاب میں تیرتے پھول، مظفر حنفی: ایک مطالعہ، مظفر حنفی: حیات و جہات، عادل اسیر ایک مطالعہ، ساغر بنام ذکیہ، کمان، ہیرے ایک ڈال کے، تنقیدی نگارشات، شاد عارفی: حیات و جہات، اور شاد شناسی وغیرہ۔ اس برس اپریل 2021 میں ان کی تیرہویں کتاب بہ عنوان 'انوکھا شخص و شاعر' بازار میں آئی ہے جو 528 صفحات پر محیط ہے۔ فیروز مظفر اس لحاظ سے بے حد خوش قسمت ہیں کہ ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود 13 کتابیں قارئین کے درمیان پیش کیں۔ یہ ان کا ایسا اہم کارنامہ ہے جو ادبی حلقوں میں ان کی پہچان کراتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ والد محترم سے اکتساب فیض سب سے زیادہ ان کے حصے میں آیا۔ وہ قدم قدم پر والد محترم کی خدمت میں رہنے کے سبب ان کی تمام تر صلاحیتوں سے واقف رہے اور ہر پل ان کے ذریعے علم کا خزانہ کشید کرتے رہے۔

عام خیال ہے کہ کتاب کی ترتیب و تدوین ایسا قابل ذکر کارنامہ نہیں لیکن مجھے ایسے حضرات کی کوتاہ نظری اور خام خیالی پر افسوس ہوتا ہے۔ کتاب مرتب کرنا اتنا سہل نہیں جیسا کچھ حضرات تصور کرتے ہیں۔ دراصل جو اسکالر ترتیب و تدوین کے مرحلے سے گزرتا ہے، محنت صرف کرتا ہے، عرق ریزی سے کام لیتا ہے وہ بہتر جانتا ہے کہ کہنے اور عمل کرنے میں کتنا تضاد ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں مضامین کی شمولیت دیکھ کر ہی مرتب کی محنت واضح ہوتی ہے۔ مضامین، تبصرے، انٹرویو، مظفر حنفی کا شعری منظر نامہ اور ان کی نثری کاوشوں پر مشاہیر اردو ادب نے اپنے اپنے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں خالی جگہوں کو مرتب نے یونہی ضائع نہیں کیا بلکہ اس میں کرشن چندر، سلیم اختر، عبدالقوی دسنوی، گوپی چند نارنگ، فرمان فتح پوری، محمد حسن، خلیق انجم، سید اعجاز حسین، وزیر آغا، آل احمد سرور، انور سعید، علیم اللہ حالی، علی جواد زیدی، اختر سعید خاں جیسے زعمائے ادب کی آرا شامل کرکے کتاب کے حسن و معانی میں مزید اضافہ کردیا ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ کسی بھی کام کے لیے محنت، لگن اور ادب کے تئیں محبت موجزن ہوتی ہے اور ان سب پر مستزاد عشق کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

عشق کی بھی اقسام ہوتی ہیں۔ محبوب سے عشق، بیوی سے عشق، اولاد سے عشق، خود اپنی ذات سے عشق، لیکن یہاں فیروز مظفر کا اردو سے عشق کے ساتھ والد محترم سے عشق سب پر حاوی ہے اور کیوں نہ ہو کہ انھوں نے لڑکپن سے ہی جس ماحول میں پرورش پائی، جن اخلاقی قدروں سے روشناس ہوئے انھیں مہمیز کرنے میں اسی عشق کی کارستانی ہے۔ اللہ کا کرم اور والد محترم کی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ فیروز مظفر یہ بارگراں اٹھانے نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ مسلسل کوشاں بھی رہتے ہیں۔

کتاب کا چہار رنگا سرورق اور اس پر مظفر حنفی کی مختلف موڈز کی تصاویر قارئین و ناظرین کو متاثر کرتی ہیں۔ کتاب کاغذ اور اچھی کتابت و طباعت سے مزین ہے۔

خودنوشت

اوراق ہستی

مصنف/ ناشر: رضوان اللہ

صفحات: 488، قیمت: 800 روپے، سنہ اشاعت: 2020

مبصر: حامد حسین

مقام: ڈومریا، تھانہ: رانی گنج، ضلع ارریا۔ 854334 (بہار)

خودنوشت ایک ایسا فن ہے جس کا موضوع خود فنکار کی ذات ہے۔ اس میں فنکار کی داخلی اور خارجی زندگی یکجا ہو جاتی ہے، جس میں ہمیں شخصیت کے ایسے مظاہر ملتے ہیں جن سے مصنف کے علاوہ کوئی واقف نہیں ہوتا۔

خودنوشت سوانح عمری کا مصنف اپنے عہد کی تاریخ کا ایک حصہ ہوتا ہے خواہ وہ حصہ کتنا ہی مختصر ہو، جس سے ان کے مشاہدات اور تجربات جڑے ہوتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'اوراق ہستی' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس کے مطالعے سے مصنف کے وسیع تجربات اور مشاہدات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی نظریات سے بھی آگاہی ملتی ہے۔

یہ کتاب 488 صفحات کے ساتھ چار اوراق پر مشتمل ہے، دیباچہ اس پر مستزاد ہے۔

کتاب کے مطالعے سے جو مشترک خوبیاں بیک وقت سامنے آتی ہیں وہ یہ کہ مصنف نے زبان و بیان کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے، اپنی باتوں کو رکھتے ہوئے صاف گوئی اور بے لاگ بیانی سے کام لیا ہے، بقدر ضرورت انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔

درمیان میں کہیں پورے شعر اور کہیں ایک مصرعے کا برمحل استعمال کرکے اپنی باتوں کو تقویت بخشی ہے۔ مناظر قدرت کے حوالے سے جو تحریر پیش کی ہے اس میں ادبی چاشنی کی دنیا آباد کردی ہے۔

120 صفحات پر پھیلا ہوا اس کتاب کا پہلا ورق مصنف کے ابتدائی حالات پر مبنی ہے۔ تعلیم و تربیت کے حوالے سے بھی، کوڑیا پار، دبستان کانپور اور مدرسہ فیض عام جیسی جگہوں کا اس ورق میں بالخصوص ذکر کیا گیا ہے۔ جہاں مصنف کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی راہیں ہموار ہوئیں۔ اس کے بعد جونپور، کلکتہ، دیوریا اور بنارس جیسے مقامات کا بالترتیب بیان بھی ہے، جہاں مصنف نے تلاش معاش کے کٹھن مراحل طے کیے۔

اس ورق میں پیش کیے گئے واقعات اور حادثات کا تعلق برصغیر کے ایک انقلاب انگیز دور سے ہے۔ جہاں سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر زبردست تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ایسے میں اپنی جگہ پاؤں جمائے رکھنا بڑے حوصلے کی بات تھی لیکن مصنف نے

حوصلے کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کیا۔ پریشانیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کی عمدہ مثال قائم کی۔

دوسرے ورق میں مصنف کی پیشہ ورانہ زندگی کا باضابطہ آغاز اور صحافت سے وابستگی کا ذکر ہے۔ 1951 سے 1975 تک سرزمین کلکتہ پر مصنف کی صحافتی زندگی اور اس درمیان پیش آنے والے واقعات و تجربات اور مشاہدات کا بیان ہے۔

صحافت کی تعریف، اردو صحافت آزادی کے بعد، صحافت کا ایک نیا باب، سفارتی صحافت، اس باب میں ایسے مخصوص عناوین ہیں جس سے صحافت کی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے مصنف کی فکرمندی صاف طور پر عیاں ہوتی ہے۔

سیاسی اور سرمایہ دارانہ حملے سے صحافت اور اس سے جڑے افراد کو جن مشکلات کا سامنا تھا مصنف نے ان کا بھی بطور خاص ذکر کیا ہے۔ کلکتہ کو الوداع کہنے سے پہلے 18 سال 'عصر جدید' اس کے بعد 'آزاد ہند' سے وابستگی اسی اثنا میں سفارتی صحافت سے جڑنے کا واقعہ بھی مذکور ہے، جس نے مصنف کو زندگی کے تجربات کا بیش بہا خزانہ عطا کیا۔ زندگی کی آسائشوں کے عوض سخت کوشی سے لذت آشنا کیا۔

تیسرا ورق مصنف کی پیشہ ورانہ زندگی کے تسلسل کا اظہار ہے۔ اس ورق میں شامل نئی دنیا، نئے شہر، نیا آفس جیسے عنوان میں مصنف کی دہلی میں سفارتی صحافت کا بیان ہے۔ اندرون ملک اور بیرون ملک ہونے والے سفارتی اسفار کا ذکر ہے۔

مجموعی طور پر یہ ورق دہلی سے مصنف کی سفارتی صحافت کے آغاز و اختتام اور اس دوران پیش آنے والے واقعات و حادثات کا عمدہ اظہار ہے۔

صحافت کے ساتھ ساتھ عالمی منظرنامے پر جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ان پر بھی مصنف کی آفاقی نظر تھی۔ جس کا اندازہ اس ورق کے اختتامیہ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ سویت یونین باقی نہ رہا جس نے مغرب سے نمو پذیر ہونے کے باوجود سارے مشرق کو بیداری کا پیغام دیا تھا، سوشلزم کی راہ دکھائی تھی، ہندوستان کا سب سے بڑا دوست اور امریکہ کا سب سے بڑا حریف نہ رہا۔ ہم نے عالمی سیاست میں یہ انقلاب بھی دیکھا۔ پھر ہندوستان اور امریکہ کی دو عظیم جمہوریتوں کو ایک دوسرے کی طرف لجائی لجائی نظروں سے دیکھتے ہوئے دیکھا۔ اس طرح وقت کی سوئی نے ایک گردش تقریباً مکمل کر لی۔ اس تمام عرصے میں ہم نے دنیا کے سب سے بڑے اطلاعاتی نظام کو نئے نئے رخ بدلتے دیکھا۔ اس کی کارکردگی برسراقتدار نظام سے ہم آہنگ اور بیرونی تغیرات سے نبردآزما ہوتے دیکھا۔ ہم جیسے کمتر انسانوں کی زندگی میں یہ یقیناً بیش بہا تجربات تھے۔

چوتھا اور آخری ورق مصنف کی سیر و سیاحت کا بیان ہے۔ اس ورق میں 23 ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی نظر میں کتنی وسعت ہے۔ ان عناوین میں بطور خاص 'یادوں کے جھروکے' اور 'نئی دنیا سے آشنائی' قابل ذکر ہیں۔

'یادوں کے جھروکے' کے تحت مصنف نے اندرون ملک ہونے والے اسفار کا ذکر کیا ہے۔ 'نئی دنیا سے آشنائی' میں بیرون ملک ہونے والے اسفار کا تذکرہ کیا ہے۔

مجموعی طور پر اردو اور انگریزی کے ممتاز صحافی، شاعر اور ادیب رضوان اللہ کی کتاب 'اوراق ہستی' قابل مطالعہ کتاب ہے۔ مصنف کی زندگی کی جھلکیاں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ گہرے تجربات، وسیع مشاہدات اور فکری بلندی کے آمیزے سے کتاب کافی وقیع ہو گئی ہے۔ اسلوب بیان کی دلکشی اور شگفتگی سے پوری کتاب میں کام لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ خود نوشت کے باب میں اس کتاب کو اہم مقام حاصل ہوگا۔

نسائیات

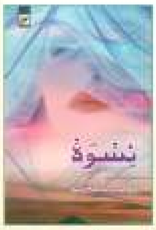

نسوہ

مصنف: پروفیسر صالحہ رشید

صفحات: 216، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: مدیحہ رحمان، 3607، کٹرہ دینا بیگ، نزد ہمدرد دواخانہ، لال کنواں دہلی

ایک زمانے میں فارسی کے بغیر خط و کتابت اور زبان کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا اور اردو فارسی کی علمی و ادبی روایت بہت حد تک مشترک تھی۔ آج بھی فارسی کے بہت سے اسکالر اردو میں کتابیں اور مضامین لکھ اور شائع کر رہے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'نسوہ' بھی اس طویل سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس تنقیدی مجموعے کی مصنفہ الہ آباد یونیورسٹی کی پروفیسر محترمہ صالحہ رشید ہیں۔ جو اس سے قبل بھی مختلف موضوعات پر اردو میں کئی کتابیں تحریر کر چکی ہیں۔

اس کتاب میں ایک درجن سے زیادہ مضامین ہیں جو عام طور پر خواتین کے مسائل اور موضوعات پر ہیں۔ جو اردو اور فارسی سے متعلق ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر صالحہ رشید خواتین کی علمی ترقی اور ان کی سماجی اہمیت پر زیادہ توجہ دیتی ہیں اور تاریخ میں اسلامی دور کی اہم خواتین کے علمی و ادبی کارناموں کو منظر عام پر لانا چاہتی ہیں۔ دیباچے میں انھوں نے لفظ عورت کی معنویت اور مفہوم پر روشنی ڈالی ہے۔ اگلے مضمون جنسی مساوات اور عالمی یوم خواتین میں 8 مارچ کے حوالے سے عالمی یوم خواتین منائے جانے کے مغربی پس منظر کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''اس زمانے میں قبیلے آپس میں لڑتے تھے۔ غالب قبیلہ مغلوب قبیلہ کی عورتوں کو قید کر لیتا اور انھیں اپنے حرم میں شامل کر لیتا۔ ان عورتوں کے بطن سے پیدا شدہ بچے زندگی بھر عار محسوس کرتے۔ اس کے علاوہ ایک ہی وقت میں ایک مرد کے نکاح میں متعدد خواتین ہوتیں۔ سگی بہنیں باپ کی مطلقہ اور باپ کی موت ہو جانے پر اس کی بیوہ کو بیٹا اپنے نکاح میں لے لیتا۔ ان سب کے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو خود کو اپنے خاندان اور قبیلے کے رکن قرار دیتے تھے، وہ ان قبیح رواجوں سے فرد کو الگ رکھتے تھے۔''

اسلام نے پہلی مرتبہ خواتین کو دیگر حقوق کے ساتھ طلاق (خلع) کا حق بھی دیا۔ شہزادہ داراشکوہ نے 'سفینۃ الاولیا' میں اٹھارہ مسلم عارفات کا ذکر کیا ہے جن میں حضرت رابعہ بصری بھی شامل ہیں۔ ایک دوسرے مضمون میں پروفیسر صالحہ رشید لکھتی ہیں کہ علامہ اقبال کے مجموعے ضرب کلیم میں عورت سے متعلق نو نظموں پر مشتمل پورا باب موجود ہے۔

مدراس میں علامہ اقبال نے اسلام میں عورت کا مقام کے موضوع پر مدلل تقریر کی تھی۔ انھوں نے والدہ مرحومہ کی یاد میں ایک مرثیہ بھی لکھا تھا۔ اگلے مضمون میں محمد علی اور شوکت علی کی والدہ کا ذکر کیا گیا ہے جو بہادری اور قربانی کا بہترین نمونہ تھیں ان کا نام آبادی بیگم تھا اور انھوں نے اپنے بیٹوں کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم دلوائی تھی۔

بی اماں کی بلند کرداری کے بارے میں ڈاکٹر صالحہ رشید لکھتی ہیں جب 1921 میں ان کے دونوں بیٹوں کو دوبارہ گرفتار کیا گیا تو وہ خود کو نہ روک سکیں اور تحریک آزادی کی سپاہی بن کر میدان میں آ گئیں۔ زیادہ عمر ہونے کے باوجود بی اماں لمبے سفر کرتیں، نہ صرف ریل کا، بلکہ بیل گاڑی اور پیدل سفر بھی ان کے جوش میں کمی نہ لاتے۔ دوران سفر ٹرین رکتی تو اسٹیشن پر ہجوم بی اماں کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کی خاطر جمع ہو جاتا۔

زیر تبصرہ کتاب میں ایک مضمون رضیہ سلطان کی تخت نشینی سے متعلق ہے۔ وہ شمس الدین التمش کی بیٹی تھی۔ اس کے دشمنوں نے حسد کی بنا پر اس کو قتل کر دیا تھا۔ ورنہ وہ اپنے

بھائیوں سے زیادہ عقلمند اور بہادر تھی۔ کتاب کا ایک اہم مضمون عصمت چغتائی کی ناول نگاری سے متعلق ہے جس میں مسلم خواتین اور ان کے گھریلو مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

ڈاکٹر صالحہ رشید نے عصمت چغتائی کے فن کا تجزیہ کیا ہے اور ان کے اہم افسانوں اور ناولوں کا جائزہ اس مضمون میں پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عصمت چغتائی نے نہ صرف عورتوں کے سماجی حالات کا مشاہدہ کرکے اپنی تخلیقات میں ان کی عکاسی کی بلکہ سماج کی ناانصافی کو دور کرنے کے طریقے بھی بتائے۔ ڈاکٹر صالحہ رشید کے مطابق عصمت چغتائی انسانی فطرت اور نفسیات سے بڑی دلچسپی رکھتی تھیں۔ اپنے پسندیدہ تخلیق کاروں ٹالسٹائی، رابندرناتھ ٹیگور اور پریم چند کی مانند قاری اور سماج کے ذہن پر اپنی تحریر کے نقوش ثبت کرنا چاہتی تھیں اور وہ ترقی پسندی کے ذریعے اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئیں۔ اس کتاب میں سعادت حسن منٹو کے ہم عصر فارسی افسانہ نگاروں کے فن پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں کافی اہم مضامین یکجا کیے گئے ہیں جن سے بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ مضامین یکجا کرکے پروفیسر صالحہ رشید نے اردو اور فارسی ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

سلطانہ چاند بی بی۔احمد نگر (1547-1600) حیات اور کارنامے

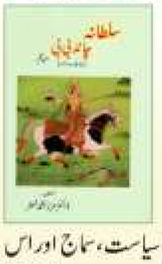

مصنف: مرزا محمد خضر

صفحات: 158، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ساگر پرنٹرس، انگوری باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

مبصر: مصطفیٰ ندیم خان غوری، بی-11، گرین ویلی،

روضہ باغ اورنگ آباد۔ 431001 (مہاراشٹر)

ڈاکٹر مرزا محمد خضر صاحب کی نئی تحقیق 'سلطانہ چاند بی بی' سیاست، سماج اور اس میں عورت کے کردار اور زندگی کے کئی حقائق کو مختلف زاویوں سے مثبت انداز میں پیش کرتی ہے کہ زندگی کے بدلتے حالات کے پیش نظر کس طرح عورت ان حالات کا جرأت و ہمت سے مقابلہ کرتے ہوئے، ان تمام مصائب سے نبرد آزما ہوتے ہوئے خاندان اور ریاست کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اس کتاب میں سلطانہ چاند بی بی کے کردار، کارنامے اور دیگر حالات کا تاریخی نظریے سے جو تجزیہ کیا گیا ہے وہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عزیز امبیکر صاحب کہتے ہیں کہ "اس کتاب کا اپنا ایک مقام اور مرتبہ ہے، اگر یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ جس نے اس عنوان سے کوئی کتاب نہ پڑھی ہو تو اس کتاب کو پڑھ کر اسے 'سلطانہ چاند بی بی' کا مکمل تعارف حاصل ہوجاتا ہے۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے جامع اور مکمل ہے۔"

تاریخ عالم میں اور خصوصاً تاریخ ہند میں جن اولوالعزم شہزادیوں نے اپنے اعلیٰ اوصاف و غیر معمولی قابلیت سے سیاست میں تاریخ ساز کردار سے درخشاں و بلند مقام حاصل کیا ان میں رضیہ سلطانہ (1236-1240)، نورجہاں (1611-1627)، حضرت محل (1857) اور سلطانہ چاند بی بی (1547-1600)، وہ ہستیاں ہیں جو اپنے کارہائے نمایاں کی بنا پر طبقۂ اناث کی گل سرسبد بن گئیں۔ ان کی کارکردگی تمام خواتین کے لیے مشعل راہ حیات ہے۔

خضر صاحب اردو ادب کی ایک معروف شخصیت ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اسی لیے ادبی حلقوں میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ یہ مصنف کی تازہ ترین تصنیف ہے جو 2021 میں منظر عام پر آئی ہے۔

اس کی ترتیب میں اولاً مصنف کی جانب سے اظہار تشکر کیا گیا ہے۔ پھر دو پیش لفظ ہیں۔ ایک مقدمہ اور کتاب کے بارے میں رائے ہے۔ یہ کتاب دس ابواب اور کوئی 19 ترتیبی نکات پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ماخذ کی تفصیل دی گئی ہے جو بیشتر فارسی زبان سے ترجمہ شدہ ہیں لیکن متن میں بھی بقدر ضرورت فارسی عبارتیں درج ہیں۔ دوسرے باب میں دکن اور احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت کے جغرافیائی حالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب سوم میں دکن کے سیاسی منظرنامہ پر بات کی گئی ہے جو دراصل چودہویں صدی عیسوی میں شمالی ہند میں آنے والی تبدیلیوں خصوصاً تغلق خاندان کی باہمی چپقلش کے پس منظر میں ردعمل کے طور پر دکن میں ظہور پذیر ہورہا تھا۔ باب چہارم (الف) میں چاند بی بی کے سلسلہ نسب پر نظر ڈالی گئی ہے اور پھر اسی باب کے حصہ (ب) میں بتایا گیا ہے کہ کیسے احمد نگر میں چاند بی بی کے آباواجداد نے ایک آزاد مملکت قائم کی۔ باب پنجم میں حسین نظام شاہ (چاند بی بی کے والد) کی مہمات کا ذکر ہے۔ اسی باب کے تسلسل میں چاند بی بی کے شجرۂ پدری ونسب کی تفصیلات درج ہیں۔ چاند بی بی کا سلسلہ مادری شاہان آذربائیجان سے جاملتا ہے جس کے مطابق ان کی والدہ خونزہ ہمایوں قرا یوسف کی پانچویں پشت میں تھیں۔

باب ششم میں چاند بی بی کی شادی علی عادل والی بیجاپور اور اس کے بعد جنگ تالی کوٹہ کی تفصیلات درج ہیں۔ چاند بی بی اپنے والدین کے یہاں احمد نگر میں رہتے ہوئے پندرہ سال کی عمر کو پہنچنے تک عربی، فارسی کے ساتھ دینی علوم حاصل کرتی ہے اور مراٹھی زبان پر بھی عبور حاصل کرتی ہے۔ اس کے علاوہ گھڑسواری، فن حرب، شکار، پولو کھیلنے میں مہارت حاصل کرتی ہے۔ اس کی سہیلیاں مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھتی ہیں۔

ساتویں باب میں چاند بی بی کے 1580 میں بیوہ ہونے کے بعد امور سلطنت میں دلچسپی اور سیاسی دانشمندی کا ذکر ہے کہ کس طرح اس نے دربار کی سازشوں کا پامردی سے قلع قمع کیا جب کہ آٹھویں باب میں درج ہے کہ بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ کی کمسنی میں چاند بی بی نے اس کی اتالیق کے بطور امور سلطنت اور خود کم سن بادشاہ کی تعلیم وتربیت کی جانب خصوصی توجہ دی۔

باب 10 میں سلطانہ چاند بی بی کے اوصاف حمیدہ کے تعلق سے بات کی گئی ہے۔ اس نے اپنی تمام تر زندگی بیجاپور اور احمد نگر کے استحکام میں صرف کردی اور مرتے دم تک احمد نگر کی مدافعت کرتی رہی۔ کتاب کے آخری حصے میں اس کی موت کے تعلق سے کچھ افسانوی اندازے قائم کیے گئے ہیں جن سے آنکھیں پرنم ہوجاتی ہیں لیکن تمام تر تفصیلات کی روشنی میں اس کی جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ اس اعتماد کی غماز ہے کہ وہ سینہ سپر ہوکر موت کو گلے تو لگا سکتی تھی لیکن بزدلوں کی طرح خودکشی سے متعلق اسے گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا۔

ان تمام واقعات کو کوئی 22 رنگین تصاویر، چار برمحل نقشہ جات اور ایک عکسی کتاب سے تقویت دی گئی ہے۔ مصنف کو زبان وبیان اور پیشکش پر بے پناہ قدرت حاصل ہے کہ ایک بار قاری مطالعہ شروع کرے تو آخر تک اس میں کھویا رہے۔

فکشن

مانسون اسٹور

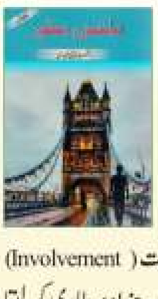

مصنف: رخشندہ روحی مہدی

صفحات: 168، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: صبا اسعد، 1502/Tower 7، سپریم ٹاور

سپریم کورٹ لائرسوسائٹی، سیکٹر 99، نوئیڈا 201301

ایک افسانہ نگار جس کردار کو بھی لکھ رہا ہوتا ہے اس میں اس کی شمولیت (Involvement) اس درجہ ہوتی ہے کہ وہ افسانہ نگار اس کردار کو جیتا ہے اور اپنے اوپر طاری کر لیتا

ہے۔ پھر کہانی کے کینوس پر ایک زندہ جاوید کردار نظر آتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ایک افسانہ نگار کتنا حساس ہوتا ہے وہ سماجی ناانصافی کے کرب کو دل میں سمولیتا ہے اور پھر ایک افسانے کی تخلیق کرتا ہے۔ اور خاتون افسانہ نگاروں کے یہاں نسائی احساسات اور نسائی زندگی کی محرومیوں کا کرب ان کے افسانوی کرداروں میں صاف نظر آتا ہے۔ افسانوی مجموعہ 'مانسون اسٹور' جو سولہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں زندگی کے ہزاروں پہلوؤں کو افسانہ نگار نے افسانوی کینوس پر اتارا ہے۔ اس مجموعہ کی سب سے اہم بات اور پہلی بات یہ ہے کہ زیادہ تر افسانوں کے عنوان شاعرانہ ہیں جو کسی شعر سے ماخوذ ہیں۔ مثال طور پر (1) ہم سخن تیری خاموشی ہے۔ (2) یہ آزمائش صبر گریز پا کب تک (3) خشت جاں رکھی کس نے (4) دل کے دریدہ دامن میں (5) کتنے جھوٹے تھے ہم محبت میں (6) وقت اچھا بھی آئے گا وغیرہ۔ افسانوں کے شاعرانہ عنوان افسانہ نگار کے ادبی شعور کی ضمانت ہیں۔

افسانہ نگار کا شاعری سے گہرا تعلق ضرور ہے کیونکہ پہلے افسانوی مجموعہ کا نام 'گمرا ک شاخ نہال غم'۔ اور بہت سارے افسانوں کے عناوین بہت خوبصورت مصرعے ہیں۔ عقدہ یہ کھلا کہ آپ کے والد محروں نیازی دیوبندی اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے اور ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی کے تایا محترم جمیل مہدی دیوبند سے ایک اخبار 'مرکز' نکالتے تھے جو ہفتہ میں دوبار نکلتا تھا مزے کی بات یہ ہے کہ Archive سے 14 مارچ 1962 کا ایک شمارہ فراہم کیا تو بہت تعجب ہوا کہ اسکے ایڈیٹوریل کا عنوان بھی شعر سے ماخوذ تھا 'نصیب دشمناں کب تک''۔

مختصر یہ کہ مانسون اسٹور کی افسانہ نگار ورجینا وولف کی طرح انسانی حقوق کی علمبردار نظر آتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی کہانیوں کی طرح وسیع کینوس اور کرداروں میں وسیع النظری' عنوانات میں شاعرانہ لہجہ' عصمت چغتائی کی سی صاف گوئی اور واجدہ تبسم کی طرح علاقائی اسلوب ان کے افسانوں کو منفرد بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی نے مانسون اسٹور کے افسانوں میں بہت ہی خوبصورت انداز میں منظر کشی کی ہے۔ کہیں کہیں تو مکانات کے نمبر کے ساتھ کالونی کا پورا پتہ بھی افسانے میں شامل ہے۔ افسانہ 'یہ خشت جاں رکھی کس نے' کی منظر کشی دیکھیے۔

''مثال کے طور پر ان کے جانے کے ایک ہفتہ بعد سفید لفافہ کھولنے کی ہمت پیدا ہوئی مجھ میں، نظام الدین ایسٹ کی۔ اے۔ 221 نمبر ان کی بڑی سی کوٹھی اب میرے نام ہوگئی تھی''

مانسون اسٹور میں جس کہانی کے عنوان کو افسانوی مجموعہ کا عنوان بنایا ہے اس میں لندن کے مناظر کی دل کشی کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے ''ابھی بیکر اسٹریٹ پر میری ٹیکسی کے سامنے پیڈسٹرین کراسنگ پر سڑک پار کرتے ہوئے اس نے مجھے دیکھ لیا''

''چیرنگ کراس ٹیوب اسٹیشن تک میں جاتی ہوں۔ وہاں سے بس یا کار سے گھر چلی جاتی ہوں۔ میرا گھر لندن ویسٹ میں واقع ایک مضافاتی علاقہ ساؤتھ ہال میں ہے۔''

افسانوں میں کردار کی ضرورت کے مطابق سفر میں استعمال ہونے والے وسایل جیسے ہوائی جہاز' ٹیوب' (لندن کی میٹرو ٹرین کو کہتے ہیں) بس' ریل گاڑی' ٹیکسی' کار مرسیڈیز' ہونڈا موٹر بایک' بیٹری رکشا وغیرہ کا وقتاً فوقتاً حسب موقع خوب استعمال کیا گیا ہے۔

افسانہ 'بڑا آدمی' اور 'پپی مدرس ڈے' بے حد جذباتی اور حقیقت سے قریب تر افسانے ہیں۔ پپی مدرس ڈے میں بزرگوں کے ساتھ نئی نسل کے سرد رویہ پر گہری چوٹ کی گئی ہے۔ 'بڑا آدمی' زمیندار گھرانوں کی بے بسی بے کسی کے ساتھ بڑے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی جدوجہد کی کہانی ہے۔

اس افسانوی مجموعہ کا آخری افسانہ 'مانسون اسٹور' میرے خیال سے بڑا افسانہ ہے بہت گیرائی و گہرائی سے ایک ایک لفظ، ایک ایک سطر پروئی گئی ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد کافی دیر تک دماغ اس کی گرفت میں رہتا ہے۔ بہت سے مکالمے دل پر نقش سے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً: ''عورتیں بہادر ہوتی ہیں، جب ہی تو ماں ہوتی ہیں''

''سینۂ عشاق پر معشوق کی دیدہ دلیری''، ''محبت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے کہ اسے تائید تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے۔''

سرورق دیدہ زیب اور طباعت خوب ہے۔ فلیپ پر قارئین کی رائے نے مجموعے کو اور بھی رونق بخشی ہے۔

شاعری

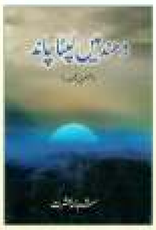

دھند میں لپٹا چاند

شاعرہ: شبانہ عشرت

صفحات: 124، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد ضیاء الدین، گلزار باغ، پٹنہ 80007 (بہار)

ایک دور تھا جب ادب و شاعری کی دنیا میں عورت کے نام کیا، اُس کی آواز کا بھی پردہ ہوتا تھا، پھر وقت نے کروٹ لی اور افکار و معاشرے میں تبدیلیاں آئیں، یہاں تک کہ فکشن اور شاعری کے قصر میں نسائی آواز گونجی ہی نہیں بلکہ نسائی لب و لہجہ دور ہی سے پہچانا جانے لگا اور اسے یقیناً ایک خوش آئند انقلاب کہا جائے گا کہ ملک اور بیرون ملک کے دوسرے حصوں اور علاقوں کی طرح، آج اکیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں بہار کے حوالے سے بھی تانیثی شاعری کا سفر نہایت تیز گام دکھائی دے رہا ہے۔

اس کی ایک تازہ اور شگفتہ مثال محترمہ شبانہ عشرت کا پیش نظر شعری مجموعہ 'دھند میں لپٹا چاند' ہے، کہنے کو یہ اُن کا پہلا مجموعہ ہے، لیکن مجموعی اعتبار سے یہ اپنے مستقبل کی بشارت اور ضمانت دینے میں یقیناً کامیاب ہے۔ شاعرہ نے تو اسے از راہِ انکسار اپنے 'جذبات کی ٹوٹی پھوٹی لکیریں' کہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں کے لفظوں میں اگر یہ غلط نہیں کہ ''فن کوئی بھی ہو، ادب یا آرٹ وہ فنکار سے دل کا اجالا مانگتا ہے کیونکہ فن کار کی کوئی بھی تخلیق اس کے دل کی کیفیات و جذبات کی عکاس ہوتی ہے۔''

تو پھر کہنا چاہیے کہ یہ مجموعہ اس کی بہترین مثال ہے اور یہ کہ شبانہ عشرت کی شاعری نے کہیں بھی نہ تو ان کے نظریہ کو شرمندہ ہونے دیا ہے اور نہ ہی اُن تجزیاتی تاثرات کو عموماً سوالیہ دائرے میں آنے دیا ہے جو مختلف عنوان سے اس کتاب کے شروعاتی اوراق کی زینت بنے ہیں۔

'دھند میں لپٹا چاند' کے شعری متن کا آغاز صفحہ 33 سے ہوتا ہے اور صفحہ آخر تک پہنچتا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ فہرست کے لیے لفظ 'سلاسل' کا استعمال زنجیروں سے نسبت کے سبب ترتیب و توضیح سے دور لے جاتا اور آزادی اور کوملتا کے تصور کو ٹھیس پہنچتا ہے، لیکن اس میں دو رائے نہیں کہ اس اندراج کے بموجب جب ہم بانوے غزلوں کی سوغات سے ہم کنار ہوتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہاں تانیثی شناخت کے ساتھ موضوعات و مضامین کا ایسا نگار خانہ سجا دیا گیا ہے جو نسل نو کی شاعرات کے یہاں بہت کم ہی ملتا ہے۔ ممکن ہے 'دھند میں لپٹا چاند' کی شاعری کہیں نحویاتی یا عروضی اسقام سے دوچار ہوگئی ہو یا اس کا عنصر حسن سے خالی رہ گیا ہو، لیکن بحیثیت مجموعی۔

مسلک ہے مرا مہر و وفا عشق و محبت
دل دار کسی دل کو دُکھایا نہیں کرتے

اس چاند کا چہرہ بھی اُداسی میں ہے ڈوبا
تاروں کا چمکنا مجھے اچھا نہیں لگتا

جیسے اشعار بہر صورت شاعرہ کے مسلک سخن، اس کے کلام میں استعارے کے نظام اور اس کی انقلابی فکر اور جرأت اظہار کو پوری طرح آئینہ کر دیتے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ 'دھند میں لپٹا چاند' کے اوراق بتا رہے ہیں کہ اس کی شاعرہ حسن سیرت کی خواہاں اور احساسات و جذبات کے موثر اظہار کی شاعرہ ہے جسے دردمندی وراثت میں ملی ہے اور جو مذہبی تہذیب و مزاج کے حوالے سے عصری برگشتگی کے ہمہ صورت مقابلے کا حوصلہ رکھتی ہے، اسے رضائے الٰہی کی تاثیر کا یقین ہے، وہ قناعت کی تمنائی وطلب گار ہے اور بسا اوقات نہایت کامیابی سے دعائیہ انداز میں اس نے کرب دروں کا نقشہ دکھا دیا ہے۔

دل میں سمٹا ہے مرے پیاس کا صحرا کوئی　　اے خدا بھیج ذرا ابر کا ٹکڑا کوئی

ہم سازش دنیا میں گرفتار مسافر　　جاں دیتے ہیں ایمان کا سودا نہیں کرتے

زیر نظر مجموعہ میں مرور ایام کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے، لذت اضطراب، کرب حیات، خودستائی، باہمی کیفیات اور غرور حسن کا اظہار بھی۔ یہاں شاعرہ نے اپنوں کی بے وفائی، گناہ بے گناہی کی سزا، خیال محبوب کے اثر و نفوذ، جذبات پنہاں کے اظہار، بے عقلی کے کام سے انتباہ، بروقت اقدام سے چوک جانے والوں کی شکایت، الجھن، بے یقینی و یاسیت کی عکاسی، عروج و زوال کے فلسفہ اور عصری سیاست جیسے موضوعات و مضامین ہی جا بجا نظم نہیں کیے ہیں، بلکہ زمانے کی سفاکی، محبوب کی ترش مزاجی، عصری بے بسی اور نسوانیت دشمن تہذیب کے کرب کا اظہار بھی بڑی ہنرمندی سے کیا ہے۔

میری پہچان چھینی جا رہی ہے　　نئے پیکر میں ڈھالا جا رہا ہے

بھلے ہی زندگی وہ میری لیتے　　مرا ایماں خریدا جا رہا ہے

حقیقت یہ ہے کہ اس مجموعہ کی غزلوں میں یوں تو زندگی و زمانے کے دکھ درد، صبر و ضبط دروں، یاسیت و مظلومیت، شکوۂ بے اعتنائی، لذت اضطراب، عنایات زندگی کے اعتراف، اضطراب و بے بسی، مذہبیت و وطنیت، جذبۂ معصوم، اظہار فرقت، موت کی یاد، انتظار، تاثیر عشق، آرزو کی نفسیات، ماضی و حال کے تقابل، خوش خوابی، فنا و بقا، چاہت کے انجام اور از یں قبیل نہ جانے کتنے ہی رنگا رنگ موضوعات آئے ہیں اور شاعرہ نے اپنی فنی و فکری پختگی سے ایک رنگ کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھنے والی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

شبانہ عشرت کا یہ مجموعہ اپنی کیفیات کے اعتبار سے منفرد انداز رکھتا ہے اور امید قوی ہے کہ 'دھند میں لپٹا چاند' نہ صرف اہل ذوق کی توجہ حاصل کرے گا بلکہ آنے والے دور میں بھی بہار کے حوالے سے تانیثی شاعری کا ذکر کرنے والے ادبی مؤرخین اور ناقدین اس کتاب کا حوالہ دینا ضروری تصور کریں گے۔

مضامین

آتی ہے ان کی یاد

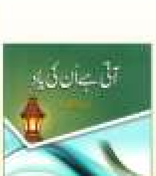

مصنف: انوار الحسن وسطوی

صفحات: 288، قیمت: 176 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر جسیم الدین، S-17/4، فرسٹ فلور، جوگا بائی ایکسٹینشن جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

'آتی ہے ان کی یاد' انوار الحسن وسطوی کے اکیاون مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام مضامین مختلف شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔ جن شخصیات پر یہ مضامین قلمبند کیے گئے ہیں ان میں مشہور زمانہ شخصیات کے علاوہ وہ خادمین زبان و ادب بھی شامل ہیں، جو اپنی بیش قیمت علمی و ادبی خدمات کے باوجود گمنامی کی زندگی بسر کر کے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انوار الحسن وسطوی صاحب نے اس کتاب میں ان حضرات کو بھی اپنا موضوع بنایا، جن کے علم و ادب، شعر و سخن سے عام لوگ ناواقف تھے۔ وسطوی صاحب کا رشتہ قرطاس و قلم سے بہت قدیم ہے، ان کے قلم سے اب تک نصف درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آ کر شرف قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے لکھنے کا عمل چار دہائیوں پر مشتمل ہے، وہ لکھ رہے ہیں اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔ انھیں متعدد ادبی اعزازات بھی حاصل ہوئے ہیں اور کئی عہدوں پر بھی مامور رہے ہیں۔

آئے دن قومی و مقامی اخبارات و رسائل میں ان کے علمی و ادبی مضامین بکثرت شائع ہوتے رہتے ہیں، اس لیے علمی و ادبی حلقوں میں وہ متعارف ہیں۔ جن شخصیات پر انھوں نے اظہار خیال کیا ہے، ان میں سے بیشتر سے ان کی راست ملاقات رہی ہے اور بعض وہ ہستیاں بھی ان کی قلمی جولانگاہ میں شامل ہیں، جن سے ہر کس و ناکس واقف ہے، لیکن ہر مصنف کا اپنا علاحدہ وژن ہوتا ہے۔ شخصیت کو پہچاننے اور ان پر اظہار خیال کا اسلوب و انداز جداگانہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مشہور شخصیات پر لکھنے لکھانے کا تسلسل ہنوز جاری ہے۔ انوار الحسن وسطوی نے مقدمہ میں جو وجہ تصنیف بتائی ہے، وہ بھی دلچسپ ہے، وہ لکھتے ہیں: ''آتی ہے ان کی یاد' ان اکیاون مرحومین شخصیتوں کی یادیں ہیں، جن سے یا تو مجھے عقیدت رہی ہے یا جنھوں نے اپنی شخصیت سے مجھے متاثر کیا ہے، اس کتاب میں چند ایسی عظیم شخصیتوں کا بھی تذکرہ ہے، جنھیں میں نے دیکھا نہیں، لیکن ان کی شخصیت کا مطالعہ کیا ہے، ان شخصیتوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا مظہر الحق، ڈاکٹر مغفور احمد اعجازی اور مولانا شفیع داؤدی وغیرہ کے نام شامل ہیں'۔

انوار الحسن وسطوی نے دیدہ شخصیت کی منظر کشی کرتے وقت ان اصول و آداب کی بھی پاسداری کی ہے، جو خاکہ نگاری کے لیے ضروری ہیں، خاکہ نگاری جسے شخصیت نگاری کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ہر عہد، ہر ملک اور ہر زبان میں اس کے نمونے اور نقوش ملتے ہیں۔ زندگی اور زمانے کے بدلتے ہوئے مزاج و میلان، نشیب و فراز ڈوبتی ابھرتی انسانی زندگی کے تمام رنگ و روپ خاکہ نگاری میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے ہیں معاملہ معاشرتی و سماجی ہو، علمی و ادبی ہو یا سیاسی، بڑی شخصیت ہو یا معمولی، عالم ہو یا جاہل، حکمراں ہو یا سماج کا ایک ادنیٰ انسان، مصنف کسی سے بھی متاثر ہو سکتا ہے اور کسی بھی شخصیت کو موضوع تحریر بنا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ خاکہ نگاری ایک بے حد نازک فن ہے۔ یہاں قلم پر بے پناہ گرفت کے ساتھ ساتھ جرأت اور سلیقہ مندی بھی درکار ہے۔ تھوڑی سی لاپروائی اور کوتاہی خاکہ کو مجروح کر دیتی ہے۔ اس میں ایک ایک پہلو اور گوشے کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوتا ہے۔ اس لیے دنیا کی مختلف زبانوں میں بے شمار خاکے لکھے گئے، مگر شاہکار کا درجہ کم ہی کے حصے میں آیا۔ انوار الحسن وسطوی کے بیشتر مضامین فن خاکہ نگاری کی ترجمانی کرتے ہیں۔

پیش نظر کتاب میں مصنف نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے، وہ سبھی شخصیات اپنے اپنے میدانوں میں اہم ہیں۔ صاحب کتاب نے اپنے ان مضامین میں بہت سی ایسی اہم معلومات پیش کی ہیں جو دوسری کتابوں میں شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ اس اعتبار سے یہ کتاب غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ اگرچہ مضامین مختصر ہیں لیکن صاحب کتاب نے ان میں شخصیت کے متعدد پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور اس بات کی بھی کہ ہر مضمون زیادہ سے زیادہ معلوماتی بن جائے۔ بعض مضامین تو بہت ہی معلوماتی ہیں کہ ان سے بھرپور استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کو متعدد شخصیات کے تعارفی مضامین کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت معیاری ہے۔ البتہ ایک چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے کہ مصنف نے نہ حوالے دیے ہیں اور نہ ہی ماخذ و مصادر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر ان چیزوں کا بھی کتاب میں لحاظ کیا جاتا تو کتاب اور بھی زیادہ اہم اور مستند ہو جاتی۔

رسائل و جرائد

ریختہ روزن

ایڈیٹر: ہما خلیل
صفحات: 224، قیمت فی شمارہ: 250 روپے، جولائی-ستمبر 2021
رابطہ: ریختہ فاؤنڈیشن، B-37، سیکٹر 1، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)
مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی۔ 25

کیا عصر حاضر میں کسی ادبی رسالے کی ضرورت ہے؟

یہ سوال ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ہے۔ ان کے پیش کردہ تیرہ نکات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آج کے عہد میں اردو کے ادبی رسائل کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے مطابق * معاشرے کو ادبی مباحث نہیں، سائنسی علوم کی ضرورت ہے * غیر ادبی ماحول میں ادبی رسالہ نکالنا غیر دانش مندانہ فعل ہے * ادبی رسائل متحرک نہیں منجمد ہوتے ہیں، جن کا عملی زندگی میں کوئی فائدہ نہیں * یہ رسائل ذاتی مفادات اور تشہیر کے لیے نکالے جاتے ہیں، یہ ادب کا فروغ نہیں ترقی ذات اور درجات کا ذریعہ ہیں * مقالات سطحی، تخلیقات غیر معیاری اور شاعری اوزان و بحور سے عاری ہوتی ہے * رسائل کسی طرز احساس کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتے ہیں * زیادہ تر رسالے تجارتی مقاصد کے لیے نکالے جاتے ہیں * اس سے ادیب کو عروج حاصل ہوتا ہے اور ادب زوال پذیر ہوتا ہے * ہر رسالے کا اپنا ایک خاص گروپ اور حلقۂ اثر ہے * ادبی رسائل میں حیا سوز مواد شائع ہوتا ہے * ان رسائل کا اسلوب بیان بھی متعین نہیں اور نہ ہی یہ قارئین کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کر پا رہے ہیں۔

یہ سوال اہم ہو یا غیر اہم مگر مدیران اور مالکان مجلات کے پاس اس کا تشفی بخش جواب شاید ہی ہو۔ سہ ماہی 'ریختہ روزن' کو ان سوالات کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جائے تو دو تین نکات کے اطمینان بخش جوابات تو مل جاتے ہیں مگر مکمل نہیں۔ ریختہ کا ادبی منشور اور مقصد واضح ہے۔ سات سال کے عرصے میں ریختہ نے صرف اور صرف زبان و ادب کو فروغ دیا ہے۔ اس کا تجارت اور ترقی ذات سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس کے مالک سنجیو صراف ہیں جن کا اردو زبان و ادب سے کوئی مفاد یا منفعت وابستہ نہیں ہے۔ انھوں نے یہ رسالہ اس لیے شائع کیا ہے تاکہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اردو کے شیدائیوں کو مربوط کیا جائے اور ادب کے مکمل جہان سے آشنائی کی کوئی بہتر صورت نکل سکے۔

سہ ماہی 'ریختہ روزن' کا پہلا شمارہ 24 زمروں/شقوں میں منقسم ہے۔ ہر شق/زمرہ ادبی لحاظ سے معنویت، اہمیت، ارزش اور افادیت کا حامل ہے۔ اداریہ، خراج عقیدت، اردو کی کہانی شاعر کی زبانی، کہانیاں نئی پرانی، غزلیں، اردو کی گنگا جمنی تہذیب، میزان، طنز و مزاح، نظمیں، یاد رفتگاں، آپ کی زبان سے ہماری زبان تک (ترجمہ)، قلم کے زاویے (خاکے)، آئینۂ دل، کیا کہا آپ نے (ماضی کے دریچے سے)، خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں، فی الوقت، نامہ بر، دلچسپ قصے، سوچیے (کوئز)، حلقۂ زنجیر (ضبط شدہ ادب)، نئے اور پرانے اوراق (تبصرے)، پیکر (تصاویر) فی الحال ریختہ میں، آپ کی رائے — ان دائروں میں 'ریختہ روزن' کی تقسیم و ترتیب سے رسالے کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے بیشتر مشمولات مفید، معلوماتی اور معیاری ہیں اور مدیر ہما خلیل کے ادارتی جوہر اور حسن انتخاب کا مظہر بھی۔ ریختہ روزن میں وہ پرانی تخلیقات بھی شائع کی گئی ہیں جو رسائل کے صفحات میں مدفون ہیں۔ وہ زندہ تحریریں جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ہیں انھیں ریختہ روزن نے پھر سے نئی زندگی دی ہے اور نئی نگارشات شامل کرکے امکانات کے نئے دریچے بھی وا کیے ہیں تاکہ جدید و قدیم اردو زبان و ادب کا متنوع اور وسیع تر منظرنامہ ہمارے سامنے آسکے۔ مکمل ادبی جہان کی سیر و سیاحت تو مختصر صفحات میں ممکن نہیں ہے لیکن ریختہ نے مکمل ادبی جہان سے روبرو کرانے کا ایک خوبصورت تجربہ کیا ہے اور ایسی تخلیقات ریختہ روزن میں شامل کی ہیں جن سے ہمیں نئے اور پرانے ادبی رویے اور رجحانات سے بھی آگہی ہو اور نئے اور پرانے قلم کاروں سے بھی ہم اپنا ذہنی رشتہ قائم کرسکیں۔ بعض تحریریں تو یقینی طور پر ایسی ہیں جن کی قارئین کو اکثر تلاش رہتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ریختہ کے پاس ادب کا بیش بہا سرمایہ موجود ہے اس لیے ایسی تحریروں کی تلاش میں انھیں دشواری پیش نہیں آتی۔ ریختہ روزن کی یہ کوشش قابل ستائش ہے کہ ادب کے ان ناموں کو بھی پھر سے ذہنوں میں زندہ کردیا ہے جنھیں ہم فراموش کرتے جارہے ہیں۔ خاص طور پر جارج پیش شور، منشی جوالا پرشاد برق، عبدالغفور شہباز، آغا صادق، ست پرکاش شوق اور بہت سے نام ہیں جنھیں ادبی معاشرے نے تقریباً بھلا دیا ہے۔ ریختہ روزن نے ان کی تحریروں کو نئی زندگی اور تابندگی عطا کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ قابل قدر ہے۔ ضبط شدہ ادب بھی ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس زمرے میں سجاد ظہیر، سعادت حسن منٹو، خلیل الرحمن اعظمی کی تحریروں کو پڑھنے سے ہمیں ادب کی مقصدیت اور اردو میں مزاحمتی ادب کی ایک مضبوط روایت کا پتہ چلتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو 'ریختہ روزن' کا یہ تجربہ منجمد ادبی معاشرے کو متحرک کرنے میں یقیناً کامیاب ہوگا۔ اس نوع کے تجربے ہمیں ایک نئے جہان اور ایک نئے جزیرے کی سیر کرانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ہمیں تجربوں سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی تجربوں کو مسترد کرنا چاہیے کیونکہ یہی تجربے ہمیں ایک نقش راہ اور مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ریختہ روزن کا یہ پہلا نقش ہے۔ آگے چل کر ان تجربوں میں اور توسیع ہوگی اور یقینی طور پر تجرباتی توسیع کا یہ سلسلہ ادبی معاشرے کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔ مشمولات کے عنوانات خوبصورت ہیں مگر کچھ عنوانات کو خوب سے خوب تر کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ پرانی تحریروں کا انتخاب بھی عمدہ ہے مگر ان تحریروں کے حوالے سے قلمکاروں کے سوانحی کوائف اور مشمولہ تخلیق پر مختصر تجزیاتی نوٹ کی شمولیت سے ان تحریروں کی اہمیت اور افادیت بڑھ جائے گی کیونکہ آج کی نسل بہت سے پرانی ادبی شخصیات سے مکمل طور پر واقف نہیں ہے۔ ریختہ روزن میں موضوعاتی زمین کو اور وسعت دیے جانے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر وہ موضوعات اور مضامین جن سے ہمارے ادبی معاشرے کو ایک نئی روشنی، ایک نئی راہ ملے۔ ماضی کے رسائل میں بہت قیمتی خزانے مدفون ہیں، خاص طور پر عبدالحلیم شرر کے 'دلگداز' میں کچھ ایسے سلسلے ہیں جن کی بازیافت کی جائے تو یقینی طور پر یہ بہت اہم کام ہوگا۔ ریختہ کے پاس نایاب و نادر کتب کے علاوہ اہم ادبی رسائل کا وافر خزانہ موجود ہے اس لیے ریختہ کو اہم موضوعات کی تلاش میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔

ریختہ روزن کے مشمولات اتنے اہم ہیں کہ تفصیلی گفتگو کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصراً یہ ہے کہ ریختہ نے ایک اچھا قدم اٹھایا ہے۔ اس قدم کی ستائش کی جانی چاہیے۔ 'ریختہ روزن' کی خوبصورت اشاعت کے لیے سنجیو صراف اور ہما خلیل کے ساتھ ساتھ رسالے کے سرپرست: پروفیسر گوپی چند نارنگ، ذکیہ مشہدی، سید شاہد مہدی اور اردو ہندی کی مجلس ادارت میں شامل تمام افراد مبارکباد کے مستحق ہیں۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

اردو مرثیے کی ادبی وثقافتی روایت' کے زیرعنوان آن لائن مذاکرہ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیراہتمام 'اردو مرثیے کی ادبی وثقافتی روایت' کے عنوان سے آن لائن مذاکرہ منعقد کیا گیا جس میں متعدد مشاہیر دانشوران نے شرکت کی اور مرثیے کی ادبی وثقافتی روایت پر اظہار خیال کیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے تعارفی کلمات پیش کرنے کے بعد کہا کہ اردو کی شعری

اصناف میں 'مرثیے' کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ یہ آج بھی زندہ ہے، جب کہ کئی اہم اصناف مردہ ہوچکی ہیں یا آخری سانسیں لے رہی ہیں، مگر مرثیہ کے کل بھی چرچے تھے اور آج بھی وہ زندہ وتابندہ ہے۔

شیخ عقیل نے مرثیے کی اصل اور روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگرچہ مرثیہ اپنے عمومی معنی میں ہر اس شخصیت پر کہا جاسکتا ہے جو اس دنیا کو الوداع کہہ گئی ہو، تاہم جو مرثیے دوسری شخصیات پر کہے گئے، انھیں 'شخصی مرثیہ' کا نام دیا گیا ہے اور اصطلاحی معنوں میں مرثیے کا اطلاق ان افراد کے لیے کہی جانے والی نظموں پر ہوتا ہے جو امام حسینؓ، اہل بیت یا ان حضرات کے لیے کہے گئے ہوں جو میدان کربلا میں شہید ہوئے۔ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مرثیے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ یہ اردو کی ادبی وثقافتی روایت کا مضبوط حصہ ہے اور اس کے ذریعے اردو زبان و ادب کو غیر معمولی تقویت حاصل ہوئی ہے۔ آج بھی مرثیہ اردو شاعری کو مضبوطی بخش رہا ہے اور اس کے ذریعے اردو پوری دنیا میں پھیل رہی ہے، اسی وجہ سے قومی اردو کونسل کے زیراہتمام آج کا یہ آن لائن مذاکرہ منعقد کیا گیا ہے، جس میں مرثیہ سے فنی، عملی، تنقیدی وتحقیقی تعلق رکھنے والے ماہرین شریک ہیں۔ ہم ان سب کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں۔

پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرثیے کے مختلف پہلوؤں پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر اس کی ادبی وثقافتی روایت پر اب تک سیر حاصل گفتگو نہیں ہوئی ہے۔ قومی اردو کونسل اور شیخ عقیل احمد لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس پہلو پر مذاکرے کا اہتمام کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے تشکیلی دور سے ہی مرثیہ اردو کی ادبی وتہذیبی روایت سے وابستہ رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو مرثیے میں ادبی روایت فارسی مرثیوں سے آئی اور ایک طویل سفر کرتے ہوئے مرثیہ موجودہ شکل تک پہنچا ہے۔ اردو میں خصوصاً سودا نے مرثیے میں اتنے تجربات کیے جتنے ان کے پہلے اور بعد کے شعرا نے نہیں کیے، پھر میر انیس تک پہنچتے پہنچتے مرثیہ اتنا ثروت مند ہوگیا کہ آج اس صنف کے مقابلے میں کوئی شعری صنف نظر نہیں آتی۔

ممتاز دانشور ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے کہا کہ مجھے مرثیے کے فن اور تاریخ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں، مگر ہماری خاندانی روایت میں مرثیہ خوانی شامل ہے اور سیدین منزل میں ہم پابندی سے ہر سال مرثیہ خوانی کی مجلس منعقد کرتے ہیں۔ انھوں نے میر انیس کے مرثیوں سے ابھرنے والی خواتین کی تصویر پر خصوصی گفتگو کی اور مسلم معاشرے میں خواتین کے کردار پر روشنی ڈالی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 2 ستمبر 2021

اردو قصائد میں ہندوستانی ثقافت کی شاندار عکاسی ملتی ہے: پروفیسر شیخ عقیل احمد

قومی اردو کونسل میں 'اردو قصائد کی ادبی اور ثقافتی روایت' پر مذاکرہ

نئی دہلی: اردو کی شعری اصناف میں قصیدے کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔ دکن اور شمالی ہندوستان میں ہمیں سیکڑوں ایسے اردو قصیدہ نگار نظر آتے ہیں جنھوں نے نہ صرف اس صنف کو وسعت دی بلکہ اردو کے شعری ادب کو بھی بلندیوں تک پہنچایا اور اپنے قصائد میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کی شاندار عکاسی بھی کی۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام

منعقدہ ورچوئل مذاکرہ بعنوان 'اردو قصائد کی ادبی اور ثقافتی روایت' میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ قصیدہ اردو کی بہت اہم صنف ہے جس میں ہر طرح کے موضوعات اور مضامین کو برتنے کی بھرپور گنجائش موجود ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہر شاعر قصیدے کے میدان میں طبع آزمائی کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا، آج بھلے ہی قصیدہ اپنی شان وشکوت کھو چکا ہے، تاہم اس کی کوکھ سے جنم لینے والی غزل کا دبدبہ اب بھی قائم ہے۔

پروفیسر عبدالحق نے شمالی ہندوستان میں قصیدے کی روایت کے حوالے سے کہا کہ شمالی ہند میں قصیدے کی روایت کو آگے بڑھانے میں ولی کا اہم کردار ہے۔ انھوں نے بہترین قصیدے کہے۔ ولی کے بعد سودا نے اردو قصیدے کو آسمان پر پہنچا دیا۔ اردو میں سودا سے بڑا کوئی قصیدہ نگار پیدا نہ ہو سکا۔ انھوں نے قصیدے میں ہندوستانی تہذیب وثقافت پر گفتگو کرتے ہوئے اردو قصیدے کے ثقافتی مطالعہ پر خصوصی توجہ دلائی۔ اس موقع پر پروفیسر عتیق اللہ نے قصیدے کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی اور تنقیدی بحث کی۔ انھوں نے کہا کہ قصیدے کو 'ام الاصناف' کی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ قصیدے کے اسالیب ہمیں دوسری اصناف میں بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج ہمیں قصیدے کے کینن کے حوالے سے غور وفکر کرنے اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر نسیم الدین فریس نے اپنے خطاب میں دکن میں اردو قصیدے کی روایت کا جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی زیادہ تر اصناف کا آغاز دکن میں ہوا ہے۔ جہاں تک اردو قصیدے کی بات ہے تو اس صنف کی ابتدا بہمنی دور میں ہوئی، اس کے بعد عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں کئی اہم شاعر قصیدے کی طرف متوجہ ہوئے اور عمدہ قصیدے کہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کے شعرا کے پیش نظر فارسی کے قصائد رہے ہیں۔ پروفیسر نسیم الدین فریس نے قصیدے کے زوال پر بھی روشنی ڈالی، اور انھوں نے قصیدے کے احیا کے حوالے سے کہا کہ قصیدہ آج بھی کہا جاسکتا ہے کیونکہ آج بھی موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ پروفیسر نسیم احمد نے سودا کی قصیدہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ سودا نہ ہوتے تو شاید اردو میں قصیدے کا ذکر بے سود ہو جاتا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ درباروں کا خاتمہ قصیدے کے زوال کا سبب نہیں ہے۔ کیونکہ اردو کے بہترین قصیدے نعتیہ اور منقبتی ہیں اور ان موضوعات پر آج بھی قصیدے کہے جاسکتے ہیں۔

مذاکرے کی نظامت کے فرائض پروفیسر احمد محفوظ نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) شمع کوثر یزدانی نے تمام مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام میں کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، انتخاب عالم (ریسرچ آفیسر) اور دیگر اسٹاف کے علاوہ سیکڑوں دانشوران واسکالرز آن لائن شریک رہے۔ افضل حسین خان (ریسرچ اسسٹنٹ) اور افروز عالم نے تکنیکی تعاون فراہم کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 ستمبر 2021

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی بطور ڈائرکٹر قومی کونسل کی مدت کار میں توسیع

نئی دهلی: مرکزی وزارت تعلیم نے ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی مدت کار بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے جو کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ ان کا دورانیہ 29 ستمبر 2021 کو ختم ہونا تھا، لیکن اس سے پہلے وزارت تعلیم نے این سی پی یو ایل میں ان کے بہتر کام کو دیکھتے ہوئے ان کی سروس میں توسیع کا نوٹی فکیشن جاری کیا ہے۔ انھیں تین سال کی مدت کے لیے 28 ستمبر 2018 کو اس عہدے پر تعینات کیا گیا تھا۔ این سی پی یو ایل کا بنیادی کام ملک بھر میں اردو زبان کی ترقی اور بہتری کے لیے کام کرنا ہے۔ این سی پی یو ایل مرکزی وزارت تعلیم کے تحت کام کرتا ہے اور اس کا بجٹ بھی وزارت ہی جاری کرتی ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اردو زبان کی ترقی اور بہتری کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ وہ ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کے کئی مضامین اور تحقیقی مقالے بین الاقوامی شہرت یافتہ رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حکومت ہند کے اردو زبان کی ترقی اور بہتری کے لیے قائم کیے گئے اس ادارے کے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد انھوں نے اردو زبان کو گاؤں، دیہات اور قصبوں تک پہنچانے کی جدوجہد شروع کی، جس میں کامیابی بھی ملی۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اردو زبان کی ترقی کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں اور اس کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اپنی تقرری سے قبل ڈاکٹر شیخ عقیل احمد ستیہ وتی کالج، دہلی میں لیکچرر تھے۔ یہاں بھی وہ اردو زبان کی ترقی، بہتری اور تدریسی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ حکومت اردو زبان کی ترقی اور بہتری کے لیے بہت کچھ کرنے کو تیار ہے۔ اس کے لیے کونسل کو جو بھی ضرورت ہو وہ پوری کی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو ذمے داری ان کو سونپی گئی ہے اور حکومت نے ان پر اعتماد کیا ہے اس کے لیے وہ حکومت ہند اور وزارت تعلیم کے بے حد شکر گزار ہیں اور وہ اپنے فرائض کو پوری ایمانداری سے انجام دیں گے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 19 اگست 2021

پروفیسر علی جاوید کی رحلت پر تعزیتی نشست

نئی دهلی: دہلی یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر علی جاوید کے انتقال پر کونسل کے صدر دفتر میں تعزیتی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ علی جاوید صاحب کی رحلت سے اردو دنیا کا بڑا خسارہ ہوا ہے، وہ ایک بہترین استاذ تھے، ساتھ ہی وہ بہت اچھے انسان بھی تھے۔ وہ ہمیشہ وضع داری نبھاتے اور ضرورت مندوں کی مدد میں پیش پیش رہتے تھے۔ خصوصا طالب علموں کی مدد کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ شیخ عقیل احمد نے کہا کہ پروفیسر علی جاوید نے کافی جدوجہد بھری زندگی گزاری۔ عملی زندگی میں وہ بیباک تھے اور اپنے موقف اور نظریے پر کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) کمل سنگھ نے کہا کہ علی جاوید صاحب کی رحلت ان کے اہل خانہ و متعلقین کے لیے دکھ کی گھڑی ہے، ہم ان کی آتما کی شانتی کے لیے دعا گو ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ جس زمانے میں انھیں ڈائرکٹر بنایا گیا وہ کونسل کے لیے آزمائش کے دن تھے مگر انھوں نے باہمی تعاون کے ساتھ آفس کے حق میں اچھا سے

اچھا کرنے کی کوشش کی۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) شمع کوثر یزدانی نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ علی جاوید صاحب بطور انسان بہت اچھے تھے اور اعلی انسانی اقدار کے حامل تھے۔ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ تعزیتی میٹنگ میں کونسل کا تمام عملہ موجود رہا اور مرحوم کی روح کی تسکین کے لیے دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 ستمبر 2021

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

فروغ اردو میں طب یونانی کا کردار انتہائی اہم: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دھلی: ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، نئی دہلی میں آیوش میڈیسن فار کووڈ 19 پروگرام کا افتتاح قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کیا۔ انھوں نے بطور مہمان خصوصی مذکورہ پروگرام کی پروقار تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ طب یونانی کا کردار فروغ اردو میں انتہائی اہم ہے اور طب یونانی کا بڑا سرمایہ اردو زبان میں ہی دستیاب ہے۔ انھوں نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں طب یونانی کا پینل بھی قائم ہے۔ ہم طب یونانی کے علمی ذخیرہ کے تحفظ کے لیے مختلف پروگرام اور کتابوں کی اشاعت بھی کررہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ وزیراعظم کے ایما پر آزادی کی 75 ویں سال گرہ کو 'امرت مہوتسو' کے طور پر ملک بھر میں منایا جارہا ہے اور آج کا یہ پروگرام اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس موقعے پر صفدر جنگ اسپتال میں واقع یونانی میڈیکل سینٹر کے انچارج ڈاکٹر سید احمد خاں نے طب یونانی اور اردو کو لازم اور ملزوم قرار دیا۔ انھوں نے طرز زندگی سے متعلق طب یونانی میں موجود ہدایات پر روشنی ڈالی جب کہ ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، نئی دہلی کے انچارج ڈاکٹر راحت رضا نے افتتاحی پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے مہمانوں کا استقبال کیا اور تفصیل سے کووڈ وبا کے دوران قوت مدافعت میں اضافے کے لیے غذا اور دوا سے متعلق طب یونانی میں درج ہدایات کے بارے میں بتایا۔ پروگرام میں شامل اہم شخصیات میں ڈاکٹر صدارت اللہ، ڈاکٹر محمد سلیم، ڈاکٹر راشد اللہ خاں، ڈاکٹر عبدالرحیم، ڈاکٹر انوارالاسلام، ڈاکٹر ایس آر زیدی، ڈاکٹر پرینکا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ڈی کے چشتی نے کی اور ڈاکٹر شائستہ عروج نے مہمانوں اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 3 ستمبر 2021

تحقیق کے موجودہ امکانات

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام یک روزہ بین الاقوامی سمینار کا انعقاد ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اس اہم موضوع بین الاقوامی سطح پر ویبینار منعقد کیا۔ تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ اردو میں سب سے بہتر تحقیق کا نمونہ غالب کے وسیلے سے سامنے آیا لیکن اب بھی بہت سارے امکانات باقی ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر معین الدین عقیل نے تحقیقات غالب: موجودہ اور مستقبل کے امکانات، پروفیسر نسیم احمد نے 'غالب کے اردو دیوان کی نئی ترتیب اور اس کے طریقہ کار ایک اجمالی تعارف' ڈاکٹر شمس بدایونی نے 'تحقیق غالب کے موجودہ امکانات' اور جناب ثاقب فریدی نے 'نسخۂ حمیدیہ میں غالب کے مقطعے، ردیف بے سے نون تک' پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے معروف محقق و دانشور تحسین فراقی نے کہا 'غالب تحقیق کے موجودہ امکانات' بہت اہم موضوع ہے لیکن اس موضوع پر وہی افراد اچھی گفتگو کرسکتے ہیں جن کے پیش نظر سابقہ تحقیقات ہوں، خوش نصیبی سے آج ہمارے ویبینار میں تمام ایسے افراد جمع ہیں جنھوں نے غالبیات کو ایک موضوع کے طور پر مستقل مزاجی سے پڑھا ہے اور اس کے تعلق سے نہایت اہم نکات پیش کرچکے ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے 'مہر نیم روز ایک تحقیقی جائزہ'، پروفیسر انیس اشفاق نے 'غالب تحقیق کے موجودہ امکانات ایک جائزہ' پروفیسر ناصر عباس نیر نے 'غالب تحقیق کے نئے امکانات' اور 'ڈاکٹر محمد ذاکر نے 'غالب اور معاصر اردو فرہنگ مخزن فوائد' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ ویبینار کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام صدور، مقالہ نگار حضرات اور شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج کا ویبینار بہت کامیاب رہا۔ ہم عنقریب ان مقالات کو جلد ہی شائع کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی اشاعت سے غالب تحقیق کا رجحان بڑھے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 ستمبر 2021

ریختہ روزن

نئی دھلی: اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے کام کرنے والے ادارہ ریختہ فاؤنڈیشن نے 'ریختہ روزن' کے نام سے ایک ادبی سہ ماہی رسالے کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ 'ریختہ روزن' کا آغاز اردو اور دیوناگری رسم الخط میں اردو کے اہم ترین ادبی سرمائے کو ازسرنو قارئین کی دسترس میں لانے کے مقصد سے کیا گیا ہے۔ اس تعلق سے فاؤنڈیشن کے چیئرمین سنجیو صراف نے بتایا کہ ریختہ فاؤنڈیشن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اردو کے اچھے ادب کو ہر ممکن ذریعے سے قارئین تک پہنچایا جائے۔ چاہے وہ ریختہ ویب سائٹ کے ڈیجیٹل صفحات ہوں یا پھر ملک و بیرون ملک میں برپا کی جانے والی ادبی و ثقافتی تقریبات۔ یا پھر 'ریختہ بکس' کی اردو دیوناگری رسم الخط میں شائع ہونے والی کتابیں، ان سب کا مقصد اردو کے ادبی و تخلیقی سرمائے کو آسانی کے ساتھ قارئین تک پہنچانا ہے۔ 'ریختہ روزن' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ 'ریختہ روزن' کا پہلا شمارہ (جولائی تا ستمبر) شائع ہوکر منظر عام پر آگیا ہے۔ سنجیو صراف نے مزید بتایا کہ سہ ماہی 'ریختہ روزن' کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ یہ رسالہ اردو رسم الخط کے ساتھ دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع ہوا ہے۔ اب وہ قارئین جن کے لیے اردو رسم الخط سے ناواقفیت کے سبب اردو کے معاصر اور پرانے ادب کو پڑھنا ممکن نہیں ہوتا تھا آسانی کے ساتھ ایک ہی جگہ پر اردو کے نئے پرانے ادب سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ 'ریختہ روزن' معروف ترقی پسند ادیب و شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی کی صاحبزادی ہما خلیل کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ ہما خلیل معروف ادیبہ، مصنفہ اور ترجمہ نگار ہیں۔ 'ریختہ روزن' کے لیے یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ اسے ابتدا ہی سے اردو کی اہم ادبی شخصیات کی سرپرستی حاصل ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ذکیہ مشہدی اور سید شاہد مہدی کی سرپرستی میں اس رسالے نے اپنا سفر شروع کیا ہے۔ رسالے کی ضرورت اور اس کی اہمیت کو نشان زد کرتے ہوئے رسالے کی ایڈیٹر ہما خلیل بتاتی ہیں "ریختہ فاؤنڈیشن کی سرگرمیوں کی وجہ سے اردو شاعری اور ادب کی طرف لاکھوں لوگوں کے تیزی سے بڑھتے رجحان اور حیرت انگیز ذوق و شوق کے پیش نظر ہمیں ایک ایسے رسالہ کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں شائع ہو اور جس میں اردو کا بے مثال نیا پرانا ادب پیش کیا جاسکے۔

اردو میں بے شمار ایسی نایاب تحریریں، شاعری، افسانے اور مضامین ہیں جو پرانے رسالوں اور کتابوں میں مدفون ہیں، ان تک ایک عام قاری کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ ریختہ روزن کے ذریعے انھیں منظرِ عام پر لایا جائے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اگست 2021

مشاعرۂ جشنِ آزادی

نئی دهلی: آزادیٔ وطن کی اہمیت اس لیے بھی اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ اس کے حصول میں جیالوں کی قربانیاں شامل ہیں۔ یہ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم سچے دل سے انھیں یاد کرتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کریں۔ تحریکِ آزادی میں اردو شعر و ادب کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ اردو شعرا نے وطن کی محبت میں نہ جانے کتنے ترانے گائے۔ انقلاب زندہ باد اور آزادی پائندہ باد جیسے نعرے لگائے۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام منعقد کیے گئے شان دار مشاعرۂ جشنِ آزادی کے صدارتی خطاب میں وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے تمام اہلِ وطن کو ہندوستان کے پچھترویں یومِ آزادی کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کا جذبہ ہر جان دار کے دل میں ہوتا ہے۔ آج جو اساتذہ اپنے معلمانہ فرائض دیانت کے ساتھ انجام دے رہے ہیں وہ بھی دراصل ملک کی آزادی کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مہمانِ خصوصی سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ جامعہ کی ایک علمی و ادبی روایت ہے۔ مشاعرے کی روایت خالص مشرقی ہے، مغرب میں اس کا وجود نہیں ہے اور اس روایت کا سراغ سب سے پہلے نویں، دسویں صدی عیسوی میں ممتاز سنسکرت شاعر راج شیکھر کی کتاب 'کاویہ میمانسا' میں ملتا ہے، جس میں انھوں نے اپنے زمانے کی شعری محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ دلی میں مشاعرے محمد شاہ رنگیلے کے زمانے سے ہونے لگے۔ باقاعدہ ماہانہ مشاعرے کی داغ بیل خواجہ میر درد سے پڑتی ہے۔ دلی میں اب بھی کامنا پرشاد جیسی شخصیات نے مشاعروں کی اس تاب ناک روایت کو زندہ رکھا ہے۔ مہمانِ اعزازی وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر سید عین الحسن نے یومِ آزادی کی مبارک باد پیش کی۔ مشاعرے کے کنوینر ممتاز شاعر پروفیسر شہپر رسول نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ پروفیسر نجمہ اختر نے شمع روشن کر کے مشاعرے کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض منفرد لب و لہجے کے شاعر اور عالمی شہرت یافتہ ناظمِ مشاعرہ معین شاداب نے انجام دیے۔

مشاعرے کا آغاز ڈاکٹر خالد مبشر کی تلاوت اور اختتام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار ڈاکٹر ناظم حسین الجعفری کی جانب سے پروفیسر احمد محفوظ کے اظہارِ تشکر پر ہوا۔ اس مشاعرے میں پروفیسر سید عین الحسن، اظہر عنایتی، پروفیسر شہپر رسول، راجیش ریڈی، پاپولر میرٹھی، اقبال اشہر، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر اے۔ نصیب خان، معین شاداب، ڈاکٹر رحمان مصور، ڈاکٹر خالد مبشر، احمد علوی، علینا عترت اور عارفہ شبنم نے اپنا کلام پیش کیا۔

پریس ریلیز: خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 7 اگست 2021

اتر پر دیش

واقعۂ کربلا کی ادبی و عصری معنویت

میرٹھ: ''اردو ادب میں چاہے مرثیہ ہو یا قصیدہ، غزل ہو یا دیگر اصناف ادب۔ ہر صنف میں واقعۂ کربلا کے عناصر ملتے ہی نہیں بلکہ ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑتے بھی ہیں۔ اقبال، غالب، میر انیس، سودا، ذوق وغیرہ ہر ایک نے اپنے کلام میں لوگوں کو قربانی دینے کا درس دیا ہے'' یہ الفاظ تھے ڈاکٹر تقی عابدی کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیرِ اہتمام منعقدہ یک روزہ عالمی ویبینار و سمینار بعنوان 'واقعہ کربلا کی ابدی اور عصری معنویت' میں کلیدی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ عارف نقوی نے واقعہ کربلا پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آج کے نوجوان ادبا و شعرا کی تخلیقات میں بھی جھوٹ اور سچ کے نقوش مل رہے ہیں جن کا تعلق واقعۂ کربلا سے جا کر ملتا ہے۔ ہمیں واقعہ کربلا کو یاد کرتے ہوئے حق اور باطل کے درمیان فرق کرنا ہوگا۔ اس سے قبل پہلے سیشن کا آغاز سعید احمد سہارنپوری نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ صدارت کے فرائض معروف ادیب محترم عارف نقوی، جرمنی (سرپرست، آیوسا) نے ادا کیے جب کہ استقبالیہ ڈاکٹر شاداب علیم اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے انجام دیے۔ مہمان ذی وقار کے بطور پروفیسر ناشر نقوی، امروہہ شامل رہے۔

دوسرے سیشن کی مجلس صدارت پر پروفیسر غلام ربانی (ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش)، پروفیسر کوثر مظہری (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)، پروفیسر انور پاشا (جے این یو، دہلی)، پروفیسر شبنم حمید (الہ آباد یونیورسٹی) اور فہیم اختر (لندن) رونق افروز رہے اور مقررین کے بطور پروفیسر ریاض احمد (جموں یونیورسٹی)، مولانا اطہر کاظمی (میرٹھ)، مولانا عباس باقری (حیدرآباد) شریک رہے۔ دوسرے سیشن میں استقبالیہ اور نظامت کے فرائض بالترتیب ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور فرح ناز نے بخوبی انجام دیے۔ تیسرا سیشن شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سمینار ہال میں آف لائن منعقد ہوا جس کی مجلس صدارت پروفیسر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، پروفیسر نوین چندر لوہنی، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، ڈاکٹر جمال احمد صدیقی، ڈپٹی لائبریرین جلوہ افروز ہوئے۔ مہمانانِ ذی وقار کے بطور ڈاکٹر ہاشم رضا زیدی، بھارت بھوشن شرما نے شرکت کی جب کہ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر فرحت خاتون نے 'اسلم جمشید پوری کے افسانوں میں واقعات کربلا'، ڈاکٹر عفت ذکیہ اسماعیل گرلز ڈگری کالج نے 'منظر کاظمی کے افسانے ایک کجلائی ہوئی شام میں علامات کربلا' اور شبینہ زہرا نقوی، ریسرچ اسکالر، سی سی ایس یو نے 'جدید اردو غزل میں عصرِ حاضر کی عکاسی کربلا کے خصوصی حوالے سے' عنوانات پر پرمغز مقالات پیش کیے۔ آخر میں ریسرچ اسکالر گلناز نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ہما مسعود، ڈاکٹر عابد زیدی، ایڈوکیٹ سرتاج احمد، مدیحہ اسلم اور طلبہ و طالبات موجود رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 ستمبر 2021

اردو ادب میں آزادی کا تصور

سنبهل: ایم جی ایم پوسٹ گریجویٹ کالج سنبھل میں آزادی کی 75ویں سالگرہ 'بھارت کی آزادی کا امرت مہوتسو' کے موقعے پر شعبۂ اردو کی جانب سے ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کا موضوع 'اردو ادب میں آزادی کا تصور' تھا۔ اس مذاکرے میں اولاً شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر ریاض انور نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آزادی اپنے آپ میں بہت وسیع معنی پر محیط ہے۔ مختلف میدانوں کے ماہرین نے قدرے مختلف معنوں میں اسے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن اردو ادب میں ملک کی آزادی کا بنیادی تصور محض غیر ملکی لوگوں سے آزاد ہو جانے کا نام نہیں بلکہ اردو ادب میں آزادی کا تصور یہ رہا ہے کہ ملک کا ہر فرد ہر قسم کی تفریق و تفاوت سے آزاد ہو اور ایک عزت دار شہری کی زندگی گزار سکے۔ شعبۂ ہندی سے وابستہ ڈاکٹر فہیم احمد نے کہا کہ آزادی، برابری اور بھائی چارے کے لیے نئی نسل کو آگے آنا ہوگا۔ حب الوطنی کے بغیر ملک کی ترقی ناممکن ہے۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی نے کہا کہ آزادی کے صحیح معنوں کو سمجھا جائے اور اس پر غور کیا جائے

کہ کیا ہم نے صرف ایک مخصوص قوم سے آزادی حاصل کی یا ایک ذہنیت سے۔ یقیناً ہم نے ایک ایسی ذہنیت سے آزادی حاصل کی تھی جو ہم کو مختلف طریقوں سے بانٹنا لڑانا چاہتی تھی۔ آج بھی ہم کو اس سے آزادی حاصل کرنی ہے۔ شعبۂ ہندی کے صدر ڈاکٹر محمد عمران خان نے کہا کہ آزادی میں ادب کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ غوثیہ وجیہ نے کہا کہ آزادی کے 75 سال مکمل ہونے پر نئی نسل کی ذمے داری بڑھ جاتی ہے۔ واعظ خان نے کہا کہ اردو ادب میں 1857 کے قبل ہی آزادی کا توانا تصور ملتا ہے اور ہمارے ادبا و شعرا نے اس کی بہترین مثال پیش کی ہے۔ مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ اور طلبا کو ہندوستان کی آزادی کی 75 ویں سالگرہ کی مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ شعبۂ اردو نے بہت اہم موضوع پر مذاکرے کا اہتمام کیا ہے۔ انھوں نے محمد حسین آزاد سے لے کر ترقی پسند شعرا کیفی اعظمی، وامق جونپوری اور تیغ الہ آبادی کے اشعار سے اردو ادب میں آزادی کے تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو ادب گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار رہا ہے ،اس کے خمیر میں آزادی کا صالح تصور موجود ہے اور وہ قومی یکجہتی، بھائی چارے اور امن وسکون پر محیط ہے۔ کالج کی طالبہ ام کلثوم نے ترانہ 'اے میرے وطن، قربان ہے تجھ پر جان وتن' پیش کیا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 15 اگست 2021

تخلیق کے بغیر تنقید کا وجود ممکن نہیں

پریاگ راج: ادبی تنظیم قلمکار کی جانب سے یہاں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی پروفیسر علی احمد فاطمی نے تخلیق وتنقید کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ اپنے مقالے میں انھوں نے واضح انداز میں کہا کہ تخلیق کے بغیر تنقید کا وجود ممکن نہیں۔ انھوں نے کہا کہ تنقید کے لیے تخلیق ضروری ہے لیکن تخلیق کے لیے تنقید ضروری نہیں، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تنقید کے بغیر تخلیق رہ سکتی ہے، لیکن تخلیق کے بغیر تنقید نہیں رہ سکتی۔ اس لیے تخلیق کو اولیت حاصل ہے۔ پروفیسر فاطمی نے کہا کہ ایک نقاد کی ذمے داری ہے کہ تخلیق کار کی طرح وہ بھی حالات و ماحول پر نظر رکھے۔ صرف متن کے مطالعے سے بات نہیں بنتی۔ جہاں تک کسی تخلیق کے معیار کو طے کرنا ہے تو ایک ناقد کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ یہ کیوں اچھی ہے اور کیوں اچھی نہیں ہے۔ انھوں نے حالی، شبلی سے لے کر پروفیسر احتشام حسین، وارث علوی، عقیل رضوی، شمس الرحمٰن فاروقی تک کی تنقید کا جائزہ لیا۔ پروفیسر فاطمی نے کہا کہ نئی کہانی آج اپنے آپ کو نئے تناظر میں لکھ رہی ہے جس پر توجہ ضروری ہے۔ اس موقعے پر نشست کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر فخر الکریم نے کہا کہ جو سوال قائم کیے گئے ہیں وہ ادب میں نئی بحث کو شروع کریں گے۔ معروف افسانہ نگار اسرار گاندھی نے کہا کہ ناقد کو ایمانداری سے تنقید کے فرائض انجام دینے چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ تخلیق کار کسی نظریہ کا پابند نہیں ہوتا۔ معروف صحافی مشتاق عامر نے کہا کہ اس طرح کے مقالات ادب کو سمجھنے میں مشعلِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 اگست 2021

فروغ اردو کے لیے اساتذہ کی خصوصی میٹنگ

لکھنؤ: اردو اساتذہ کی ایک خصوصی میٹنگ برمکان سید ظفر اقبال بالدہ روڈ، نشاط گنج میں منعقد ہوگئی جس کی صدارت سید ظفر اقبال نے کی جب کہ نظامت کے فرائض فاروقی عادل نے انجام دیے۔ اپنے صدارتی خطاب میں سید ظفر اقبال نے کہا کہ اردو اساتذہ کو اپنے میدان میں باقاعدہ متحرک ہونے کی ضرورت ہے کہ جس اسکول میں ہیں وہاں کم از کم اردو پڑھنے والے بچوں کا داخلہ لازمی طور پر ہو۔ بچوں کو روزانہ اردو پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔ محمد عمر نے کہا کہ اردو خط و کتابت کو عمل میں لائیں۔ عبدالقادر نے کہا کہ اردو پڑھنے والے بچوں کو کتابیں اپنی ذمے داری پر مہیا کروائیں۔ ابرار صارم نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے اردو اساتذہ کو اگر اپنی جیب خاص سے کتابوں کے نام پر کچھ خرچ کرنا پڑے تو گریز نہ کریں۔ قاسم عباسی نے کہا کہ اردو کی تشہیر مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 24 اگست 2021

فراق گورکھپوری کی شاعری اور شخصیت

پریاگ راج: رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی 125 ویں یوم پیدائش پر سول لائن واقع پروفیسر انیتا گوپیش کے مکان پر ایک ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں اردو اور ہندی کی مشہور ادبی شخصیات نے فراق گورکھپوری کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی۔ نشست کی صدارت معروف ہندی ادیب آنند مالویہ نے کی اور نظامت کے فرائض محترمہ انیتا گوپیش نے انجام دیے۔ آنند مالویہ نے کہا کہ فراق گورکھپوری جن کی شاعری ہندوستانی تہذیب میں مکمل طور پر رچی بسی ہے، نئی نسل کو پڑھنے کی سخت ضرورت ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا فراق ایک دانشور تھے۔ اپنی گفتگو میں اکثر کہا کرتے کہ ''آپ نے کتنا پڑھا یہ بات اہم نہیں ہے، بلکہ آپ نے کتنا غور و فکر کیا یہ بات زیادہ اہم ہے۔'' فراق نے اپنی کتاب 'اندازے' میں اردو کے اول درجہ کے شعرا مثلاً میر، غالب، اقبال وغیرہ پر مضامین لکھنے کے بجائے دوئم درجہ کے شاعروں ذوق، مصحفی اور حالی پر عمدہ مضامین تخلیق کیے۔ اپنی کتاب 'اردو کی عشقیہ شاعری' میں فراق نے انسان کے جذباتی اور جسمانی رشتوں پر بہت کھل کر بحث کی ہے۔ ان کی شاعری میں ہندوستان کی زمینی تہذیب پوری آب وتاب کے ساتھ رچی بسی ہے۔ ہندی زبان و ادب سے وابستہ اہم شخصیت اجامل نے فراق گورکھپوری کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ زبان ادب کی ان کی باریکیوں پر فراق کی گہری نظر تھی۔ کافی ہاؤس میں اکثر ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اپنی خودنوشت لکھنے کا انھیں بہت شوق تھا لیکن افسوس ایسا نہ ہوسکا۔ اردو گھر کے سکریٹری ڈاکٹر حسین جیلانی نے کہا کہ فراق کی تنقید نگاری پر ریسرچ کے دوران جب میں فراق کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں سے وابستہ لٹریچر کا مطالعہ کر رہا تھا تو میں عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا ہوگیا تھا، چونکہ دونوں میں بڑا تضاد ہے۔ فراق کی نثری تخلیقات میں حاشیے ،اندازے، اردو کی عشقیہ شاعری، اردو غزل گوئی کے علاوہ ان کے خطوط کا مجموعہ 'من آنم' بہت اہم ہیں۔ اردو ادب اور شاعری میں ان کی شخصیت ایک رول ماڈل کی ہے۔ ان کے علاوہ پروفیسر انیتا گوپیش، پریہ درشن مالویہ، بھومک، سندھیا نوودیتا اور پرشانت مالویہ نے بھی فراق گورکھپوری سے متعلق اہم گفتگو کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اگست 2021

ارشد جمال کی شاعری پر مذاکرہ

سلطانپور: سلطانپور میں تعینات ضلع امبیڈکر نگر کے رہنے والے چکبندی آفیسر ارشد جمال کے تین مجموعہ کلام عکس زندگی، تنہائی اور صدائے دل پر ایک محفل مذاکرہ گزشتہ شب سردار اروڈ واقع ڈاکٹر شاہنواز عالم کی قیام گاہ پر بزرگ شاعر تیور سلطانپوری کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی کے طور پر شاعر الطاف نادر بھدرک اڈیسہ شریک ہوئے۔ ارشد جمال کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے الطاف نادر صاحب نے کہا کہ ارشد جمال کی شاعری انسانی زندگی سے بہت قریب ہے وہ اپنے احساسات و تجربات کو بالکل سادہ انداز میں شعری پیکر میں ڈھالنے کا

ہنر رکھتے ہیں اور یہی ایک کامیاب شاعر کی پہچان ہوا کرتی ہے۔ ان کے یہاں دیہی زندگی کے مناظر بھی ہیں، دھول میں لپٹے ہوئے بچپن کا احساس بھی اور انسانی رشتوں کا احترام بھی ہے۔ اس موقعے پر ارشد جمال نے اپنے تینوں مجموعہ کلام عکس زندگی، تنہائی اور صدائے دل الطاف نادر کی خدمت میں پیش کیے۔ صدر جلسہ تیور سلطانپوری، حبیب اجملی، ڈاکٹر شاہنواز عالم، ڈاکٹر منان سلطانپوری اور عامل سلطانپوری نے بھی ارشد جمال کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے تاثرات پیش کیے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 5 ستمبر 2021

بہار

اکبرالہ آبادی کی غزلیہ اور صوفیانہ شاعری

پٹنہ: الہ آباد میں خانقاہوں اور آشرموں کی قدیم روایت ملتی ہے اور اردو کی صوفیانہ شاعری خانقاہوں اور آشرموں کی رہین منت ہے۔ اکبرالہ آبادی کی صوفیانہ شاعری میں دنیا کی بے ثباتی، فنا اور بقا اور عذاب وثواب کے عناصر ملتے ہیں۔ اکبر نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ عبوری دور تھا۔ اس لیے اکبر قدامت پسند نہیں تھے اور اس تغیر و تبدل کے دور میں قدامت پسند ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کی شاعری میں انفرادیت اور اجتماعی تضادات کے عناصر ملتے ہیں۔ اکبر کوئی باضابطہ صوفی نہ تھے اس لیے ان کی صوفیانہ شاعری مذہب اور دنیا کے درمیان سے ایک الگ راہ نکالتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف ناقد اور سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی پروفیسر علی احمد فاطمی نے کیا۔ واضح رہے کہ شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں منگل کو ایک توسیعی خطبہ بعنوان 'اکبرالہ آبادی کی غزلیہ اور صوفیانہ شاعری' منعقد ہوا جس کی صدارت سابق صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی جب کہ نظامت کے فرائض شعبہ کے ریسرچ اسکالر محمد شاہد وصی نے انجام دیے۔ مہمان مقرر کے طور پر پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنا خطبہ پیش کیا۔ اس موقعے پر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی سے شائع ہونے والے 'خبرنامہ' کے دوسرے شمارے کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ پروگرام کا آغاز ریسرچ اسکالر مولانا عارف حسین کی تلاوت کلام اللہ اور پروفیسر رگھونند شرما پرنسپل پٹنہ کالج کے ذریعے شمع افروزی سے ہوا۔ اس کے بعد صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور پروگرام کی غرض وغایت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اردو کے معروف فکشن نگار اور ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ادیب پروفیسر عبدالصمد نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور اپنے خطاب میں کہا کہ اکبرالہ آبادی کا بہار سے بہت گہرا تعلق رہا ہے اس لیے اکبرالہ آبادی اور بہار کے حوالے سے بھی باتیں ہونی چاہئیں۔ امتیاز احمد کریمی نے اس طرح کے پروگرام کے انعقاد کے لیے صدر شعبہ کو مبارکباد پیش کی اور طلبہ و طالبات کو مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کرنے کی ترغیب دلائی۔ پروفیسر صفدر امام قادری نے اپنے خطاب میں کہا کہ پروفیسر فاطمی زبانی جمع خرچ نہیں کرتے بلکہ جو بھی بات کرتے ہیں سند اور ثبوت کے ساتھ کرتے ہیں۔ صدر مجلس نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ فاطمی کا خطبہ غیر جانبدارانہ تھا اور اس خطبے سے اکبر کے وہ روپ بھی سامنے آئے جو نظروں سے مخفی تھے۔ آخر میں ریسرچ اسکالر محمد عطاء اللہ نے تمام مہمانان حاضرین اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ پروگرام میں ڈاکٹر نوشاد احمد، ڈاکٹر سورج دیو سنگھ، ڈاکٹر عبدالباسط حمیدی، پروفیسر مسعود احمد کاظمی، ڈاکٹر سرور عالم ندوی، پرویز عالم، ڈاکٹر سعید عالم کے علاوہ شعبہ کے ریسرچ اسکالرز اور ایم اے کے طلبہ و طالبات کے ساتھ ساتھ عظیم آباد کی علمی وادبی شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2021

سہیل عظیم آبادی یادگاری ویبینار

پٹنہ: سہیل عظیم آبادی ایک بڑے افسانہ نگار تھے۔ ان کی فنی عظمت کا تعین ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں میں اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم کی تھی۔ انھوں نے کبھی کسی کا تتبع نہیں کیا۔ سہیل عظیم آبادی نے نئی نسل کی پرورش کی اور کلام حیدری نے اس کو آگے بڑھایا جس کا بہترین ثمرہ آج ہمیں دیکھنے کو مل رہا ہے۔ یہ باتیں محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے تحت اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام منعقدہ 'سہیل عظیم آبادی یادگاری ویبینار' میں اردو کے سرکردہ افسانہ نگار ڈاکٹر علی امام نے اپنی صدارتی تقریر میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ فکشن کی تنقید کا معتبر نام ارتضیٰ کریم ہے۔ انھوں نے سہیل عظیم آبادی پر جو تحقیقی اور تنقیدی فریضہ انجام دیا ہے وہ کسی نے نہیں کیا۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر احمد محمود نے مہمانوں کا استقبال کیا اور ویبینار کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے آئندہ کے پروگراموں سے آگاہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ سہیل عظیم آبادی نے اپنے افسانوں کے ذریعے ملک اور ملک سے باہر بڑی قدر و منزلت اور شہرت حاصل کی جس سے بہار کا نام بھی روشن ہوا۔ دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اگرچہ میں نے تین جلدوں میں سہیل عظیم آبادی کا کلیات شائع کر دیا ہے مگر ابھی تحقیق کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کا تحقیقی مطالعہ ضروری ہے جس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ معروف ادیب و ناقد ڈاکٹر جمیل اختر نے اپنا مقالہ 'سہیل عظیم آبادی: شخصی احوال و آثار' پیش کرتے ہوئے ان کے خانوادے، ان کی تعلیم، ان کی افسانہ نگاری، ان کی صحافت، ان کی شاعری اور ان کے حالات زندگی پر بہتر انداز میں روشنی ڈالی اور بہت کامیابی کے ساتھ اپنا مقالہ پیش کیا۔ سلمان عبدالصمد نے سہیل عظیم آبادی کی صحافت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ سہیل عظیم آبادی کی صحافت، ان کی افسانہ نگاری سے کسی درجہ کم نہیں تھی۔ اردو پروگرام انچارج محمد اسلم جاوداں نے اپنے ابتدائی کلمات میں کہا کہ سہیل عظیم آبادی کی شخصیت ہفت پہلو تھی۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، صحافی، ڈرامانگار، خاکہ نگار، شاعر، مکتوب نگار اور ایک تحریک کار تھے لیکن ان کی شخصیت کا سب سے روشن پہلو ان کی افسانہ نگاری تھی۔ صحافت ان کا پیشہ تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2021

تلنگانہ

علاقائی زبانوں میں قرآن کے تراجم

حیدرآباد: علاقائی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ترجمہ قرآن کا کام بہت دشوار اور ہمت طلب ہے۔ ہمیں چاہیے کہ جو غلطیاں مستشرقین نے کی ہیں وہ ہم سے سرزد نہ ہوں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر محمد اسحاق، پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی اور پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی، صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مانو نے بزم تحقیق، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکچر کے بعد اپنے خطاب میں کیا۔ مجتبیٰ فاروقی (پی ایچ ڈی اسکالر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مانو) نے آن لائن لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ گیارہویں اور بارہویں صدی میں یوروپ میں قرآن کریم کے ترجمے کا کام سب سے پہلے لاطینی زبان میں ہوا۔ لاطینی زبان اس وقت یورپ میں غالب زبان کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کے علاوہ اس کو مذہبی درجہ بھی حاصل تھا۔ پھر سولہویں صدی میں انگریزی زبان میں ترجمہ قرآن کا آغاز ہوا اور سارے ترجمے اس وقت مستشرقین کر رہے تھے۔ ان ترجموں میں اہم ترجمہ جارج سیل

کا ہے جو انھوں نے 1734 میں کیا۔ اس ترجمہ کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کا ترجمہ براہ راست عربی زبان سے کیا۔ اس ترجمے سے اہل یورپ اور مغربی دنیا بڑی تعداد میں قرآن مجید سے متعارف ہوئی۔ مجتبیٰ فاروق نے لکچر 'انگریزی تراجم قرآن- ایک سروے' کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید کہا کہ تراجم قرآن کے سلسلے میں مستشرقین نے کوئی ٹھوس اور معروف منہج اختیار نہیں کیا، بلکہ غیر علمی اور غیر منطقی طرز استدلال اختیار کیا۔ ہر جگہ تعصب اور جانب داری سے کام لیا گیا۔ پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی نے اپنے اختتامی کلمات میں کہا کہ یہ حیرت کی بات ہے کہ قریب ان چھ صدیوں تک انگریزی اور لاطینی زبانوں میں غیروں نے قرآن کے ترجمے کیے اور مسلمان اس سے دور رہے۔ آج بھی ضرورت ہے کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں وہاں کی زبانوں میں قرآن کے ترجمے کیے جائیں تاکہ لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچ سکے۔ عامر مجیبی (پی ایچ ڈی اسکالر) نے پروفیسر محمد اسحاق کا تعارف پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت امانت علی قاسمی (پی ایچ ڈی اسکالر) نے انجام دی، اور صبا انجم (پی ایچ ڈی اسکالر) کے کلمات تشکر پر پروگرام کا اختتام ہوا۔ پروگرام کا آغاز محمد صلاح الدین (پی ایچ ڈی اسکالر) کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

روزنامہ میرا وطن دہلی، 2 ستمبر 2021

اعزاز و اکرام

عالمی یوم اردو ایوارڈ 2021 کا اعلان

نئی دھلی: عالمی یوم اردو آرگنائزنگ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خان نے عالمی یوم اردو ایوارڈ یافتگان کے ناموں کی فہرست جاری کرتے ہوئے اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ تمام تر نامساعد حالات کے باوجود اردو کے چاہنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر سید احمد خاں نے بتایا کہ عالمی یوم اردو آرگنائزنگ کمیٹی، نئی دہلی کے زیر اہتمام ہر سال کی طرح اس سال بھی 9 نومبر 2021 کو سمپوزیم اور عالمی یوم اردو ایوارڈ تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ایوارڈ یافتگان میں معروف ادیب ڈاکٹر شمس بدایونی کو بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ برائے ادب و تحقیق، ڈاکٹر محمد ثار (سینئر سب ایڈیٹر، روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی) کو مولانا محمد مسلم ایوارڈ برائے صحافت، ڈاکٹر شباب الدین ثاقب (سینئر سب ایڈیٹر، روزنامہ انقلاب، نئی دہلی) کو محفوظ الرحمن ایوارڈ برائے صحافت، امیر امروہوی (سینئر سب ایڈیٹر، روزنامہ سچ کی آواز (نئی دہلی) کو عثمان فارقلیط ایوارڈ برائے صحافت، مسٹر رامش (فوٹو گرافر، روزنامہ سیاسی تقدیر، نئی دہلی) کو سید فدا علی ایوارڈ برائے فوٹو گرافی، فاروق سید (ایڈیٹر ماہنامہ گل بوٹے، ممبئی) کو اسمٰعیل میرٹھی ایوارڈ برائے ادب اطفال، فاروق ارگلی (نئی دہلی) کو گلزار دہلوی ایوارڈ برائے تخلیقی ادب اور آفتاب حسنین (ممبئی) کو کمال امروہوی ایوارڈ برائے اردو ڈرامانگاری شامل ہیں۔ مذکورہ ایوارڈز کا اعلان عالمی یوم اردو ایوارڈ کمیٹی کی سفارش کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کے صدر بزرگ صحافی جلال الدین اسلم ہیں جبکہ ممبران میں معروف صحافی سہیل انجم، جاوید اختر، محمد عارف اقبال، ڈاکٹر سید تنویر حسین اور خیال انصاری وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ انقلاب' دہلی، 27 اگست 2021

وگیان پریشد ایوارڈ

نئی دھلی: (پریس ریلیز) اردو کے ادیب و تنقید نگار حقانی القاسمی اور ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی کو وگیان پریشد پریاگ (الہ آباد) کی جانب سے نویں محمد خلیل سائنس ایوارڈ سے

نوازا گیا ہے۔ تفویض ایوارڈ کی یہ تقریب تسمیہ آڈیٹوریم، اوکھلا میں منعقد کی گئی تھی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید محمد فاروق نے دونوں ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد پیش کی اور ادب و سائنس کے باہمی رشتوں پر پر مغز گفتگو کی۔ اردو زبان میں درجنوں سائنسی کتابوں کے مصنف اور رسالہ 'سائنس کی دنیا' کے سابق مدیر محمد خلیل نے بھی دونوں ایوارڈ یافتگان کو ہدیۂ تبریک پیش کیا اور کہا کہ شمس الاسلام فاروقی صاحب طویل عرصے سے سائنسی موضوعات پر مضامین لکھ کر لوگوں میں سائنس کے تئیں بیداری پیدا کر رہے ہیں، جبکہ حقانی القاسمی ملک کے ممتاز ادیب ہیں جو ادبی موضوعات کے علاوہ سائنسی موضوعات کی کتابوں پر بھی تبصرے لکھتے رہے ہیں اور حال ہی میں انھوں نے میڈیکل سائنس کے حوالے سے اپنے رسالہ 'انداز بیاں' کا بہت ہی خوبصورت اور جامع شمارہ نکالا ہے، جس میں سیکڑوں ڈاکٹروں کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، گویا وہ ادب اور سائنس کو باہم آمیز کرنے کی گراں قدر کوشش کر رہے ہیں، جس کے لیے ان کی تحسین و ستائش ضروری ہے اور یقیناً وہ اس ایوارڈ کے حقدار تھے۔

حقانی القاسمی نے اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے وگیان پریشد الہ آباد کا شکریہ ادا کیا کہ باہم مربوط کرنے کی ان کی کوششوں کو اس ادارے کی جانب سے سراہا گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اگرچہ بنیادی طور پر ادب کا طالب علم ہوں اور براہ راست سائنس سے میرا تعلق نہیں رہا ہے، مگر اس موضوع سے مجھے دلچسپی رہی ہے اور یوں بھی ادب اور سائنس کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے 'انداز بیاں' میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات کے ذریعے ادب اور سائنس کے روابط اور اشتراکات کی چھوٹی سی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ڈیجیٹل ایج نے ہر انسان کو شعوری طور پر سائنس سے مربوط کر دیا ہے اور انسانی ارتقا بھی سائنس سے مشروط ہے، حیات و کائنات کی ساری تفہیم سائنس سے ملتی ہے اور ادب بھی حیات و کائنات کی تفہیم کا ایک معتبر وسیلہ ہے، اسی وجہ سے ادب اور سائنس کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر سائنس میں تجسس ہے تو ادب میں تحیر کا عنصر ہوتا ہے اور ایک ادیب بھی لاشعوری طور پر سائنس داں ہی ہوتا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید احمد خان، وگیان پریشد پریاگ (الہ آباد) کے دیو برت درویدی اور ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی نے بھی اظہار خیال کیا، جبکہ اس تقریب میں متعدد اہل ادب و دانش شریک رہے۔

قندیل آن لائن، 29 اگست 2021

یوم اساتذہ پر ٹیچروں کو اعزاز سے نوازا گیا

شاھجھاں پور: عربی فارسی مدارس ایسوسی ایشن کی طرف سے یوم اساتذہ کے موقعے پر منعقد ایک تقریب میں مدرسہ کے اساتذہ کو اعزاز سے نوازا گیا۔ مدرسہ نورالہدیٰ بجلی پورہ میں یوم اساتذہ کے حوالے سے منعقدہ اعزازی تقریب میں مہمان خصوصی ضلع اقلیتی بہبود افسر ورون سنگھ نے مدرسہ فیضان مدینہ کے پرنسپل مولانا بہاؤ الدین مدنی، مدرسہ عین العلم کے پرنسپل جاوید اختر قاسمی، اے آئی ٹی گلوبل ریسرچ ایجوکیشن سنٹر کے ڈائریکٹر قاضی محمد عامر اور مدرسہ کے استاد مصباحی، محمد جاوید خان کو شال اور مومنٹو سے نوازا گیا۔ شری سنگھ نے اپنے خطاب میں کہا کہ استاد کا سماج میں بہت اہم کردار ہے۔ اساتذہ بچوں کی شخصیت کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کریں۔ قبل ازیں پروگرام کا آغاز مصباحی نے تلاوت قرآن سے کیا۔ آخر میں مہمان خصوصی کو مومنٹو دے کر شکریہ ادا کیا گیا۔ نظامت اقبال حسین عرف پھول میاں نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 ستمبر 2021

جمیلہ صغیر کی کتاب 'آئینہ در آئینہ' کا اجرا

پروفیسر مینو بخشی

دھلی: ملک کی ممتاز ادبی شخصیت نامور شاعرہ پروفیسر مینو بخشی کو عالمی شہرت یافتہ ادبی اور ثقافتی تنظیم انڈین ایچ ایچ سی سی کی جانب سے انڈین کلچرل اعزاز سے سرفراز کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں پدم شری ڈاکٹر محسن ولی کی جانب سے موصول ہوئی اطلاعات کے مطابق پروفیسر مینو بخشی کو دیار عشق نامی پروگرام میں اس سال ایک ایمبیسڈر اور انڈین کلچر اعزاز بالی میں ہونے والی ایک بین الاقوامی تقریب کے دوران دیا جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ کورونا وبا کے دور میں پروفیسر مینو نے عوام الناس، ڈاکٹر حضرات اور مریضوں کو حوصلہ دینے والی شاعری کی۔ اس بابت ان کے کئی گیتوں نے عالمی شہرت پائی۔ ڈاکٹر ولی نے بتایا ہے کہ محترمہ ایک عالمی شہرت یافتہ شاعرہ ہیں جن کی اردو، انگریزی اور اسپینش زبانوں میں کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور وہ ہندوستانی کلچر کو پوری دنیا میں فروغ دے رہی ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 اگست 2021

رسم اجرا

آئینہ در آئینہ

نئی دھلی: آواز چیریٹیبل ٹرسٹ اور مظہر فاؤنڈیشن، انڈیا کے زیر اہتمام ہوٹل ریور ویو ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر میں ایک سادہ تقریب منعقد کی گئی جس میں جمیلہ صغیر کی تازہ ترین کتاب 'آئینہ در آئینہ' کی رونمائی عمل میں آئی۔ ڈاکٹر خان محمد رضوان نے پروگرام کی نظامت کی جب کہ صدارت کے فرائض پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر ندیم احمد، ڈاکٹر ابرار رحمانی اور ڈاکٹر محمد خالد نے انجام دیے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صغیر اشرف کے تنقیدی مضامین، ان کی منتخب غزلیں اور ان پر لکھی گئی تحریریں شامل ہیں۔ کتاب کی رسم رونمائی کے موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد خالد نے کہا کہ یہ کتاب بہت ہی اہم اور قابل قدر ہے جسے محترمہ جمیل صغیر نے مرتب کیا ہے، ڈاکٹر ابرار رحمانی نے کہا کہ اس کتاب میں خطوط والا حصہ نہ صرف اہم بلکہ دلچسپ ہے، صغیر اشرف نے اس بات کا خیال کیا ہے کہ تحریر عام فہم اور سہل ہو جس میں وہ کامیاب ہیں، پروفیسر ندیم احمد نے کہا کہ اس کتاب کو بہت ہی سلیقے سے سجایا گیا ہے اور اچھی محنت بھی کی گئی ہے۔ پروفیسر کوثر مظہری نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ صغیر اشرف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی اہلیہ نے ان کی اہم تحریروں کو یکجا کیا ہے جو کہ ایک عمدہ اور لائق تحسین کام ہے۔ اس کے علاوہ کتاب پر اظہار خیال کرنے والوں میں اتراکھنڈ سے تشریف لائے انجینئر داؤد، ڈاکٹر شعیب رضا وارثی، معین شاداب اور اعجاز انصاری قابل ذکر ہیں، پروگرام کا آغاز ڈاکٹر امتیاز احمد علیمی کی تلاوت کلام سے ہوا۔ بعدازاں ابوظہبی سے تشریف لائے جاوید صدیقی نے اپنی ایک خوبصورت غزل پیش کی۔ شرکا میں ڈاکٹر محمد حفیظ، ڈاکٹر نوشاد عالم، ڈاکٹر حامد علی اختر، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر عبدالرحمٰن، ڈاکٹر قرۃ العین، سید شکیل احمد، اہلیہ ابرار رحمانی اور اہلیہ انجینئر داؤد بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر خان محمد رضوان نے سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 ستمبر 2021

قاری ابوالحسن اعظمی کی تین کتابوں کا اجرا

دیوبند: رابطہ عالم انسانی کے رکن اور دارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ القرا قاری ابوالحسن اعظمی کی تین نئی کتابوں 'وہ لوگ جنھیں میں نے دیکھا'، 'دارالعلوم دیوبند کے مشائخ بخاری شریف' اور 'تبرکات یعنی بزرگان دین اور احباب کے مکتوبات' کا اجرا عیدگاہ روڈ پر واقع دارالعلوم اشرفیہ دیوبند میں موقر علما، ادبا اور دانشوران کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن مولانا سید انظر حسین میاں، مولانا نسیم اختر شاہ قیصر، مفتی ارشد فاروقی، مولانا ندیم الواجدی اور مولانا فضیل احمد ناصری نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اللہ اپنے بندوں کو کس کس طرح نوازتا ہے اور کیسی کیسی ان پر اپنی عنایات کی بارش کرتا ہے اس کا ایک مظہر قاری ابوالحسن اعظمی کی ذات بھی ہے۔ دارالعلوم اشرفیہ دیوبند کے مہتمم مولانا سالم اشرف قاسمی اور دارالعلوم دیوبند کے استاذ قاری شفیق الرحمٰن نے کہا کہ 134 کتابوں کے مصنف قاری ابوالحسن اعظمی جس لگن اور جس جذبہ کے ساتھ اپنے کاموں کو انجام دینے میں مصروف ہیں وہ ایک اکیڈمی اور ایک ادارے کے حوصلوں سے بڑھ کر دکھائی دیتا ہے۔ اترپردیش اردو اکیڈمی کے سابق چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ کتابیں ہم سب کا علمی ورثہ ہیں، قاری ابوالحسن نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس موضوع کا حق جملہ جزئیات کے ساتھ ادا کر دیا۔ آخر میں کتاب کے مصنف قاری ابوالحسن اعظمی نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ پرگرام کی صدارت مولانا سید انظر حسین میاں اور نظامت مولانا سالم اشرف قاسمی نے کی۔ اس موقعے پر مولانا ابراہیم قاسمی، الحاج شاہ عالم قاسم، معروف ادیب عبداللہ عثانی، مفتی سید طاہر میاں، مولانا سید علی اصغر میاں، محمد عمر، مفتی بلال، فیصل عثانی اور دانیال خان وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 اگست 2021

انٹروڈکشن آف فلائنگ مشین ڈرون

امروھہ: سید کامل نقوی نے امروہہ کا نام عالمی سطح پر روشن کیا ہے۔ انھوں نے ڈرون ٹیکنالوجی پر ایک کتاب لکھ کر اپنی صلاحیت کو ثابت کیا ہے، جس کی ہر جگہ تعریف کی جارہی ہے۔ کامل نقوی، جنھوں نے یوپی ٹی یو انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ سے بی ٹیک کیا، ایم آئی ٹی چینئی سے ایم ٹیک کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے یہ کتاب اپنے والد کی خواہش پر لکھنا شروع کی جو پیشے سے انجینئر تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد بھی کامل نے ہمت نہیں ہاری اور تندہی سے فلائنگ مشین ڈرون کے تعارف پر اپنی کتاب مکمل کی۔ کامل اب این ایس ٹی آئی حیدرآباد میں بطور استاد خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کتاب کا اجرا اتوار کو صادق ہاؤس محلہ گزری میں کیا گیا۔ مہمانوں نے کہا کہ کامل کی کتاب اس ٹیکنالوجی سے وابستہ نوجوانوں کے لیے سنگ میل ثابت ہوگی۔ مولانا اطہر عباس، مولانا سید مصطفیٰ وسیم، حسین رضا، علی عباس، ندیم صادق، شبر حسین، ندیم ہادی، جان ہادی، جوہر غازی اور نسیم رضا موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 اگست 2021

عربی زبان و ادب پر اہم کتاب کا اجرا

دیوبند: مولانا محمد سلمان بجنوری نے اپنی قیام گاہ پر مولانا نور عالم خلیل امینی کے شاگرد رشید اور عربی زبان و

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب '2020 کیسا گزرا 2021 کیسے گزاریں' گے کا اجرا

ادب کے معروف اسکالر مولانا مفتی اسعد قاسم سنبھلی کی کتاب 'الطریق الی دراسۃ الصحف العربیۃ' کا اجرا کیا۔ تقریب کا آغاز دارالعلوم کے استاد قاری آفتاب عالم کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ تمہیدی خطبہ میں مفتی عمران اللہ قاسمی نے کتاب کا اور صاحب کتاب کا تعارف کرایا۔ اس موقعے پر مولانا سلمان بجنوری نے کہا کہ یہ عربی صحافت پر ایک نہایت مفید و جامع کتاب ہے جس میں مصنف نے سیاست و معاشرت، واقعات وحوادث، اقتصادیات وطبابت اور وفات وتعزیت جیسے اہم موضوعات پر پہلے ہر باب میں صرف سرخیاں درج کی ہیں تاکہ طلبہ پر شروع ہی میں زیادہ بوجھ نہ پڑے، پھر اس ضمن کی تفصیل خبروں کو عربی جرائد ومجلات سے جوں کا توں نقل نہیں کیا بلکہ غیر ضروری تفصیلات کو حذف کر کے ان کی تسہیل بھی کی ہے تاکہ مشمولات کی آب وتاب ہمیشہ باقی رہے۔ اسی طرح مصنف نے الفاظ وتعبیرات کے ساتھ اخباری سرخیوں اور خبروں کی مستقل تمرینات بھی کرائی ہیں اور آخر میں طلبہ کی سہولت کے لیے لغوی چارٹ بھی درج کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب عربی صحافت کا ایک قیمتی وانمول تحفہ ہے جو بہت تھوڑے عرصے میں طلبہ کو صحافتی تعبیر واسلوب پر قدرت عطا کرے گی اور وہ بہ آسانی عرب اخبارات میں آرٹیکل لکھنے لگیں گے۔ انھوں نے کہا کہ زیر نظر کتاب مصنف کی 15 سالہ محنت کا نتیجہ ہے۔ 156 صفحات پر مشتمل اس کتاب پر جلیل لاقدر عالم دین اور عربی زبان کے ماہر دارالعلوم دیوبند کے سابق استاد مولانا نور عالم خلیل الامینی کا مقدمہ ہے۔ قبل ازیں کتاب کے مصنف مولانا مفتی اسعد قاسم سنبھلی نے کتاب کا تعارف کرایا۔ خصوصی شرکا میں مفتی ذوالفقار احمد (شاملی) مولانا سبحان آصف (سنبھلی)، مولانا بلال احمد (نگینہ)، مولانا شعیب عالم مفتاحی اصلاحی، مولانا محمد حامد سنبھلی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 اگست 2021

ارباب نظر

امراوتی: نئی نسل کے معروف ادیب، ڈاکٹر ناصر الدین انصار کی تازہ ترین کتاب ارباب نظر کی رسم اجرا معروف ادبی تنظیم فاران ادبی فورم کے زیر اہتمام انجام دی گئی۔ شہر کے وسط میں واقع ہوٹل آدرش کے وسیع وعریض اور پرشکوہ ہال میں منعقد اس تقریب رونمائی کی صدارت معروف اسکالر مفتی اشفاق قاسمی نے فرمائی۔ رسم اجرا معروف محقق ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کے ہاتھوں انجام دی گئی۔ اس موقع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے مشہور ادیب ڈاکٹر شرف الدین ساحل، معروف انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسد اللہ، بال بھارتی پونہ کے اردو افسر خان نوید الحق، منظور ندیم، محمد رفیق شاد، جواد حسین، حفیظ مومن اور نثار الدین موجود تھے۔

پروگرام کا آغاز بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر نعیم فراز نے حمد سے کیا۔ بعد ازاں نوجوان شاعر ادیب علیمی نے افتتاحی کلمات پیش کیے۔ ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے ارباب نظر کا تجزیہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ساحل نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو میں خاکہ نگاری کی روایت پر تفصیلی گفتگو کی۔ خان نوید الحق نے ڈاکٹر انصار کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے ارباب نظر کے توسط سے صاحب کتاب کی زبان پر مہارت کو خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ خاکہ نگاری کا پہلا نقش عربی ادب میں ملتا ہے۔ مفتی اشفاق قاسمی نے اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر انصار کی تحریری صلاحیتوں پر کھل کر گفتگو کی۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر اور ناظم ابرار کاشف نے انجام دیے جبکہ ایڈوکیٹ اطہر شمیم نے اظہار تشکر پیش کیا۔ اس ادبی تقریب میں ممبئی، بھیونڈی، ناگپور، پونہ، اکولہ، ایوت محل، شے گاؤں، واشم، اکوٹ، بالاپور، امراوتی، مانا، بدنیرہ، منگرول پیر اور ڈگرس جیسے شہروں کے ادبا، شعرا اور اہل علم شریک رہے۔ تقریب اجرا کے بعد ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا۔

پریم ریلیز: نصیر الدین انصر، مہاراشٹر، 20 اگست 2021

2020 کیسا گزرا، 2021 کیسے گزاریں گے

بھاگلپور: انجمن باغ و بہار برہ پورہ بھاگلپور کے زیر اہتمام محمد شاداب عالم کی رہائش گاہ پر بال ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب 2020 کیسا گزرا 2021 کیسے گزاریں گے کا اجرا انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز کے ہاتھوں ہوا۔ ڈاکٹر محمد پرویز نے کہا کہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی دور جدید کے ایک ہمہ جہت فنکار تھے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا 17 اپریل 2021 کو زندگی کے سفر کے ساتھ تخلیقی، تنقیدی، صحافتی اور تدریسی سفر بھی ختم ہوگیا۔ 267 کتابوں کی اشاعت ان کے نام سے ہے اور ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 68 کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان کی ایک شخصیت میں کئی شخصیتوں کی خصوصیات اور خوبیاں سمائی ہوئی تھیں جو ان کی ذات کو انجمن بناتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ان کے نام سے جتنی کتابیں ہیں اور خود ان کی خدمات کے اعتراف میں جتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں اتنی کتابیں تو اردو کا عام استاد اپنی پوری زندگی میں پڑھ بھی نہیں پاتا ہوگا۔ 2020 کیسا گزرا 2021 کیسے گزاریں گے۔ یہ کتاب ایک تاریخی اور دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ 2020 کا سال بے حد کرب انگیز تھا۔ کرونا وائرس نے زندگی کو معطل کر دیا۔ اس خوفناک بیماری کی وجہ سے لاک ڈاؤن لگایا گیا، نتیجے میں سارے لوگ گھروں میں قید ہو گئے، سب کچھ ٹھپ ہو گیا اور ابھی تک پوری دنیا ڈری، سہمی اور سمٹی ہوئی ہے۔ 176 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں 42 ادیبوں کے مضامین اور 4 شعرا کی نظمیں شامل ہیں۔

پریس ریلیز: شمیم احمد، بھاگلپور، بہار، 8 اگست 2021

نقش وفا ارشد صدیقی فن اور شخصیت

سولاپور: بھارتیہ اردو وکاس فاؤنڈیشن سولاپور کے زیر اہتمام انجمن علم و ادب ساؤتھ کلچرل سوسائٹی آف شکاگو امریکہ کے اشتراک سے نامور شاعر و ادیب ارشد صدیقی کی شخصیت اور فن پر مرتب کردہ کتاب نقش وفا کی رسم رونمائی و مذاکرہ عمل میں آیا۔ مذاکرے میں بطور مہمان خصوصی ڈھاکہ یونی ورسٹی بنگلہ دیش کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر غلام ربانی نے کہا کہ ارشد صدیقی اچھے شاعر و افسانچہ نگار ہیں۔ اودھ نامہ لکھنؤ کے مدیر موسیٰ رضا حیدری نے کہا کہ 'نقش وفا' موصوف کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ نامور ادیب رفیق جعفر نے اپنے تبصرے میں کہا کہ 'نقش وفا' میں یہ توانائی تو ہے کہ قارئین ارشد صدیقی کو ذمہ دار مدرس بھی مان لیتے ہیں اور پرمغز افسانچہ نگار بھی نثر نگار بھی اور شاعر بھی۔ مولانا انصار احمد معروفی قاسمی

نے کہا کہ نقش وفا کے غلام ثاقب نے اپنے مضمون میں ارشد صدیقی کا ایسا پیارا نقشہ کھینچا ہے جسے پڑھ کر جہاں صدیقی صاحب کی پوری حیات و خدمات روشن ہو جاتی ہیں وہیں ان سے ملنے کے لیے دل تڑپ اٹھتا ہے اور ان کو دیکھنے کے لیے آنکھ بے چین ہو جاتی ہے۔ نواب رونق جہاں نے ارشد صدیقی کی بے لوث خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اور مرتب سلطان اختر کو مبارک باد پیش کی۔ ڈاکٹر نزہت شاہ نے اعتراف کیا کہ جناب ارشد صدیقی شفیق استاد، بہترین مصنف، افسانچہ نگار اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ مہر فاؤنڈیشن دھولیہ کے روح رواں ڈاکٹر شبیر اقبال نے کہا کہ ارشد صدیقی بطور شاعر اپنی شاعری کا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر اظہر احمد کامٹی نے کہا کہ سلطان اختر کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے نقش وفا کتاب ترتیب دے کر اردو زبان و ادب کی ایک گوہر نایاب شخصیت ارشد صدیقی کے ہمہ جہت پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ بھارتیہ اردو وکاس فاؤنڈیشن کے صدر و ناظم جلسہ سلطان اختر نے موصوف کی شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی، ان کے افسانچوں سے ناظرین کو محظوظ کیا اور کہا کہ اردو زبان و ادب کو ارشد صدیقی جیسے مخلص اور بے نیاز قلمکاروں کی ضرورت ہے۔ موصوف کی خدمات کا اعتراف کرکے ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہم سب پر لازم ہے، انھوں نے کتاب میں شامل تمام قلم کاروں کا شکریہ ادا کیا۔ جواں سال محقق و ادیب غلام ثاقب نے موصوف کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ کہا کہ ارشد صدیقی ایک سچے محب اردو ہیں۔ ساری زندگی یہی کام کیا۔ اردو پڑھائی اور اردو کی خدمت کی۔ اردو والے انھیں یاد رکھیں نہ رکھیں وہ اردو کو ہر پل یاد رکھتے ہیں۔ صدر جلسہ غوثیہ سلطانہ نوری نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ نقش وفا میں اتنی سادگی و اپنائیت ہے کہ قاری اکتاتے نہیں ہے۔ ارشد صدیقی اور مرتب سلطان اختر دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ویبینار کے آغاز میں ہاشمی نسرین سحر نے اپنی خوش الحان آواز میں حمد پیش کی۔

اس ویبینار میں ڈاکٹر علی الدین (شکاگو)، ڈاکٹر قطب الدین (انڈیانا، امریکہ) ڈاکٹر جاوید حسن (پالوجی، ممبئی)، ہاشمی نسرین سحر (بیڑ) ندیم ابن علیم (دھولیہ)، شاہد اقبال، مرزا عبدالقیوم، جبین پول، عابد انصاری و دیگر حضرات شریک تھے۔ غلام ثاقب نے تمام شرکا و مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، سلطان اختر، بہار، 6 اگست 2201

'متاع قیصر'؍'افکار اظہر'

کامٹی: اردو رائٹرس فورم کے زیر اہتمام 8 اگست 2021 کو قیصر واحدی کے شعری مجموعہ 'متاع قیصر' اور اظہر حسین حیدری کے شعری مجموعہ 'افکار اظہر' کی تقریب اجرا ڈاکٹر خلیل اللہ پبلک لائبریری کامٹی میں منعقد کی گئی۔ یہ دونوں کتابیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہیں۔ جلسے کی صدارت کامٹی اردو رائٹرس فورم کے صدر ڈاکٹر محمد رفیق اے ایس نے فرمائی اور فورم کے سکریٹری آغا محمد باقر نقی جعفری نے نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔

متاع قیصر کی رسم اجرا بدست منظور الحق شاکر اور افکار اظہر کی رسم اجرا بدست ڈاکٹر محمد نسیم اختر انجام دی گئی۔ محمد ایوب، آصفہ انجم اور شازیہ بیگم شاذی نے شعری مجموعہ متاع قیصر اور قیصر واحدی کی شخصیت وفن پر مقالات پیش کیے اسی طرح ریاض الدین کامل اور نثار اختر انصاری نے اظہر حسین حیدری کی شخصیت وفن اور شعری مجموعے افکار اظہر پر مقالات پیش کیے۔

مولانا استاد روش جعفری، مولانا فیاض، صادق الزماں، سہیل عالم، پرویز انیس، شمیم اعجاز، رضوان رضوی، نسیم سعید، پرویز احمد یعقوبی، وقار احمد، نشاط اختر، محمد آصف وغیرہم بطور مہمانان خصوصی موجود تھے۔ ہدیہ تشکر فورم کے جوائنٹ سکریٹری ریحان کوثر نے پیش کیا۔

پریس ریلیز: ریحان کوثر، مہاراشٹر 9 اگست 2021

لہو سے لکھی آزادی

نئی دهلی: کیرالہ کے گورنر عارف محمد خان نے کہا کہ آزادی کے لیے لڑنے والوں نے جس طرح بھارت کا خواب دیکھا تھا، اس کو ہم پورا کر پائیں، تبھی حقیقی آزادی مانی جائے گی۔ جن کی وجہ سے ہم آزادی کے پھل کھا رہے ہیں، آزادی کے بعد انھیں خراب دن دیکھنے پڑے۔ جو قوم اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہے وہ اپنے جغرافیہ کو کیسے بچا پائے گی؟ بے عزتی اور زدوکوبی سے نجات کی خواہش 1857 کے انقلاب نے پیدا کی، جو بعد میں انقلابی تحریک کی دھارا کے روپ میں ابھری۔ کیرالہ کے گورنر عارف محمد خان کو پریس کلب آف انڈیا میں کتاب 'لہو سے لکھی آزادی' کی تقریب اجرا کو خطاب کر رہے تھے۔ اس موقعے پر پریس کلب آف انڈیا کے صدر اوما کانت لکھیڑا، امر اجالا کے ایڈیٹر ونود اگنی ہوتری، نیشنل جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے صدر راس بہاری سمیت کئی صحافی، ماہر تعلیم، وکیل اور سماجی کارکنان موجود تھے۔ عارف محمد خان نے کہا کہ ہندوستانی ثقافت میل جول کی ثقافت ہے، یہ ہندوستانی معاشرے کو طاقتور بناتی ہے۔ اس موقعے پر کتاب کے مصنف جگدیش ممگئی نے کہا کہ غلامی کے دور میں خاص کر اپیشد دور کے واقعات کو پنہ اسمرن کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش کے طور پر کتاب 'لہو سے لکھی آزادی' کا تصور کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 اگست 2021

جذبات ممتاز

مراد آباد: 75 ویں یوم آزادی کی تقریبات کے موقعے پر ہندی ساہتیہ سدن مراد آباد کے زیر اہتمام مجاہد آزادی بھگوت سرن ممتاز مراد آبادی کے مجموعہ کلام 'جذبات ممتاز' کا اجرا عمل میں آیا۔ واضح رہے کہ بھگوت سرن ممتاز کو دنیا سے رخصت ہوئے پچاس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بڑی تحقیق وجستجو کے بعد ڈاکٹر اجے انوپم کی معرفت ممتاز کی بیاض حاصل کرکے ڈاکٹر محمد آصف حسین نے اسے ترتیب دے کر کتاب کی شکل میں پیش کیا، جو بیک وقت اردو اور دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا پیش لفظ مراد آباد کے سینئر وکیل فاروق احمد نظامی نے تحریر کیا ہے۔ تقریب اجرا میں ڈاکٹر اجے انوپم نے کہا کہ تحریک آزادی میں اہلیان مراد آباد کا گراں قدر تعاون رہا ہے لیکن ہم اپنے مجاہدین آزادی کی نشانیوں اور ان کے کارناموں کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ انھیں میں سے ایک نام بھگوت سرن ممتاز کا بھی ہے جو ایک قادرالکلام شاعر اور رئیس امروہوی کے شاگرد تھے۔ ان کی پیدائش 1900 میں ہوئی اور وفات 1973 میں ہوئی۔ ممتاز صاحب آزادی کے سلسلے میں اتنی بار جیل گئے کہ انھیں بھگوت سرن جیلی کہا جانے لگا تھا۔ کرشن کمار ناز نے کہا کہ ممتاز صاحب نے اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے عوام کے دلوں میں آزادی کی شمع روشن کی۔ تقریب کی صدارت طنز و مزاح کے معروف شاعر مکھن مراد آبادی نے کی اور نظامت کے فرائض یوگیندر ویوم نے سر انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 اگست 2021

سیدہ تبسم اور طلعت سروہا کی کتابوں کا اجرا

ممبئی: اردو کارواں اور دانش ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام غزلوں کا سفر، روح تبسم، عکس مجسم اور کاوش طلعت افسانوں کے مجموعوں کا اجرا انجمن اسلام کریمی لائبریری میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مہمان

خصوصی قیصر خالد (ریلوے پولیس کمشنر) نے کہا کہ یہ اردو کا المیہ ہے کہ اردو والوں کو تصنیف و تالیف کے کام میں انتہائی تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے ذاتی خرچے سے اس کو چھپانا بھی پڑتا جب کہ غیر ملکوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر محمد حسن ایسوسی ایٹ پروفیسر راجستھان نے خواتین کو ان کی کتابوں کی رسم اجرا پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ان کی اچھی کوشش ہے اور یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ انھوں نے ادب سے متعلق کچھ اصلاحی پہلوؤں پر بھی اپنی باتیں رکھیں۔ فرید احمد خان صدر اردو کارواں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ وہ قیصر خالد کی بات کی تائید کرتے ہیں کہ واقعی خود مصنف کو دامے درمے قدمے سخنے سارے اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ مصنفہ تبسم ناڈکر نے روحِ تبسم، عکس مجسم اور غزلوں کا سفر (رسالہ) کے تعلق سے اپنے تجربات و احساسات کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی طرف سے معاشرے کے لیے مسائل اور ان کے حل کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنی اس کوشش میں کتنی کامیاب ہیں یہ تو قارئین ہی پڑھ کر بتا سکتے ہیں۔ شبانہ خان جنرل سکریٹری اردو کارواں نے نظامت کے فرائض انجام دیتے رشید احمد صدیقی کے اس جملے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے اور شاعر کی حیثیت کسی محقق سے کم نہیں ہوتی۔ اخلاق احمد نے شکریہ کی رسم ادا کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 12 اگست 2021

وفیات

قیصر شمیم

کولکاتہ: اردو کے ممتاز شاعر، ادیب، مترجم اور صحافی قیصر شمیم کا بروز جمعہ بتاریخ 3 ستمبر 2021 بوقت صبح 5:35 بجے انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 15 دنوں سے شدید علیل تھے۔ انھیں بغرض علاج لائف کیئر نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا۔ افاقے کے بعد وہ گھر آ گئے تھے۔ لیکن تین دن قبل ان پر برین ہیمریج کا شدید حملہ ہوا۔ اس کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکے۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک فرزند ہے۔

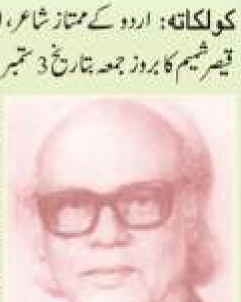

قیصر شمیم کا اصل نام عبدالقیوم خان ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش 2 اپریل 1936 ہے۔ 1951 سے جون 1957 تک وہ عمید الکسی کے نام سے لکھتے رہے۔ جولائی 1957 تا حال قیصر شمیم کے نام سے معروف ہیں۔ نصف درجن سے زائد کتابوں کے مصنف رہ چکے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مولف بھی ہیں۔ جب کہ مختلف اخبارات و رسائل سے صحافتی وابستگی رہی۔ مرحوم مغربی بنگال اردو اکادمی کے وائس چیئرمین بھی رہ چکے ہیں اور انھیں مغربی بنگال اردو اکادمی کی طرف سے عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جا چکا ہے۔

فیس بک اور دیگر ذرائع سے

پروفیسر علی جاوید

نئی دہلی: معروف مصنف، انجمن ترقی پسند مصنفین کے کارگزار صدر اور دہلی یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر علی جاوید کا 1 ستمبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ کافی وقت سے علیل چل رہے تھے اور انھیں علاج کے لیے دہلی کے جی بی پنت اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا، جہاں گزشتہ رات تقریباً 12 بجے وہ انتقال کر گئے۔

پروفیسر علی کی پیدائش 31 دسمبر 1954 کو الہ آباد میں ہوئی، انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی سے ایم اے اردو اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس کے بعد وہ دہلی کے ذاکر حسین کالج سے بہ حیثیت استاد وابستہ ہوئے۔ اس کے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 2019 میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وہ رٹائر ہو گئے۔ ان کا شمار بڑے دانشوروں میں ہوتا تھا۔ ان کی اہم کتابوں میں جعفر زٹلی کی احتجاجی شاعری، برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو، کلاسکیت او رومانویت، افہام و تفہیم قابل ذکر ہیں۔ باب العلم اوکھلا میں مرحوم کی نماز جنازہ ہوئی۔ بٹلہ ہاؤس کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 ستمبر 2021 اور دیگر ذرائع

پروفیسر فاطمہ بیگم پروین

حیدرآباد: ممتاز و معروف نقاد پروفیسر فاطمہ بیگم المعروف فاطمہ پروین زوجہ محمد مجید اللہ صدیقی مرحوم کا 27 اگست بروز جمعہ کو صبح مختصری علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ مرحومہ نے صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ، وائس پرنسپل آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ کئی ریاستوں کے اردو اکادمی کی ایوارڈ یافتہ تھیں۔ مرحومہ 23 کتابوں کی مصنفہ تھیں جن میں چند ایک قابل ذکر ہیں۔ اردو شاعری، کلاسیکی شاعری، سلیمان خطیب کی شاعری، ڈاکٹر محی الدین زور: خدمات اور کارنامے، علی سردار جعفری کی نظم نگاری، کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں دکنی رسائل وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر فاطمہ بیگم پروین کی نماز جنازہ اور تدفین احاطہ حضرت دائرہ میر مومن سلطان شاہی میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں محمد نولیس صدیقی، ندیم صدیقی و دو دختران شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' حیدرآباد، 29 اگست 2021

پروفیسر بیگ احساس

حیدرآباد: ممتاز افسانہ نگار، نقاد اور استاد پروفیسر بیگ احساس کا 73 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ پروفیسر بیگ احساس کا اصل نام محمد بیگ تھا۔ 10 اگست 1948 کو ان کی ولادت ہوئی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی سے 1975 میں بی اے اور 1979 میں ایم اے کیا۔ یونی ورسٹی آف حیدرآباد سے پی ایچ ڈی کی۔ 1984 میں بحیثیت لکچرر اردو عثمانیہ یونی ورسٹی سے وابستہ ہوئے۔ 2000 میں پروفیسر کے عہدہ پر ترقی ملی۔ 2000 سے 2006 تک صدر شعبہ رہے۔ 2007 سے 2013 تک سنٹرل یونی ورسٹی حیدرآباد میں پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کے طور پر خدمات انجام دیں۔ انھیں ہند و پاک کے افسانہ نگاروں میں اہم مقام حاصل تھا۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے خوشہ گندم، حنظل اور دخمہ شائع ہوئے۔ 'دخمہ' پر 2017 میں ساہتیہ اکادمی نے انھیں انعام سے نوازا۔ مخدوم محی الدین اور جیلانی بانو کے بعد پروفیسر بیگ احساس حیدرآباد سے ساہتیہ ایوارڈ پانے والے

تیسرے ادیب تھے۔ ان کی دیگر تصانیف میں شورِ جہاں، کرشن چندر فن وشخصیت اور شاذ تمکنت پر مونوگراف شامل ہیں۔ وہ حیدرآباد لٹریری فورم کے معتمد عمومی اور صدر رہے۔ وہ بازگشت آن لائن ادبی فورم کے سرپرست تھے۔ ادارہ ادبیات اردو کے رکن عملہ اور ترجمان ماہ نامہ 'سب رس' کے تا حال ایڈیٹر رہے۔ ساہتیہ اکادمی کی مشاورتی کمیٹی برائے اردو کے رکن رہے۔ 2005 سے 2012 تک بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ کمیٹی کے رکن رہے اس کے علاوہ مختلف جامعات کی کمیٹیوں اور انجمنوں کے رکن بھی رہے۔ تلنگانہ اردو اکادمی کی جانب سے انھیں مخدوم ایوارڈ برائے کارنامہ حیات دیا گیا۔ پاکستان، سعودی عرب اور انگلینڈ کا دورہ کیا۔ ہندستانی بزم اردو ریاض، سعودی عرب نے پروفیسر بیگ احساس کے اعزاز میں تقریب منعقد کرکے ڈیجیٹل سوونیر جاری کیا۔ پی ایچ ڈی اور ایم فل کے لیے ہندستان کی متعدد جامعات میں پروفیسر بیگ احساس کی شخصیت اور فن پر کئی تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ ادبی رسالوں نے خصوصی نمبر اور گوشے شائع کیے۔ ان کے افسانے ہندستان کی کئی جامعات میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے نصاب میں شامل ہیں۔ صحافت سے بھی ان کا گہرا رشتہ تھا۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز 'فلمی ستارے' سے ہوا تھا۔ انھوں نے حیدرآباد کے روزناموں میں کالم نگاری بھی کی۔

رپورٹ: ڈاکٹر فیروز عالم، کنوینر بازگشت آن لائن ادبی فورم، حیدرآباد، 8 ستمبر 2021

سلطان سبحانی

مالیگاؤں: مالیگاؤں سے تعلق رکھنے والے مشہور افسانہ نگار سلطان سبحانی 25 اگست کی صبح انتقال کرگئے۔ سوگواروں نے صبح دس بجے عائشہ نگر قبرستان میں انھیں سپردِ خاک کردیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 79 سال تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ اور 2 بیٹیاں ہیں۔

سلطان سبحانی طویل عرصے سے صاحب فراش تھے، نقاہت زیادہ ہونے کے سبب گھر سے نکلنا محال ہو چکا تھا۔ سلطان سبحانی کا اصل نام محمد سلطان عبدالسبحان تھا۔ ان کی ولادت یکم جون 1942 کو مالیگاؤں میں ہوئی جب کہ اجداد کا تعلق یوپی کے بنارس کے بھٹی پورہ سے تھا۔ تجارت ان کا پیشہ تھا اور تعلیم ساتویں جماعت تک ہوئی۔ ماہنامہ شان ہند (نئی دہلی) میں پہلا افسانہ 'کانچ کی کرنیں' کے عنوان سے 1954 میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے محض 14 سال کی عمر میں نہ صرف افسانہ لکھا بلکہ اسے دارالحکومت سے شائع ہونے والے موقر ادبی رسالوں نے نمایاں جگہ بھی دی۔ نمائندہ انقلاب کو دی گئی تفصیل کے مطابق سبحانی مرحوم نے 1974 سے 76 کے درمیان ماہنامہ نشانات (مالیگاؤں اور 1977 سے 80 کے درمیان ماہنامہ ہم زباں (مالیگاؤں) کی ادارتی ذمہ داریاں بھی نبھائی تھیں۔ 1966 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ اجنبی کی نگاہیں شائع ہوا۔ شاعری کی دکان (1968)، راستے بھی چلتے ہیں (1969)، حکم نامہ (1958)، میرا کھویا ہوا ہاتھ (1987)، بدن گشت بادبان (1990)، شام کی ٹہنی کا پھول (1999)، مافوق الفطرت (2001)، گولر کا پھول (2005) اور شمائلہ (2007) دیگر تصانیف ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اگست 2021

چندن مترا

نئی دھلی: راجیہ سبھا کے سابق رکن پارلیمنٹ اور صحافی چندن مترا کا 2 ستمبر کی صبح انتقال ہوگیا۔ ان کے بیٹے کشان مترا نے اس بات کی تصدیق کی ہے۔ مسٹر مترا 65 برس کے تھے۔ مسٹر مترا پائنیر کے ایڈیٹر بھی رہے۔ مسٹر مترا کے انتقال پر ملک کے کئی بڑے لیڈروں نے رنج کا اظہار کیا ہے۔

وزیراعظم نریندر مودی نے سابق رکن پارلیمنٹ اور سینئر صحافی چندن مترا کے انتقال پر رنج کا اظہار کیا۔ مسٹر مودی نے ایک ٹوئٹ پیغام میں کہا کہ مسٹر چندن مترا جی کو ان کی دانش مندی اور بصیرت کے لیے یاد کیا جائے گا۔ انھوں نے میڈیا اور سیاسی شعبے میں اپنی الگ شناخت قائم کی۔ اقلیتی امور کے وزیر مختار عباس نقوی نے بھی سابق رکن پارلیمنٹ اور سینئر صحافی چندن مترا کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 ستمبر 2021

شاہد حکیم

گلبرگہ: اولمپکس کھیلنے والے سابق ہندوستانی فٹ بالر سید شاہد حکیم کا 22 اگست کے روز ایک اسپتال میں انتقال

ہوگیا۔ وہ 82 سال کے تھے۔ آل انڈیا فٹ بال فیڈریشن (اے آئی ایف ایف) نے ان کی موت پر تعزیت کی ہے۔ اے آئی ایف ایف کے صدر پرفل پٹیل نے ایک تعزیتی پیغام میں کہا کہ یہ سن کر افسوس ہوا کہ حکیم صاحب نہیں رہے۔ وہ ہندوستانی فٹ بال کی سنہری نسل کے رکن تھے جنھوں نے ملک میں کھیل کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستانی فٹ بال میں ان کی شراکت کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اے آئی ایف ایف کے جنرل سکریٹری کوشل داس نے کہا کہ حکیم صاحب ایک عظیم فٹ بالر تھے جو کئی نسلوں کے لیے ایک تحریک رہے ہیں۔ واضح رہے کہ حکیم 1960 کے اولمپک کھیلوں میں ہندوستانی ٹیم کا حصہ تھے۔ انھوں نے فیفا انٹرنیشنل ریفری کے طور پر بھی خدمات انجام دیں اور دوحہ میں اے ایف سی ایشین کپ 1988 میں کئی میچز کا انعقاد کیا۔ انھوں نے حکیم صاحب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی تھی۔ گھریلو سطح پر بات کریں تو وہ 1960 میں سنتوش ٹرافی کا حصہ تھے۔ وہ 1960 سے 1966 تک ہندوستانی ٹیم کا بھی حصہ رہے۔ کلب کی سطح پر وہ سٹی کالج اولڈ بوائز (حیدرآباد) اور انڈین ایئر فورس کے لیے کھیلے۔ مرحوم شاہد حکیم کو 2017 میں دھیان چند لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 اگست 2021

مطرب سلطانی جارچوی

نئی دھلی: اردو دنیا کے بزرگ استاد اور جدید لب ولہجے کے شاعر مطرب سلطانی جارچوی طویل علالت کے بعد 79 سال کی عمر میں دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ مرحوم گزشتہ کئی برسوں سے بیمار چل رہے تھے لیکن پچھلے 28 دن سے انتہائی نازک حالت میں اسپتال میں زیرعلاج تھے۔ تدفین گلوئی کے قبرستان میں ہوئی۔ جنازے میں مولانا سعیدالدین قاسمی، شہادت علی نظامی، اظہارالحسن، اشرف ناناپاروی کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2021

سید ظاہر علی بھارتی

نئی دھلی: پرانی دہلی کے معروف اردو صحافی، سماجی کارکن، اردو کے مایہ ناز شاعر سید ظاہر علی بھارتی اس دنیائے فانی سے 28 اگست کو رخصت ہو گئے۔ سید ظاہر علی بھارتی اردو زبان کے صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ علاقے کی تمام سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ خدمت گار کمیٹی کے صدر محمد تقی نے ظاہر بھارتی کے انتقال پر اپنے رنج اور غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سید ظاہر علی بھارتی سے ہمارے گھریلو تعلقات تھے۔ وہ ہمیشہ علاقے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے رہتے تھے۔ وہ راشٹریہ سہارا جیسے اردو کے اخبار سے بھی منسلک رہے۔ ساتھ ہی انھوں نے سماجی خدمات بھی پوری لگن سے انجام دیں۔ خدمت گار کمیٹی کے جنرل سکریٹری محمد طاہر نے بتایا کہ ظاہر بھارتی نے اردو ادب میں بھی اپنی خدمات سے ایک اعلیٰ مقام بنایا۔ وہ اردو زبان و ادب کے ایک مایہ ناز شاعر تھے۔ ان کے اردو کلام میں ہمیں سماجی دشواریوں کی جھلک تو ملتی ہے ساتھ ہی موجودہ سماج کے مسائل کو بھی انھوں نے اپنے کلام میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ سید ظاہر علی بھارتی کا انتقال اردو ادب کے لیے ایک بہت بڑا خسارہ ہے۔ ان کی تدفین دہلی گیٹ قبرستان میں ہوئی۔ سید ظاہر علی بھارتی کے لواحقین میں ان کی اہلیہ، دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 اگست 2021

مولانا ابوبکر سلفی پیغمبر پوری

نئی دھلی: ضلعی جمعیت اہلحدیث دربھنگہ کے امیر، شمالی بہار کی معروف سلفی درسگاہ مدرسہ اسلامیہ، بھوارہ، مدھوبنی، بہار کے صدر معروف عالم دین، ممتاز خطیب اور بے باک داعی مولانا ابوبکر سلفی کا انتقال ہو گیا ہے۔ مولانا ابوبکر سلفی نہایت خلیق و ملنسار، متواضع، مہمان نواز، علما کے قدرداں اور متدین انسان تھے۔ مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے کاز سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ جمعیت کی کانفرنسوں و دیگر پروگراموں میں شریک ہوتے تھے۔ عنفوان شباب ہی میں اس وقت کی مرکزی و عظیم درسگاہ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ سے فراغت کے بعد تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے کاز سے جڑے رہے۔ انھوں نے قدیم دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو سے منسلک ہو کر بہت دنوں تک دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کا فریضہ ہندوستان کے اکثر حصوں میں انجام دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اگست 2021

جمشید حسن

ممبئی: ملک کے مشہور اردو اخبارات سے ایک عرصے تک وابستہ رہنے والے اور ملک کے مختلف اردو اخبارات میں مارکیٹنگ ہیڈ کے طور پر اپنی خدمات انجام دینے والے جمشید حسن نے 22 اگست کو جنوب وسطی ممبئی کے ٹاٹا میموریل اسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ذرائع کے مطابق وہ بلڈ کینسر کا شکار تھے اور گزشتہ ایک ماہ سے زیر علاج تھے۔ پسماندگان میں بیوہ ایک بڑی بیٹی ثنا حسن اور 2 بیٹے ثاقب حسن اور انجم حسن ہیں۔ ان کی عمر 61 سال تھی۔ سیوان میں ان کے آبائی گاؤں میں تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 اگست 2021

خراج عقیدت

امداد امام اثر

جموئی: بزم تعمیر ادب کے دفتر فضل احمد منزل ذخیرہ میں امداد امام اثر کے یوم پیدائش پر یادگاری نشست کا انعقاد حاجی محمد سعداللہ خان کی صدارت میں ہوا۔ بزم کے جنرل سکریٹری امان ذخیروی نے امداد امام اثر کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ 'کاشف الحقائق' کے خالق امداد امام اثر کی تحریروں کی اثر آفرینی کبھی کم نہیں ہوگی۔ جناب ذخیروی نے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ امداد امام اثر کی پیدائش 17 اگست 1894 کو بہار کے سالار پور میں ہوئی۔ ان کا تعلق ممتاز علمی و نوابی گھرانے سے تھا، کہا جاتا ہے کہ ان کے خاندان کے ایک بزرگ شہنشاہ اورنگ زیب کے استاد تھے، جس کے صلے میں انھیں بہت ساری خلعتیں اور جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ ان کے والد سید شمس العلما سید وحید الدین بہادر صدر الصدور مجسٹریٹ اور رجسٹرار تھے۔ ان کے دادا سید امداد علی بھی صدر الصدور تھے۔ امداد امام نے ابتدائی تعلیم سید محمد محسن بنارسی سے حاصل کی اور اپنے والد سید وحید الدین سے بھی کسب فیض حاصل کیا۔ آپ نے علوم دینی کے ساتھ ساتھ علوم دنیوی میں بھی کمال حاصل کیا، کچھ دنوں تک وکالت کے پیشے سے منسلک رہے، پھر بعد میں پٹنہ کالج میں تاریخ اور عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، انھیں انگریزی حکومت کی جانب سے شمس العلما اور نواب کے خطابات بھی عطا ہوئے۔ امداد امام اثر شہرت دوام ان کی مشہور تنقیدی و تحقیقی کتاب 'کاشف الحقائق' سے ملی۔ دو جلدوں پر مشتمل یہ کتاب 1894 میں منظر عام پر آئی اور آسمان ادب پر چھا گئی۔ شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا مقام بہت بلند ہے، وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں بے حد عمدہ شاعری کرتے تھے۔ ان کی کتابوں میں کاشف الحقائق، مرآۃ الحکما، فسانہ ہمت، کتاب الاثمار کیمیائے زراعت، فوائد دارین، مصباح الظلم، کتاب الجواب، معیار الحق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بے شمار خوبیوں کے مالک شاعر و ادیب امداد امام اثر 17 اکتوبر 1934 کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اس یادگاری نشست میں بزم کے صدر جناب ارشاد عالم خان، بزم کے خازن پروفیسر محمد رضوان عالم خان، فعال رکن محمد شاداب رضی خان، محمد حسنین خان، معروف صحافی غلام سرور، ڈاکٹر محمد شاہد انور، محمد عتیق اللہ خان وغیرہم شامل تھے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 18 اگست 2021

پروفیسر نصیر احمد خان

نئی دھلی: معروف ادیب، ماہر لسانیات اور پروفیسر نصیر احمد خان کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ پروفیسر نصیر احمد خان کے انتقال سے اردو زبان و ادب کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جے این یو میں وہ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے طلبا کو بھی لسانیات پڑھاتے تھے۔ نصیر احمد خاں صاف گو اور بیباک انسان تھے۔ اردو رسم الخط سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ اردو رسم الخط سکھانے کے لیے انھوں نے انگریزی اور ہندی میں اردو ٹیچر کے نام سے کتابیں لکھیں۔ اگنو کا اردو اسٹڈی سینٹر قائم کر کے اردو کو ہندستان کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ اردو سرٹیفکیٹ، اردو ڈپلوما کا ایک بہترین نصاب تیار کر کے اس کے لیے کتابیں شائع کرائیں۔ ان کی ان خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ وہ سچے اردو پرست تھے۔

پروفیسر نصیر احمد احمد خاں 1944 میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا آبائی وطن مارہرہ اتر پردیش تھا۔ انھوں نے علی گڑھ سے اردو اور دکن کالج پونا سے لسانیات میں ایم اے کیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کشمیر یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پینتیس برس تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 5 اگست 2021

عبدالقادر شمس

نئی دھلی: ڈاکٹر عبدالقادر شمس نے انتہائی کم عمری میں بڑی خدمات انجام دیں، صحافت کے میدان میں انمٹ

نقوش ثبت کے، سیمانچل کی تعلیمی وطبی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور دعوۃ القرآن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے ذریعے اپنے علاقے میں کام کیا۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مشہور ادیب اور نقاد جناب حقانی القاسمی نے ڈاکٹر عبدالقادر شمس کی پہلی برسی پر دہلی کے بٹلہ ہاؤس میں منعقد ایک دعائیہ پروگرام میں کیا۔ حقانی االقاسمی نے مزید کہا کہ وہ نوجوانوں کو آگے بڑھانے کی ہمیشہ کوشش کرتے، انتہائی سہل الوصول تھے اور ہر شخص اپنی ضرورت کے حساب سے ان سے استفادہ کرسکتا تھا۔ نوجوانوں کے لیے ان کی شخصیت میں سیکھنے کے لیے بہت سی چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر خالد مبشر اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنی گفتگو میں کہا کہ مرحوم کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا بیک وقت متعدد میدانوں میں خود کو ڈھال لینا ہے۔ وہ بیک وقت معروف صحافی، مصنف، عالم دین اور سماجی کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ ملی وسیاسی پلیٹ فارم پر بھی متحرک تھے اور فی الوقت نوجوانوں کو مرحوم کی اس خوبی کو اپنانا چاہیے۔ جواہر لعل نہرو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد اجمل نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عبدالقادر شمس خلوص کا پیکر تھے اور چاہتے تھے کہ ہر شخص آگے بڑھے۔ ترقی کرکے ملک و ملت کے کام آئے اور اس کے لیے ہمیشہ نوجوانوں کو اچھے مشورے دیتے اور قلمکاروں کی ہر آن حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ دوردرشن سے وابستہ ڈاکٹر نعمان قیصر نے کہا کہ شمس صاحب صحافت اور سماجی کاموں میں ایک بڑے مقام پر فائز ہونے کے باوجود سب سے محبت اور خلوص سے ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ ملتے اور ان کے اسی انداز کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہماری یادوں میں رہتے ہیں اور ہم انھیں کبھی بھلا نہیں سکتے۔ پروگرام کی نظامت فورم فار انٹلکچول ڈسکورس کے جنرل سکریٹری منظر امام نے کی۔ انھوں نے اپنے تاثرات میں کہا کہ مرحوم سیمانچل کی ان چنیدہ شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے محض جہد مسلسل کی بنیاد پر صحافتی دنیا میں اپنی پہچان بنائی اور ملک وملت کی ترقی کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے جس کے لیے ڈاکٹر عبدالقادر شمس ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس دہلی، 27 اگست 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر............................ بتاریخ.............................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

تیسری اشاعت: 2021

صفحات: 533

قیمت 240 روپے

آئینہ جہاں (کلیاتِ قرۃ العین حیدر) جلد دوم

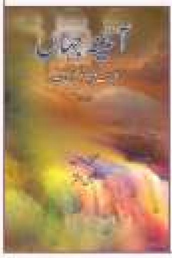

تحقیق وترتیب: جمیل اختر

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 559

قیمت: 275 روپے

آئینہ جہاں (کلیاتِ قرۃ العین حیدر) جلد سوم

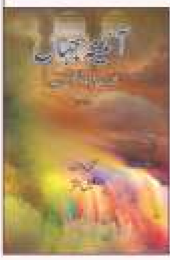

تحقیق وترتیب: جمیل اختر

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 477

قیمت: 245 روپے

اردو شاعری میں قومیت کا تصور

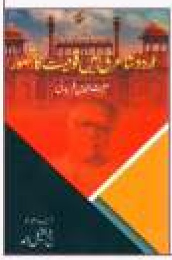

مصنف: مغیث الدین فریدی

ترتیب وتقدیم: شیخ عقیل احمد

سنہ اشاعت: 2021

صفحات: 234، قیمت 135 روپے

مسلم حکومت کے دوران ہندوستان میں علم کا فروغ

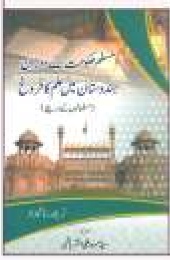

مصنف: نریندر ناتھ لا

مترجم: سید مسرور علی اختر ہاشمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 177، قیمت: 110 روپے

اردو کیسے لکھیں؟

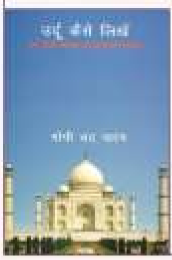

مصنف: گوپی چند نارنگ

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 104

قیمت: 58 روپے

پریم چند

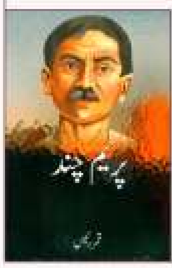

مصنف: قمر رئیس

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 53

قیمت: 40 روپے

اردو صحافت (1858 سے 1900 تک کا ایک مختصر جائزہ)

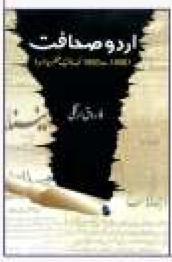

مصنف: فاروق ارگلی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 191

قیمت: 110 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अक्तूबर-२०२१,वर्ष:२३, अंक:१०
URDU DUNIYA Monthly, October-2021, Vol.23, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/09/2021
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

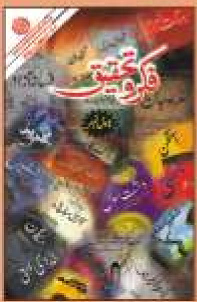

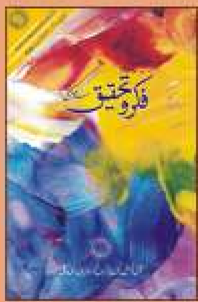
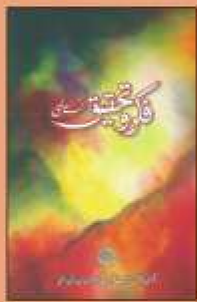
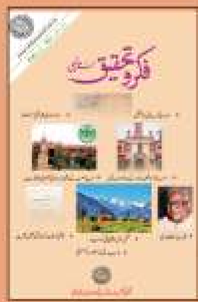
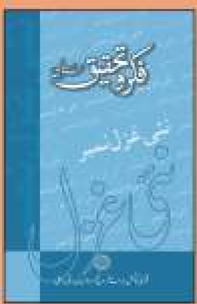
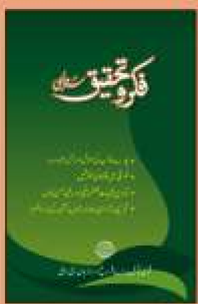

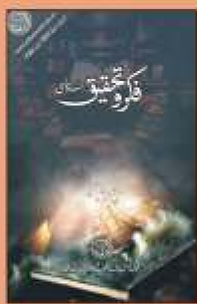
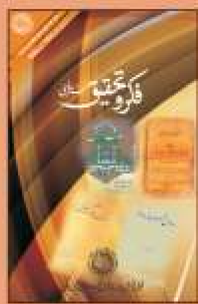

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت:100 روپے، فی شمارہ:25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر:90092010045326 :A/C ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746 فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6